عاشقِ حُسنِ خودِ است آن بے نظیر
حُسنِ خودِ را خودِ تماشا می کُند!

دُنیا کی کہانی

"نورِ مصطفویؐ" کی روشنی میں!

مُصنّفہ

شیخ محمدؐ اشرف

(ریٹائرڈ ایڈمنسٹریٹیو آفیسر۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز۔ پاکستان)

Marfat.com

887

دُنیا کی کہانی

("نُورِ مصطفویؐ" کی روشنی میں!)

مُصنّفہ

شیخ محمد اشرف

(ریٹائرڈ ایڈمنسٹریٹیو آفیسر۔ جنرل ہیڈکوارٹرز پاکستان)

پتہ

پیکو آرٹ پریس۔ مُلتان روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۔ لاہور

Marfat.com

(جُملہ حقوق محفوظ)

اشاعتِ اوّل ---------- دو ہزار

آغازِ کتاب ---------- ستمبر ۱۹۷۰ء

تکمیلِ کتاب ---------- اپریل ۱۹۷۱ء

صفحات ---------- ۳۳۶

قیمت ---------- ٦ روپے (علاوہ محصول ڈاک

کتابت ---------- اخلاق حسین۔ منزلِ کتابت۔ ۴۔ اُردو بازار۔ لاہور

کتاب ملنے کا پتہ ---------- دائرۃ المصنفین (مُبارک سنز سٹیشنرز) ۸۔ اُردو بازار۔ لاہور

خط و کتابت کا پتہ ---------- (۱) شیخ محمد اشرف ۔ ۵۲۔ واپڈا کالونی ۔ اَپر مال ۔ لاہور

(۲) معرفت پیکو آرٹ پریس۔ مُلتان روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۰۔ لاہور

(ٹیلیفون نمبر : ۶۸۷۸۶)

نوٹ

اِس کتاب کو آپ ایک "مسوّدہ" تصوّر فرمائیں۔ لہٰذا اس میں جن نُکات سے آپ متفق ہوں وہاں آپ حاشیہ پر یہ نشان (✓) لگا دیں ۔ جن باتوں سے آپ اتفاق نہ کر سکیں۔ یہ نشان (X) لگا دیں ۔ اور جہاں کوئی معاملہ مشکوک معلوم ہو۔ وہاں سوالیہ نشان (?) لگا دیں ۔ اِس طرح کتاب کے پڑھنے کے بعد، قابلِ غور نکات پر آسانی سے گُفت گُو یا خط و کتابت کی جا سکتی ہے ۔

دوسری ضروری بات جس کا آپ دھیان رکھیں، یہ ہے۔ کہ آپ یہ نہ دیکھیں نے کیا کہا ہے؟ بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ کیا کہا گیا ہے؟

Marfat.com

جس دَور پہ نازاں تھی دُنیا، ہم اب وہ زمانہ بھُول گئے !

دُنیا کی کہانی یاد رہی اور اپنا فسانہ بھُول گئے !

انور صابری

Marfat.com

میں ڈھونڈ رہا ہوں میری وہ شمع کہاں ہے؟
جو بزم کی ہر چیز کو پروانہ بنا دے!

بہزاد

Marfat.com

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی!
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی!

اقبال

Marfat.com

سجع

اَنبیاءؑ جملہ شریف اند و محمدؐ اشرف

مصطفیٰؐ اشرفِ مخلوقِ الٰہ آمد!

---

[1] کئی سال ہوئے یہ سجع میرے ایک عزیز ترین و مخلص دوست (نیز ہم جماعت) شیخ محمد امین صاحب بی۔ اے (سابقہ لائبریرین اسلامیہ کالج لاہور) نے مرحمت فرمایا تھا جو نہایت خوشنما رنگین اور زرّیں بیل بوٹوں سے مزیّن و مرصّع ہے!

Marfat.com

س 97-

دنیا کی کہانی

نوٹ

اِس کتاب کا مسوّدہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں مکمل ہو چکا تھا ؛ اپریل ۱۹۷۱ء میں اس کی کتابت تکمیل کو پہنچی ؛ نومبر ۱۹۷۱ء میں جب نسخہ چھپ چکا۔ تو اُس میں کچھ کتابت کی غلطیاں پائی گئیں ؛ چُنانچہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب اِسی سلسلہ میں ایک "غلط نامہ" تیار کیا جا رہا تھا۔ اُنہی دِنوں "مشرقی پاکستان" والا المیہ پیش آگیا ؛ اُس کے پیشِ نظر اِس "غلط نامہ" کے ساتھ ایک "صحت نامہ" بھی تحریر کیا جا رہا ہے ؛

یہ دونوں بمعہ چند "افکار و حوادث" کتاب کے آخر میں مندرجہ ذیل صفحات پر ملینگے :-

غلط نامہ ——— صفحات الف تا ب

"صحت نامہ" ——— صفحات ج تا م

"افکار و حوادث" ——— صفحات ن تا و

محمد اشرف

جنوری ۱۹۷۲ء

"عشق" کی آپ بیتی ! ——— ۲۰

کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا پہلا دَور ! ——— ۲۰ - ۲۷

کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا دوسرا دَور ! ——— ۲۷ - ۲۹

حضرت آدمؑ کا مختصر قصہ ——— ۲۹ - ۳۲

Marfat.com

تدریجی ارتقاء کے اصول کے تحت "معرفت" اور کائنات کی "روحانی تسخیر"! ۔۔۔۔۔ ۳۲ ۔ ۳۶

باب دوم

دُنیا کی کہانی کا وسط

تمہید ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۷ ۔ ۳۸

انسان کا حقیقی مقصدِ حیات! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸ ۔ ۴۱

اسلام میں لفظ "مسلم" کی صحیح تعریف اور اس کا قرآنی ثبوت! ۔۔۔۔۔۔ ۴۱ ۔ ۵۲

"مسلم"، "مومن" اور "کافر" میں فرق! ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۲

مسلمانوں کے تنزل کی وجوہات کا تجزیہ! ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۲ ۔ ۵۸

زمانوں کا زیر و بم! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۸ ۔ ۶۱

اسلام کا صحیح فلسفہ اور انسان کے "عدوٌ مبین" کا اس کے خلاف ردِ عمل! ۔۔۔۔۔ ۶۱ ۔ ۶۴

باب سوم

دُنیا کی کہانی کا انجام

تمہید ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۵

قرآن میں لفظ "نعمت" کی تفسیر! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۵ ۔ ۶۸

"طائرانِ حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی! ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۸ ۔ ۷۱

کائنات کے ذرہ ذرہ کی تسخیر! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۱ ۔ ۷۸

"جھوٹے نگوں" کی "صناعی" کو فروغ! اور شاعر اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے تخیل کی افتاد میں فرق!! ۔۔۔۔۔۔ ۷۹ ۔ ۹۵

بدعت کسے کہتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹۵ ۔ ۱۰۰

مختلف ذہنیتیں کس طرح بنتی ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰ ۔ ۱۰۲

حضرت عیسیٰؑ کا نزول اور اقبال کی اس دنیا میں آنے کی غرض و غایت! ۔۔۔۔۔ ۱۰۲

Marfat.com

بحث کا لُبِ لباب ! ---------- ۱۰۲-۱۰۳
نوٹ ---------- ۱۰۳-۱۰۴

باب چہارم

موجودہ حالات کا جائزہ

مُسلمانوں میں ناطق گروہ ---------- ۱۰۵
عُلماء کا گروہ ---------- ۱۰۵-۱۲۰
اسلام میں غلط مسالک کی ترویج ---------- ۱۲۰-۱۲۱
انگریزی تعلیم یافتہ مُسلمانوں کا گروہ ---------- ۱۲۱
اِسلام میں تین قسم کے عُلماء ---------- ۱۲۱-۱۲۲
"حقیقی" عُلماء ! ---------- ۱۲۲
"عربی دان" عُلماء ! ---------- ۱۲۲
"انگریزی دان" عُلماء ! ---------- ۱۲۲-۱۲۹
سُنّت کا فلسفہ ---------- ۱۳۰-۱۳۱
قرآن کے بیسویں صدی کے "نئے" مفسرین کی پریشانی ! ---------- ۱۳۱-۱۳۳
دجّال سے کیا مُراد ہے ؟ ---------- ۱۳۳-۱۳۴
اِنسانی شعُور ---------- ۱۳۴-۱۵۰
سلیم الفطرت غیر مُسلموں کی ذہنیت میں ترقی ! ---------- ۱۵۰-۱۷۶
دو قوموں والے نظریئے پر بحث ---------- ۱۷۶-۱۸۵
کشمیر کا مسئلہ ---------- ۱۸۶-۱۸۸
اِسلام اور دوسرے مذاہب ---------- ۱۸۸-۲۰۲
تبلیغ ---------- ۲۰۲-۲۱۴
اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروؤں کے قابلِ قدر لٹریچر کی ایک مثال ! ---------- ۲۱۵-۲۱۷

Marfat.com

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروؤں کے بارہ میں صوفیائے کرام میں سے ایک بزرگ کے خیالات ! --- ۲۱۷-۲۱۹
حضور کا معراج کے موقع پر غیر مذاہب کے سچے پیروؤں کو "صالحین" کے لفظ سے یاد کرنا اور قرآن کی اس سلسلہ میں تصدیق ! --- ۲۲۰-۲۲۱
انسان کے "عدو مبین" کی چالیں ! --- ۲۲۱-۲۲۲
قرآن میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے الفاظ کو صالح غیر مسلموں کی نجات کے لئے کافی سمجھنے پر ایک اعتراض اور اسکا جواب ! --- ۲۲۳-۲۳۰
تقدیر و تدبیر کا مسئلہ ! --- ۲۳۰-۲۴۶
پردہ کے حکم کا فلسفہ ! --- ۲۴۶-۲۵۷
"دین" کے لفظ کا صحیح مدعا ! --- ۲۵۷-۲۶۰

باب پنجم

رُوحانی زمانہ !

"طائرانِ حرم" کا دَور دَورہ ! --- ۲۶۱-۲۶۸

باب ششم

متفرقات

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کی تفسیر ! --- ۲۶۹-۲۷۱
قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۱) --- ۲۷۱-۲۷۲
قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۲) --- ۲۷۲-۲۷۳
اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی تفسیر ! --- ۲۷۳-۲۷۷
رسولِ پاکؐ کی غیب دانی ! --- ۲۷۷-۲۸۲
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی بہترین تحریر جو میری نظر سے گزری --- ۲۸۲-۲۸۴
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ایک دوسری عمدہ تحریر --- ۲۸۴-۲۸۵

Marfat.com

اسلام کے "ملا" اور "مولوی"! ---------- ۲۸۵

ثقافت یا کلچر! ---------- ۲۸۶ — ۲۸۷

اسلامی معیشت! ---------- ۲۸۷ — ۲۹۲

نورِ مصطفوی ﷺ کا معمہ! ---------- ۲۹۳ — ۲۹۸

"وحدت" سے "کثرت"! ---------- ۲۹۸ — ۳۰۰

"ہمہ اوست" درست ہے یا "ہمہ از وست"؟ ---------- ۳۰۰ — ۳۰۸

حدیثِ قدسی "کُنتُ کنزاً مخفیاً الخ" سے ابن عربی کا "وحدتِ وجود" پر استدلال اور حضرت مجدد الف ثانی کا اُس سے اختلاف! ---------- ۳۰۸ — ۳۱۱

اگر انسان کا مقصدِ حیات "عشقِ الٰہی" ہے۔ تو قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟ ---------- ۳۱۱ — ۳۱۶

باب ہفتم

اِشارات

اسرائیل ---------- ۳۱۷ ۳۲۰

حرفِ آخر! ---------- ۳۲۱ — ۳۳۳

صفحہ ۲۴۱ کا حاشیہ (اس حاشیہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں) ---------- ۳۳۴ — ۳۳۵

تتمہ ---------- ۳۳۶ -

بُت توڑنا بھی فرض ہے لیکن یہ شرط ہے

دِل میں بھی جھانک، دِل میں کوئی بُت چھپا نہ ہو!

Marfat.com

زِندگی دَر جستجُو پوشیدہ اَست

اصل او دَر آرزُو پوشیدہ اَست

(اقبالؔ)

Marfat.com

دُنیا کی کہانی

(نُورِ مصطفویؐ کی روشنی میں!)

پیشِ لفظ

موجودہ زمانہ میں تمام سلیم الفطرت اصحاب کے لیئے یہ مسئلہ بہت اہمیّت رکھتا ہے کہ اس دُنیا کی کہانی کا آغاز کب ہُوا؟ کیوں ہُوا؟ اور کس طرح ہوا؟ اور پھر اس کا انجام کس طرح ہونا ہے؟

اِس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے دُنیا کی کہانی کا وسط ہے۔ چنانچہ اِس وقت جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یا جو کچھ موجودہ زمانہ کی تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس کہانی کا وسط مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ[1] کی تفسیر ہی ہے۔ اب یہ سمجھنے کے لئے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہمیں کہانی کے آغاز کا گہری نظر سے مُطالعہ کرنا ہوگا! اگر اُس میں ہمیں قطعی طور پر یہ معلوم ہو سکے۔ کہ اِس دنیا میں انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ پھر تو اُس کے انجام کے متعلق ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ اُسی مقصد کی تکمیل ہونا چاہیئے:۔ اُور پھر اُسی سے ہم دُنیا کی کہانی کے وسط کے متعلق بھی کوئی صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر اِس وقت اُس مقصد کی تکمیل ہو رہی ہے۔ پھر تو ہم کہیں گے۔ کہ دُنیا ٹھیک راستہ پر چل رہی ہے۔ لیکن اگر اِس وقت اُس مقصد کی تکمیل نہیں ہو رہی۔ تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔ کہ موجودہ صورتِ حالات غلط ہے۔ اور ان حالات کو ایسی صورت میں بدلنا چاہیئے۔ اور بدلنا ہوگا کہ حقیقی مقصد کی کماحقہٗ تکمیل ہو:

اگلی سطور میں یہ واضح ہو جائے گا۔ کہ اِس دُنیا کی کہانی کا آغاز ایک خاص مقصد کے لئے نہایت شاندار طریقہ

---

[1] جو زمین میں فساد پھیلائے گا۔ اور خونریزیاں کرے گا+ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰)

Marfat.com

سے ہوا۔ اور اُس کی جھلکیاں دنیا گاہے بگاہے دیکھتی بھی رہی ہے۔ لیکن اُن کی مدت اتنی قلیل اور مختصر سی رہی ہے کہ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اُن جھلکیوں کو کماحقہٗ کچھ اور سُنا اور دیکھا جائے! یہ دُنیا کے انجام کی کہانی ہوگی اُس کے متعلق یہاں فی الحال صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ اگر دُنیا کی کہانی کا آغاز نہایت اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے ہوا تھا۔ اور اِس کہانی کا وسط اِس وقت مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کی تفسیر ہے[1] تو اِس کا انجام لامحالہ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[2] کی تفسیر ہی ہونا چاہیے!

چنانچہ اِس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اسلام کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) "ابتدائی" اسلام۔ اور

(۲) "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام!

اِس وقت عُلماء یا دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے جتنے بھی مواعظِ حسنہ یا مضامین ہیں وہ عام طور پر "ابتدائی" اِسلام تک ہی محدود ہیں۔ یعنی "خدا اور رسول کو مانو۔ نیک بنو اور جنّت میں جاؤ" لیکن انسان کا حقیقی مقصدِ حیات صرف خدا کو "ماننا" نہیں۔ بلکہ خدا تک "پہنچنا" ہے۔ جس کو عرفِ عام میں "معرفتِ الٰہی" یا "خدا رسیدگی" کہتے ہیں۔ اِسی کو میں نے "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام کے نام سے تعبیر کیا ہے!

جہاں تک "ابتدائی" اِسلام کا تعلق ہے (جس میں توحید و رسالت یا نماز، روزہ، اور حج و زکوٰۃ کے مسائل آتے ہیں) عُلماء یا دوسرے لوگوں کا اِن میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں لیکن "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام کے بعض مسائل ایسے ہیں جن کی بابت اوّل تو آسانی سے کوئی تفصیل ہی نہیں ملتی۔ لیکن اگر ملتی بھی ہے۔ تو وہ اِس طرح بکھری پڑی ہے۔ کہ اُس کے سر پیر کا پتہ نہیں چلتا اور اُس کا کچھ حصہ تو اتنے مشکل الفاظ میں ہے۔ کہ ایک عام اِنسان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ کہ کیا سمجھانا مقصود ہے؟ لہٰذا عام دُنیا اُس سے مستفیض نہیں ہو سکتی؛ سوائے بعض حضرات کے

"وجدانی" اِسلام کے جو مسائل وضاحت کے لئے ابھی تشنہ ہیں۔ وہ مثال کے طور پر یہ ہیں:۔

(۱) یہ دُنیا کب معرضِ وجود میں آئی؟ کیوں آئی؟ اور کس طرح آئی؟

(۲) اِس دُنیا میں پہنچ کر ایک سلیم الفطرت اِنسان کیا سوچنے پر مجبور ہے؟ اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ مقصد اب تک پورا کس طرح ہوا ہے؟ اور آیندہ اُس کے پورا ہونے کی اُمید کس طرح ہے؟

(۳) نورِ مصطفوی سے کیا مُراد ہے؟

(۴) حضورؐ کی غیب دانی کے متعلق صحیح مسلک کیا ہے؟

---

[1] جو زمین میں فساد پھیلائے گا۔ اور خونریزیاں کرے گا؛ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰)

[2] مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰)

Marfat.com

(۵) اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱؎ کی تفسیر کیا ہے؟

(۶) اسلام کائنات کی "روحانی تسخیر" کا قائل ہے۔ یا "مادی تسخیر" کا، جو اس وقت موجودہ سائنس کے ذریعہ کی جارہی ہے؟

(۷) اسلام کے نقطۂ نگاہ سے حیاتِ انسانی کا مقصد کیا ہے۔ کہ دنیا کی قومیں "براہیمؑ و موسیٰؑ" اور "سلیمانؑ و عیسیٰؑ" جیسے انسان پیدا کریں۔ یا آئن سٹین (Einstein) اور مارکونی (Marconi) جیسے؟

(۸) سُنّت کیا ہے۔ کہ انسان چاند پر چھلانگیں لگانے یا زمین پر بیٹھے بیٹھے اُسے شق کرے؟

(۹) تقدیر و تدبیر کے مسئلہ کی گتھی کیا ہے؟

(۱۰) کربلا کا واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کی تہ میں کیا ہے؟

(۱۱) اس واقعہ کے بعد "خلافت" کیوں پیچھے ہٹ گئی۔ اور "ملوکیت" کیوں آگے بڑھ گئی؟

(۱۲) انسان کا "عدوٌ مبین" ہر زمانہ میں انسانوں کو گمراہ کرتا آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اُس کی "چال" کیا ہے؟ گویا اس وقت اُس نے بنی نوع انسان کو کس بات کا "چکمہ" دیا ہے؟

(۱۳) دجّال سے کیا مراد ہے؟

(۱۴) دماغ کی نشوونما اور تزکیۂ قلب میں کیا فرق ہے؟

(۱۵) اسلام میں لفظ "مسلم" کی صحیح تعریف کیا ہے؟

(۱۶) "وحدت" سے "کثرت" کے سلسلہ میں جو تشبیہات تصوف کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ وہ کیوں ادھوری ہیں؟

(۱۷) ہمہ اوست درست ہے یا ہمہ از اوست؟

(۱۸) اگر انسان کا مقصدِ حیات "عشقِ الٰہی" ہے تو قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟

(۱۹) کیا باری تعالیٰ فی ذاتہٖ کامل نہیں؟ اور وہ اپنی تکمیلِ ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا؟

(۲۰) اس دنیا کی کہانی کا انجام کس طرح ہونا ہے؟

وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب میں اسی قسم کے مسائل پر کچھ روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاکہ معاملہ ایک حد تک واضح ہو سکے۔ لیکن میں یہ شروع میں ہی عرض کر دوں۔ کہ میری یہ وضاحت محض ایک "کوشش" کی حیثیت ہی رکھتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک "عربی دانی" کا تعلق ہے۔ میری حالت ایک عام "اُمّی" سے اچھی نہیں۔ چونکہ جو شخص قرآن کی آیات کو اردو یا انگریزی ترجمہ کے بغیر سمجھ ہی نہ سکتا ہو۔ اُس کے لئے لفظِ "اُمّی" کے علاوہ کسی اور لفظ سے اپنی حیثیت کو تعبیر کرنا جسارت

۱؎ میں تمہاری طرح بشر ہوں (سورۃ ۱۸ الکہف آیت ۱۱۰)

Marfat.com

سے کم نہ ہوگا!

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دریں حالات کیا یہ کوشش بھی جسارت نہیں؟ میں اس صورتِ حال یعنی ؎

زبانِ یارِ من تُرکی و من تُرکی نمی دانم!

کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن میری جرأت کی تہ میں صرف اتنی سی بات ہے۔ کہ میری دانست میں اسلام کا تعلق محض "عشق" سے ہے۔ اور "عشق" زباندانی کی قیود سے آزاد!

"رہروانِ راہِ محبت" کے لئے تو یونہی ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔ کہ کسی "اُمّی" کے اشاروں کو صرف "اُمّی" ہی سمجھیں؟ لہٰذا "اُمّیوں" میں سے ایک "اُمّی" کی یہ جسارت یا جرأت!

آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اس ملک کے لوگوں پر علامہ اقبال کے تخیّل کا بہت گہرا اثر پڑا ہے: لیکن عام طور پر ایک بات جس پر کما حقہٗ غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اقبال دراصل دو ہیں: ایک شاعر اقبال! اور دوسرے ڈاکٹر اقبال!! جہاں تک شاعر اقبال کا تعلق ہے۔ اُن کے اشعار عام طور پر اسلام کی نہایت صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال کا تعلق ہے۔ اُنہوں نے جو باتیں مغربی فلسفہ کی روشنی میں کہی ہیں۔ اُن میں سے بعض اسلامی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں ہیں: ان صفحات میں اُن پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے:

بہرحال آپ ان صفحات کو ایک "مسوّدہ" تصور فرمائیں۔ اور جن مسائل کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک پر غور فرمائیں۔ کہ اُن کے بارہ میں آپ کا اِس وقت نظریہ کیا ہے؟ اور اِس کتاب میں اُن کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟ اِسی طرح جب اِس کتاب میں کسی قرآنی آیت یا حدیث کا ذکر آئے۔ تو اُس کے متعلق بھی آپ یہ دیکھیں۔ کہ آپ اُس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں۔ اور اِن اوراق میں اُس کی بابت کیا مفہوم لیا گیا ہے؟ اگر آپ میرے مفہوم یا نظریئے سے متفق ہوں۔ تو فبہا ورنہ اُس پر ٹھنڈے دل سے تنقید فرمائیں:

مقصد صرف یہ ہے۔ کہ قرآن خدا کا "آخری حرف" ہے اور ہم چونکہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے پاس خدا کے "آخری حرف" کی امانت ہے۔ لہٰذا اِس وقت تمام دُنیا کے مسلمانوں پر اِس بات کی ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ ہم اِس "آخری حرف" کی حقیقت تک پہنچیں!

اِس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں یہ فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ کہ اِن صفحات میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس میں کچھ "سخن شناسی" پائی جاتی ہے، یا نہیں؟

محمد اشرف

ستمبر ۱۹۷۰ء

Marfat.com

دُنیا کی کہانی

(" نُورِ مصطفوی ؐ" کی روشنی میں!)

○

بابِ اوّل

دُنیا کی کہانی کا آغاز

سلیم الفطرت اِنسان کیا سوچنے پر مجبور ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ہر ذی فہم اور سلیم الفطرت اِنسان جو اِس دُنیا میں آتا ہے۔ یہ سوچنے پر مجبور ہے۔ کہ یہ دُنیا کیا ہے؟ یہ اتنا بڑا آسمان کس نے بنایا ہے؟ ہر دن کے بعد رات اور ہر رات کے بعد دن، یہ کیا کھیل ہے؟ آج زمین میں بیج بویا جاتا ہے۔ کل اُس سے کھیتی ہری بھری ہو جاتی ہے! یہ کیا بات ہے؟ میاں بیوی آپس میں ملتے ہیں۔ تو ایک پھُول سا بچہ پیدا ہو جاتا ہے! اس میں کیا راز ہے؟

دوسروں کا کیا ذکر؟ ایک انسان اپنے آپ کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ کہ وہ خود کیا ہے؟ یہ ہاتھ کیا ہیں؟ یہ پاؤں کہاں سے آئے ہیں؟ اُس کا کان ایک بات سُن سکتا ہے۔ مگر اُس میں یہ قدرت نہیں۔ کہ وہی بات وہ اپنی ناک سے سن سکے! وہ آنکھ جو تمام دُنیا کا نظارہ کرتی ہے۔ اپنے آپ کو دیکھنے سے قاصر ہے! وہ دِل جو ہر قسم کے تاثرات قبول کرتا ہے۔ یا وہ دماغ جو تمام جہان کی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنے سے معذور ہے! ابھی بھلا چنگا بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ کہ نیند آجاتی ہے۔ پھر اپنا ہوش نہیں رہتا! آخر ان سب باتوں کا راز کیا ہے؟

جب ایک اِنسان کے دِل میں اس قسم کے خیال آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب اُس کے دِل کو اِس بات کی

Marfat.com

دُھن لگ جاتی ہے۔ کہ وہ خود کس کی قدرت کا کرشمہ ہے؟ جب اُس کے دل میں اِس بات کی لگن پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ خوب صورت آنکھیں (جن کی ایک نظر ایک انسان کے دل کو گھائل کئے دیتی ہے) وہ حسین چہرے (جن کا ایک تبسم اِنسان کے دل پر بجلی گرا دیتا ہے) اِن کا خالق خود کہاں ہے؟ غرض جب ایک اِنسان اِس نہج پر سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ اُس کے تخیّل و تفکر کا رُجحان یہ رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ تو پھر آخر کار وہ اپنی بے بسی کا اظہار صرف یہ کہہ کر کر سکتا ہے۔ کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!! اور جو کوئی بھی ہے۔ وہ اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے!!! اور وہ ذات جو اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اُسی کو دُنیا' اللہ۔ گوڈ (God) ایشور یا خُدا کہہ کر پکارتی ہے!

خُدا کیا ہے؟

اب یہ خُدا کیا ہے؟ خُدا دراصل:

"حُسن" ہے! یکتا "حُسن"!! لازوال "حُسن"!!!

اور ایک اِنسان جتنا اِس "حُسن" کو چاہتا ہے۔ اُتنا ہی زیادہ وہ (باطنی طور پر) حسین ہوتا چلا جاتا ہے!

کائنات معرضِ وجود میں کیوں آئی؟

اب اگر ہم اپنی نظر کو دُنیا کی تخلیق سے بھی پیشتر کے زمانہ کی طرف لوٹائیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت یہی "حُسن" مخفی تھا۔ (اور واللہ علم یہ کتنی مُدت اِسی طرح مخفی رہا؟) آخر اِس "حُسن" نے آشکار ہونا پسند کیا! اور یہ آشکارا ہونے کی بیتابی[1] ہی تھی۔ جو اِس کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا باعث بنی!

"حُسن" نے کیا چاہا؟

اِس سِلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیثِ قُدسی کے الفاظ نہایت اہم اور معنی خیز ہیں! معلوم ہوتا ہے۔ کہ "حُسن" کے کِسی شیدائی[2] نے "حُسن" سے ایک دن یہ پُوچھا۔ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ "حُسن" بولا:

---

[1] خُدا کی شان میں "بیتابی" کا لفظ شاید موزوں نہ سمجھا جائے۔ لیکن یہ محض نثر میں ہلکی سی "شاعری" ہے! اور اِس کی تہ میں اُس حدیث کا تخیّل کارفرما ہے جس میں ارشاد ہوا ہے "مَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً" (یعنی جو میری طرف چل کر آتا ہے۔ میں اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں!)

[2] یہ حضرت داؤد علیہ السلام تھے! حدیث کے الفاظ یہ ہیں: سَئَلَ دَاؤٗدُ عَلَیْہِ السَّلَامُ لِمَا ذَا خَلَقْتَ الْخَلْقَ قَالَ .... (اِس کے آگے وہی الفاظ ہیں۔ جو صفحہ ۱۹ پر درج کئے گئے ہیں) + یعنی حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک دن "حُسن" سے پوچھا۔ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ "حُسن" بولا.... (آگے کے لئے متن دیکھیں)

Marfat.com

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ۝

(یعنی میں گنجینۂ مستور تھا۔ میری آشکار ہونے والی بیتابی نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے دُنیا بنا دی!)

آیئے! اب ذرا اُس "حسن" کی کُنہ پر ایک سرسری نظر ڈالیں جس کی آشکار ہونے والی بیتابی نے یہ پسند کیا کہ وہ ظہور میں آئے! قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ "حسن" دراصل ایک نُور ہے۔ نورِ مطلق!

"حسن" نے ایسا کیوں چاہا؟ اور پھر اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے "حسن" نے کیا کیا؟

اب مندرجہ بالا

حدیث سے ایک اِنسان کو اِس بات کا اندازہ تو ہو جاتا ہے۔ کہ "حسن" نے کیا چاہا؟ لیکن اِس بات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کہ "حسن" نے ایسا کیوں چاہا؟ اور پھر اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے "حسن" نے کیا کیا؟

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک فطری امر ہے۔ کہ "حسن" ہمیشہ اپنے "حسن" کی داد چاہتا ہے۔ چنانچہ اِس مقصد کو پُورا کرنے کے لئے "حسن" نے سب سے پہلے اپنے نُورِ مطلق سے ایک "نُور" پیدا کیا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

(۱) اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ (یعنی اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا!)

(۲) یَا جَابِرُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ خَلَقَ نُوْرَ نَبِیِّكَ مِنْ نُوْرِهٖ (یعنی اے جابرؓ! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تیرے نبیؐ کے نُور کو اپنے نُورِ مطلق سے ہی پیدا کیا!)

(۳) اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُوْرِیْ (یعنی میں اللہ کے نُور سے ہوں۔ اور دُنیا کی تمام چیزیں میرے "نُور" سے ہی پیدا کی گئی ہیں!)

"عشق" کی تخلیق!

اب اگر "حسن" اپنے نُورِ مطلق سے اپنی طرح کا ہی ایک اَور "نُور" پیدا کر دیتا۔ اور وہ "نُور" نُورِ مطلق کے "حسن" کی "داد" دیتا۔ تو یہ نہ صرف آپ ہی اپنی داد دینے کے مترادف ہوتا۔

(یا بالفاظِ دیگر "در مدحِ خود می گوید" والا معاملہ ہوتا) بلکہ اِس طرح دو خدا ہو جاتے! لہٰذا نُورِ مطلق نے جب اپنے ہی نُور میں سے ایک اَور "نُور" پیدا کیا۔ تو فرق یہ رکھا۔ کہ نُورِ مطلق کی وضع اگر "حسن" ہے۔ تو دُوسرے "نُور" کی وضع "عشق" رکھی!

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جس طرح پہلے اشارۃً کہا جا چکا ہے "حسن" چونکہ فطری طور پر اپنے "حسن" کی داد ہی چاہتا ہے۔ اور دُنیا کی کوئی تخلیق "حسن" کی کما حقّہٗ داد نہیں دے سکتی۔ سوائے عشق کے۔ لہٰذا "حسن" کو لامحالہ

Marfat.com

"عشق" کی تخلیق کرنی پڑی ہے

تھا حُسن جو تنہا تو بنا عشق کا خالق !

صد شکر کہ آپ اپنے پہ مائل نہ ہوا تھا !

اسی لئے "حُسن" میں اگر "ناز" ہے تو "عشق" میں "نیاز" ہے! "حُسن" میں اگر "معبودیت" ہے تو "عشق" میں "عبدیّت" ہے !

یہ "عشق" ہی "نورِ مصطفویؐ" ہے !

اب اِسی "ناز والے نُور" (یعنی "حُسن") کو دُنیا "احد" کہتی ہے۔ اور "نیاز والے نُورؐ" (یعنی "عشق") کو "احمدؐ" کے نام سے پُکارتی ہے اور یہ "عشق" ہی دراصل "نورِ مصطفویؐ" ہے !

"عشق" کی آپ بیتی !

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ "عشق" نے اپنی تخلیق کے بعد کیا کیا ؟ اس سوال کا صحیح جواب جاننے کے لئے اب "عشق" کی آپ بیتی سُنئے !

حدیث میں آتا ہے۔ کہ جب ربّ العزت نے "عشق" یعنی "نورِ مصطفویؐ" کو پیدا فرمایا۔ تو اِس "نورؐ" نے نورِ مُطلق کو دیکھتے ہی کہا: "اَلحَمدُ لِلّٰہ"۔! (یعنی سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے!) ربّ العزت نے پھر ارشاد فرمایا :

"لِھٰذَا لِکَ خَلَقۡتُكَ وَسَمَّیۡتُكَ مُحَمَّدًا" (طرانی)

(یعنی آپؐ کے دہن مُبارک سے "اَلحَمدُ لِلّٰہ" کہلوانے کے لئے ہی آپؐ کو پیدا کیا گیا۔ اور اسی بنا پر آپؐ کا نام "مُحَمَّد" رکھا گیا !)

کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا پہلا دور !

اب اس "عشق" نے "حُسن" کی وہ "داد" دی۔ کہ اِس "داد" سے "حُسن" کی آشکار ہونے والی بیتابی نہ صرف اور بیتاب ہوئی۔ بلکہ "حُسن" نے "داد" میں تنوّع بھی چاہی !

چنانچہ اس "داد" میں تنوّع کی خواہش کی بنا پر "حُسن" نے جب سورج کی تخلیق کی۔ تو "عشق" نے "حُسن" کی

Marfat.com

"داد" روشنی اور شعاعوں سے دی !

اَب یہاں جو نکتہ سمجھنے کے قابل ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ اِس دُنیا میں جو تخلیق بھی ہوئی ہے ۔ اُس کا "خمیر" "نُورِ مُصطفویٰ" ہی ہے ۔ گو اُس کا خالق خُدا ہے ۔ اِسی لیئے حدیث میں اَنَا مِنْ نُوْرِ اللہ کے الفاظ کے فوراً بعد "وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُوْرِیْ" کے الفاظ آتے ہیں ۔ اب چونکہ ہر چیز کے "خمیر" میں "نورِ مصطفویٰ" ہے (جو سرتاپا عشق ہی عشق ہے) لہذا سُورج کے "خمیر" میں بھی "عشق" موجود ہے ۔ لیکن ہر "خمیر" کے "عشق" کی "سرشت" علیحدہ علیحدہ ہے ۔ چنانچہ سُورج میں جو "عشق" ہے ۔ اُس کی "سرشت" یہ ہے کہ وہ روشنی اور شعاعوں سے "حسن" کی "داد" دے ! یہاں جو اصلی نکتہ ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ روزِ آفرینش سے آفتاب پُوری آب و تاب کے ساتھ اپنی روشنی اور درخشانی سے "حسن" کی "داد" دینے میں منہمک ہے ۔ اور اِس تمام مُدت میں اُس نے آنکھ تک نہیں جھپکی ! اِس سے ایک طرف تو "حسن" کی منزلت کے کمال کا اظہار ہوتا ہے ۔ اور دوسری طرف "عشق" کی بھی منزلت معلوم ہوتی ہے ۔ کہ وُہ کس قدر "حسن" کے جلال و جمال کے شایانِ شان ہے !

یہاں ایک دوسرا نکتہ یہ ہے ۔ کہ سُورج کی یہی روشنی اور شعاعیں (جو "حسن" کی "داد" دینے میں منہمک ہیں) دراصل اُس کی "تسبیحیں" بھی ہیں ۔ اِسی لیئے یہی "داد" اور "تسبیحیں" نُورِ مصطفویٰ کو "رحمۃ للعلمین" بنا رہی ہیں !

غرض اِسی طرح "داد" میں تنوع کی خاطر "حسن" نے جب چاند کی تخلیق کی ۔ تو "عشق" نے "حسن" کی "داد" چمک دمک سے دی !

پھر یہی بیتابی جب ستاروں کو معرضِ وجود میں لائی ۔ تو "عشق" نے "حسن" کی "داد" چمکدار چمک سے دی !

اِسی طرح "حسن" کی آشکار ہونے والی بیتابی تخلیق کرتی گئی ۔ اور "داد" میں تنوع کی خواہش "عشق" کو اِس بات پر مجبُور کرتی گئی ۔ کہ وہ ہر تخلیق پر تازہ بتازہ نو بہ نو "اداؤں" سے "حسن" کی "داد" دے !

غرض "حسن" تخلیق کرتا گیا ۔ اور "عشق" ہر تخلیق میں رنگ بھرتا گیا !

یعنی اگر "نورِ مطلق" نے سُورج چاند اور ستارے پیدا کیئے ۔ تو "عشق" نے اپنے "نور" سے اُن کو مختلف "انوار" سے منوّر کیا !

"نورِ مطلق" نے اگر گل و گلزار پیدا کیئے ۔ تو "عشق" نے نہ صرف اُن کو مختلف رنگوں میں رنگا ۔ بلکہ طرح طرح کی خوشبو سے اُن کو معطّر کیا[1] !

---

[1] یہاں اِس بات کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے ۔ کہ بعض حضرات اس فلسفہ سے یوں استدلال کریں ۔ کہ :
رو ، اگر کائنات کی سب چیزوں کی تخلیق خدا تعالیٰ کی مرہُونِ منت ہے ۔ اور ان چیزوں میں مختلف "انوار" (مثلاً سورج میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

اب اس پسِ منظر میں مندرجہ ذیل شعر کیسی اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے ؎

کیا شانِ احمدیؐ کا چمن میں ظہور ہے !
ہر گُل میں، ہر شجر میں محمدؐ کا نُور ہے !

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ کا)

روشنی اور پھولوں میں خوشبو) "رحمۃ للعلمینؐ" کی طفیل ہیں۔ تو تمام کائنات میں خدا کی قدرتِ تخلیق و ربوبیت میں رحمۃ للعلمین بھی ایک خاص حد تک شریک ہیں۔ گویا اس طرح یہ "شرک" ہو گیا! — اور

(ب) اگر ہر چیز کی "تخلیق" خدا نے کی ہے۔ اور اس میں جو "صفتیں" پائی جاتی ہیں۔ وہ "نُورِ مصطفویؐ" کے "انوار" ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ادھوری ہوئی!

اب ان دونوں اعتراضات پر، مندرجہ ذیل معروضات کی روشنی میں، ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں!

شق (ا) میں جس اندیشہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی شک و شبہ کو ہی رسُولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے "اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُوْرِیْ" کے الفاظ ارشاد فرما کر دُور کیا ہے۔ حدیث کے ان الفاظ سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) "نُورِ مصطفویؐ" مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ ہے۔ یعنی "احمدؐ کا نور"، "احد" کے "نُورِ مطلق" سے ہی تخلیق کیا گیا ہے!
یہاں (جیسا پہلے کہا جا چکا ہے) ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ "احمدؐ کا نور" "احد کے نُور" کی وضع میں نہیں ہے۔ (اس طرح تو دو خدا ہو جاتے) بلکہ "احد کے نُور" کی وضع اگر "حسُن" ہے۔ تو "احمدؐ کے نُور" کی وضع "عشق" ہے! اب اگر "شرک ہو سکتا تھا تو مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ ہونا ہی شرک ہے۔ لیکن اگر یہاں کسی کو اعتراض نہیں تو بعد کی منازل میں اعتراض کی گنجائش ہی نہیں!

(۲) اب "احد" نے چاہا۔ کہ وہ پہچانا جائے! گویا "حسُن" نے چاہا۔ کہ "حسُن" کو اپنے حسُن کی داد ملے۔ چنانچہ "حسُن" نے "عشق" کو پیدا کیا!

(۳) "عشق" نے "حسُن" کی سب سے پہلے داد "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہہ کر دی! "حسُن" نے اس "داد" کو "لِذَالِكَ خَلَقْتُكَ وَسَمَّيْتُكَ مُحَمَّدًا" کے الفاظ سے سراہا!

(۴) پھر جب "حسُن" نے اس داد میں تنوع چاہی اور شمس و قمر پیدا کیے تو "عشق" نے "حسُن" کی داد چمک اور دمک سے دی! گویا جس غرض سے شمس و قمر کی تخلیق کی گئی تھی۔ وہ غرض چمک دمک سے پُوری کی گئی۔ اور اس غرض کو کماحقہٗ پُورا کرنے کی غرض سے ہی "عشق" نے "نُورِ مصطفویؐ" کا لقب پایا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

58581

Marfat.com

یہی راز تھا جس کا مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنی مشہور نعت میں ان الفاظ میں اظہار کیا ہے

گر ارض و سما کی محفل میں لَوْلَاكَ لَمَا کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ کا)

(۵) غرض "نورِ مصطفویؐ" نے جو کچھ کیا۔ وُہ تو محض تخلیق کی غرض کو پورا کیا۔ غرض کو پورا کرنا "شرک" نہیں کہلا سکتا! مثلاً اگر زیدؔ، بکرؔ سے کہے۔ کہ وہ اُس کے لڑکے (عمرو) کو عربی کا قاعدہ پڑھا دے۔ اور بکرؔ، زیدؔ کے حکم کی تعمیل کرے۔ تو بکرؔ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے زیدؔ کے ساتھ "شرک" کیا! بلکہ یہ کہا جائے گا۔ کہ بکرؔ نے زیدؔ کے حکم کی تعمیل کی!

(۶) اور بکرؔ اگر حکم کی تعمیل بڑھ چڑھ کر کرے۔ یعنی وہ عمروؔ کو نہ صرف عربی کا قاعدہ پڑھائے۔ بلکہ وہ اُسے عربی زبان میں بھی ماہر کر دے۔ تو اُس کا اقتضا یہ ہے۔ کہ زیدؔ، بکرؔ کو انعامات سے سرفراز کرے!

(۷) اور یہ انعامات کی سرفرازی ہی تھی۔ کہ "حُسن" نے "نورِ مصطفویؐ" کو کائنات کے رازوں سے آگاہ کیا۔ کہ ہر چیز کے "خمیر" کے "عشق" کی "سرشت" کیا ہے؟ تاکہ وہ اُسی "سرشت" یعنی "ادا" سے "حُسن" کی "داد" دے! چنانچہ سُورج کی "داد" دینے کی "ادا" "روشنی" ہے! چاند کی "داد" دینے کی "ادا" "خنک دمک" ہے۔ پھولوں کی "داد" دینے کی "ادا" "مہک" ہے۔ وغیرہ وغیرہ ٭ یہی "ادائیں" مختلف چیزوں کی "تسبیحیں" ہیں۔ اور یہی "تسبیحیں" دُنیا کے لئے "رحمتوں" کا باعث بھی بنی ہیں۔ اور انہیں "رحمتوں" کی بدولت عشق کے سردار اعظم نے "رحمۃ للعٰلمینؐ" کا لقب پایا ہے!

(۸) یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی صورتِ حالات "شرک" نہیں کہلا سکتی!

اَب شق اب کو لیجئے۔ یعنی یہ شبہ کہ اگر ہر چیز کی "تخلیق" خدا نے کی ہے۔ اور اُس میں جو "صفتیں" پائی جاتی ہیں۔ وہ "نورِ مصطفویؐ" کے انوار ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ادھوری ہوئی!

حقیقت یہ ہے۔ کہ قدرت نے اس دُنیا میں جو "چیز" بھی پیدا کی ہے۔ اُس کا ایک "مقصد" ہے ٭ قدرت صرف "چیز" پیدا کرتی ہے "مقصد" وہ مخلوق سے پورا کرواتی ہے!

مثلاً زمین میں سے گیہوں اُگتی ہے۔ گیہوں کا "مقصد" یہ ہے۔ کہ انسان روٹی کھا کر اپنا پیٹ بھرے لیکن قدرت پکی پکائی روٹی پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ روٹی کھانے کے لئے پہلے آپ کو خود گیہوں پسوانی ہوگی۔ خود آٹا گوندھنا ہوگا۔ خود آگ جلانی ہوگی اور خود توے پر روٹی پکانی ہوگی ٭

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴ پر)

اور جب اسی فلسفہ کو کسی پنجابی شاعر نے اپنایا تو اُس نے پھر یہ کہا ہے

سوہنا نام محمدؐ صلِّ علیٰ جس نام نوں لگدیاں دو دو میماں
دو میماں تھئیں روشن شمس و قمر اینہاں میماں نوں لکھ لکھ تعظیماں!

گویا اب حقیقت یہ ہوئی۔ کہ تمام اشیاء کی تخلیق تو خالقِ حقیقی نے کی ہے۔ لیکن اِن اشیاء میں جو صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ دَراصل اُس "نُور" کے "انوار" ہیں۔ جو "حُسن" نے سب سے پہلے اپنے "نُورِ مطلق" سے پیدا کیا۔ اور یہ انوار ہی دراصل وہ مختلف "ادائیں" ہیں۔ جن سے "عشق" نے "حُسن" کی کما حقّہٗ "داد" دی۔ اور یہی "حُسن" کا اصلی مقصد تھا!

اَب سماوی چیزوں اور گُل و گلزار سے ارض و حجر کی طرف آئیں + جب اِن کی تخلیق کی جاتی ہے۔ اور "نُورِ مصطفویؐ" کے "انوار" زمین اور پہاڑوں کے ذرّوں میں سرایت کرتے ہیں۔ تو تمام کائنات کا ذرّہ ذرّہ "حُسن" کی "داد" دینے میں منہمک ہو جاتا ہے! قرآن اِس "داد" کو پھر ان الفاظ میں سراہتا ہے:

"یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" (الجمعة ۔ آیت ۱)

یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ وُہ ربّ العزّت کی تسبیح میں مشغول ہے!

اَب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تسبیح" کون کر رہا ہے؟ اِس سوال کا صحیح جواب ایک دوسرے سوال

(بقیّہ حاشیہ صفحہ ۲۳ کا)

اسی طرح خدا نے انسان کی صرف تخلیق ہی کی ہے۔ صحت مند خوراک کھا کر جسم کی پرورش کرنا۔ یا وضو کر کے عبادت کرنا، یہ انسان کا اپنا کام ہے!

بالکل اسی طرح "حُسن" نے اپنے حسن کی کما حقّہٗ "داد" چاہی۔ اور اِس غرض سے اُس نے دُنیا میں مختلف چیزوں کی تخلیق کی۔ اَب چونکہ "داد" دینا "حُسن" کا کام نہیں۔ یہ "عشق" کا کام ہے۔ لہٰذا یہ فرض "نُورِ مصطفویؐ" نے انجام دیا۔ اور بطریقِ احسن انجام دیا!

اِس سے نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر تخلیق کا ایک "مقصد" ہوتا ہے۔ اور چونکہ خُدا تخلیق کے "مقصد" کو مخلوق سے ہی پُورا کرواتا ہے لہٰذا اِس لحاظ سے خدا کی کوئی تخلیق بھی اَدھوری نہیں کہی جا سکتی!

Marfat.com

ہیں مضمر ہے۔ کہ "تسبیح" کیوں کی جا رہی ہے؟ مؤخر الذکر سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں چونکہ صرف دو ہی عنصر ہیں۔ ایک "حسن" اور دوسرا "عشق"۔ اور "حسن" نے چاہا۔ کہ اُسے اپنے حسن کی "داد" ملے۔ لہذا یہ "داد" اب "عشق" ہی دے رہا ہے۔ چونکہ "داد" دینا "حسن" کا کام نہیں! لہذا ثابت ہوا۔ کہ تمام کائنات میں "نورِ مصطفوی" ہی "تسبیح" میں مشغول ہے!

یہ سب کچھ روزِ ازل سے کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ مخفی "حسن" نے جب آشکار ہونے کی بیتابی کا اظہار کیا۔ تو مدعا یہ تھا۔ کہ "حسن" کو اپنے حسن کی کماحقہٗ "داد" ملے! اس غرض کے لئے "حسن" نے "عشق" کو پیدا کیا! چنانچہ "عشق" نے پھر "حسن" کی وہ "داد" دی۔ کہ کائنات کے ذرہ ذرہ نے:

"حسن" کے حسن کی "داد" دی! "حسن" کے جمال کی "داد" دی! "حسن" کی یکتائی کی "داد" دی!!!

اور "داد" بھی اس طرح دی۔ کہ ہر تخلیق کی "داد" کی "ادا" مختلف تھی!

"حسن" کا "داد" لینے کا یہ پہلا دور تھا۔ جب یہ دور ختم ہوا۔ تو "حسن" عرش پر جلوہ افروز ہوا۔ اور "داد" لینے کا دوسرا دور شروع ہوا:

کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا دوسرا دور!

دوسرے دور میں

"حسن" نے سب سے پہلے فرشتے پیدا کئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایک فرشتہ معرضِ وجود میں آتا۔ وہ "حسن" کے انوار کی ایک نہایت ہی ادنیٰ سی جھلک پر فریفتہ ہو جاتا! دوسرا آتا۔ وہ فریفتہ ہو جاتا! تیسرا آتا۔ وہ فریفتہ ہو جاتا! غرض اس طرح لاکھوں اور کروڑوں فرشتے معرضِ وجود میں آئے۔ اور سب کے سب "حسن" کے انوار کی ایک نہایت ہی ادنیٰ سی جھلک پر ہی اُس پر فریفتہ ہوتے چلے گئے!

"حسن" نے پھر تنوع چاہا!

چنانچہ اس کے بعد "حسن" نے "نار" پیدا کی۔ اور "نار" سے جن و پری! ان کا شیوہ بھی اطاعت و فرمانبرداری ہی تھا![1]

---

[1] عام طور پر خیال یہ کیا جاتا ہے۔ کہ جنوں کی ناری مخلوق مطیع و فرمانبردار نہیں بلکہ سرکش ہے! جنوں کی سرکشی حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد ابلیس کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے: اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ رب العزت نے جب "فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ" کا ارادہ فرمایا۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو وہی مخلوق پیدا کرنی چاہیئے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

Marfat.com

لیکن "حسن" کو اپنے حسن پر کچھ ایسا ناز تھا - کہ فرشتوں کی فریفتگی اور جن و پری کی اطاعت و فرمانبرداری بھی اُس کی ناز برداری کے لئے کافی نہ سمجھی گئی!

چنانچہ "ناز" نے کہا - وہ حسن ہی کیا ہوا - جس کے آشکار ہونے پر کوئی فریفتہ ہو! وہ فریفتگی ہی کیا ہوئی جو حسن کے آشکار ہونے پر ظہور میں آئے!

اِس "ناز" کا مطلب یہ تھا - کہ حسن وہ ہے - جس پر حسن کے ظہور کے بغیر اُس کے آشکار ہوئے کے بغیر فریفتگی نثار ہو!

چنانچہ آخر کار "حسن" نے ایک ایسی جنس (یعنی حضرتِ انسان) کی تخلیق کی - کہ "حسن" اُس کے سامنے آشکار نہ ہو - پھر بھی وہ اُس پر فریفتہ اور نثار ہو[1]! یہی نہیں - بلکہ راستہ میں ایسی اُلجھنیں پیدا کردیں - کہ خواہ مخواہ انسان اُن اُلجھنوں میں اُلجھ کر رہ جائے - یعنی دُنیاوی زندگی میں ایک ایسی چمک اور اِس چمک میں سطح بین آنکھوں کے لئے ایک ایسی دمک رکھ دی - جو انسان کو "حسن" کی طرف مائل ہی نہ ہونے دے!

بایں ہمہ "حسن" مُصر تھا - کہ جب تک انسان نہ صرف اس چمک دمک کے باوجود، بلکہ "حسن" کے دیکھے بغیر، اس پر فریفتہ و نثار نہ ہو - تو وہ "حسن" ہی کیا ہوا!

چنانچہ اِس کٹھن اِمتحان میں رہروانِ محبت اور محبانِ صادق ہی پورے اُترے! اور جو پورے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵ کا)

جو اُس کے حسن کی "داد" دے! شروع شروع میں ہی سرکش مخلوق کا پیدا کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ لہذا یہ عقیدہ بعید از قیاس ہے - کہ جنوں کی مخلوق شروع سے سرکش تھی! البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں - کہ جنوں کی سرشت میں (انسانوں کی طرح) فرمانبرداری کے ساتھ سرکشی بھی موجود ہے - لیکن اس کے برعکس فرشتوں کی سرشت میں فرمانبرداری ہی فرمانبرداری ہے - سرکشی بالکل مفقود ہے!

[1] اللہ تعالیٰ پر انسان کے (بن دیکھے) فریفتہ و نثار ہونے کی وجہ یہ ہے - کہ جس طرح اِن صفحات کے شروع میں کہا گیا ہے۔

ہر سلیم الفطرت شخص جو اس دُنیا میں آتا ہے - یہ سوچنے پر مجبور ہے - کہ یہ دُنیا کیا ہے؟ اور اِس کو کس نے بنایا ہے؟

پھر جونہی ایک سلیم الفطرت اِنسان کو اُس ذات کی دُھن لگ جاتی ہے جس نے اِس محیر العقول کارخانے کو بنایا ہے - تو وہ بن دیکھے اُس پر فریفتہ ہو جاتا ہے! پھر وہ دن رات اُس کی جستجو میں لگ جاتا ہے - اور اس کو چین نصیب نہیں ہوتا - جب تک کہ وہ اُسے ڈھونڈ نہ لے - پا نہ لے - اُس کو اُس کی معرفت نصیب نہ ہو!

اِس لئے اِسلام کے نزدیک مقصدِ حیات صرف خدا کو "ماننا" نہیں ——— بلکہ خدا تک "پہنچنا" ہے!

Marfat.com

اُترے۔ اُن پر آشکار ہونے کے لئے "حُسن" خود :
بیتاب تھا! بیتاب ہے!! اور بیتاب رہے گا!!![1]

پس اس مختصر سی سرگذشت سے جو بات واضح ہوتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ دُنیا کی تخلیق محض اس غرض سے ہوئی۔ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ "حُسن" کی "داد" دے! چنانچہ یہ "داد" "حُسن" کو "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ"[2] کی صورت میں مل رہی ہے!

لیکن "حُسن" کا مدعا صرف اتنا ہی نہ تھا۔ "حُسن" تو آشکارا ہونا چاہتا تھا۔ اور اس آشکار ہونے کا تقاضا یہ ہے۔ کہ دُنیا اُس کی تجلیات کی متحمل بھی ہو سکے!

چنانچہ "حُسن" کو کائنات کے ذرہ ذرہ سے جو اس وقت "داد" مل رہی ہے۔ وُہ تو "حُسن" کے آشکار ہونے کے بغیر مل رہی ہے۔ یعنی بالغیب مل رہی ہے۔ لیکن "حُسن" کا اصلی مدعا یہ ہے کہ وُہ آشکار ہو۔ تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تجلیات کا متحمل بھی ہو سکے!

غرض اس وقت تک "حُسن" کی "داد" تو سب نے دے دی۔ لیکن "حُسن" کے آشکار ہونے پر "حُسن" کی تاب لانا، گویا اپنے آپ میں ایسا جذبہ پیدا کرنا کہ "حُسن" کے ظہور پر اُس کی تجلیوں کو سہا جا سکے، سمویا جا سکے، جذب کیا جا سکے، ایک ایسا بار تھا۔ ایسا بوجھ تھا۔ کہ کائنات کے ذرہ ذرہ نے اُس بوجھ کو اُٹھانے سے انکار کر دیا!

غرض جب یہ بار زمین کو پیش کیا گیا۔ تو وہ دہل گئی! پہاڑوں کو پیش کیا گیا تو وہ سہم گئے! اسی طرح شمس و قمر لرز گئے! اور آسمان خوفزدہ ہو گئے! لیکن قُدرت کی "ستم ظریفی" دیکھئے۔ کہ ایک حقیر سی مٹی کے حقیر سے پُتلے نے، کمزور و ناتواں ہونے کے باوجود، ظلُوماً جہُولا ہونے کے باوجود ایسی دلیری کی، ایسی جرأت کی۔ کہ کہنے لگا۔ "حُسن" کی تجلیات کا میں متحمل ہوں گا! اُس کی برق میرے دل پہ گرے گی!! اسی بجلی

---

[1] یہ اس لئے کہ ؎

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی!
ولیکن سُوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی!

(اقبال)

[2] آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ وہ رب العزت کی تسبیح میں مشغول ہے۔

(سورۃ ۶۲۔ الجمعۃ۔ آیت ۱)

Marfat.com

سے میں طبع آزمائی کروں گا"[1] !!!

لہذا انسان کی تخلیق کا حقیقی مقصد یہ ہوا۔ کہ:۔

اوّلاً وہ "حسن" پر بالغیب فریفتہ ہو (اور فریفتگی میں ظاہر ہے۔ کہ وہ "حسن" کی "داد" دے۔۔۔ اور عبادت کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ کہ "حسن" کی کماحقہٗ "داد" دی جائے!) اور

ثانیاً جب اس کماحقہٗ "داد" کے صلہ میں "حسن" آشکار ہو (جس کے لئے وہ بیتاب ہے)۔ تو انسان نہ صرف خود "حسن" کی تجلّیات کا متحمل ہو سکے۔ بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ بھی اُس "حسن" کی تاب لا سکے! یعنی بالفاظ دیگر "حسن" کے آشکار ہونے پر دُنیا کے لوگ حضرت موسیٰؑ کی طرح بیہوش ہو کر نہ گر پڑیں! اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ بھی طور پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ نہ ہو جائے! چنانچہ انسانوں کو پُختہ کار بنانے کے لئے (تاکہ وہ "حسن" کی تجلّیات کے متحمل ہو سکیں)۔ عشق کے سردار اعظمؐ نے اپنی سُنّت کی پیروی کو انسانیت کیلئے ضروری قرار دیا۔ اور کائنات کو اس بار کے متحمل کرنے کے لئے اپنی رحمت کو وقف کر دیا۔ چنانچہ حضورؐ اس وقت بھی "وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی"[2] (یعنی آپؐ کا مستقبل ماضی سے ہمیشہ بہتر ہوگا) کے تحت اُس کو "تیار" کرنے میں مشغول و منہمک ہیں!

یہاں اتنا اور لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک ایک انسان کا فرداً فرداً "حسن" کی تجلّیات کے متحمل ہونے کا تعلق ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ بابرکات اس میں پیش از پیش ہے!۔۔۔ اور تمام پیغمبرانِ علیہم السلام، صحابۂ کرامؓ اور اولیائے کرامؒ آپؐ کے کفش برداروں میں سے ہیں۔ لیکن جہاں تک باقی تمام انسانیت اور کائنات کا تعلق ہے۔ اُس میں "نُور کا اتمام" ابھی باقی ہے! قرآن میں وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ[3] کے الفاظ

---

[1] یہاں اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ کہ آسمان و زمین اور شمس و قمر کی صورت میں "نورِ مصطفویؐ" اُن کی سرشت کے مطابق ایثار و بے اختیار کرتا ہے۔ لیکن فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی صورت میں یہ "نور" اُن کی "سرشت" کے مطابق رویہ اختیار کرتا ہے:

[2] سورۃ الضحیٰ ۹۳۔ آیت ۴:

[3] سورۃ ۶۱ الصف۔ آیت ۸: (اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے:)

Marfat.com

اِسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اس تمام بحث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے اپنے "نورِ مطلق" سے ایک اور "نور" (یعنی نورِ مصطفوی ص) کو پیدا کیا۔ تو یہ "وحدت" سے "کثرت" کی تمہید تھی؛[1] اور جب اس "نورِ مصطفوی ص" سے تمام دنیا کی تخلیق کی گئی۔ تو یہ "وحدت" سے "کثرت" کی تکمیل کی طرف قدم تھا؛ اس "کثرت" کی پوری "تکمیل" قیامت سے قبل قبل ہو گی؛

(۲) روزِ ازل سے لے کر اِس وقت تک جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا رہا ہے۔ وہ سب اِس کائنات میں "نور کے اِتمام" کی "تمہید" ہے؛ مادی دنیا میں اِس "تمہید" کی حقیقی ابتدا حضرتِ انسان کی تخلیق سے ہوئی؛ حضورؐ کی ذات میں اِس "نور کا اِتمام" ہو چکا ہے لیکن (جس طرح اُوپر کہا گیا ہے) جہاں تک باقی تمام انسانیت اور کائنات کا تعلق ہے۔ اس میں "نور کا اِتمام" ابھی باقی ہے! اب یہ "اِتمام" کب ہو گا؟ اور کس طرح ہو گا؟ یہ صفحات صرف اِسی مسئلہ کی تفسیر ہیں!

(گذشتہ چند سطور محض "جملہ معترضہ" ہیں؛ آیئے! اب "دنیا کی کہانی" کی سرگذشت کی طرف پھر لوٹ جائیں)

حضرت آدمؑ کا مختصر اقصہ

غرض جب انسان "حسن" کی تجلیات کی بجلیوں سے کھیلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اُس نے اتنے بڑے بار کو اُٹھانے کے لئے "ہاں" کر دی۔ تو اللہ جلشانہٗ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بارہ میں فرشتوں سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگے:-

"اے باری تعالیٰ! کیا آپ ایسے لوگوں کی تخلیق کا ارادہ رکھتے ہیں جو دنیا میں فساد برپا کریں گے۔ اور خون بہایں گے؟ اور ہم ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں!"[2]

---

[1] "وحدت" سے "کثرت" یا "احد" اور "احمدؐ" کے مسئلہ پر ذیل کے اشعار دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں ؎

عجب رنگ بے رنگ نے ہیں دکھائے ! حقیقت محمدؐ کے جلوے دکھائے !
کہیں اپنا محبوبؐ مظہر بنایا ! کہیں قل ھو اللہ کے خطبے سنائے !
کہیں رَبِّ اَرِنِی کہیں لن ترانی ! کہیں اُدنُ مِنّی کے نغمے سنائے !

[2] دیکھو سورۃ ۲ البقرہ آیت ۳۰؛

Marfat.com

خدا تعالیٰ نے جواب میں فرمایا "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"[1]

تب رب العزت نے حضرت آدمؑ کو روئے زمین کی تمام موجودات کے اسماء و خواص کا علم دے دیا: پھر وہی چیزیں فرشتوں کے رُو برُو کر کے پُوچھا۔ کہ اِن چیزوں کے نام بتاؤ! فرشتے جب نہ بتا سکے۔ تو اُنھوں نے کہا۔ کہ اُن کو تو صرف اُتنا ہی پتہ ہے۔ جتنا کہ اللہ جلشانہٗ نے ان کو علم دیا ہے: پھر رب العزت نے حضرت آدمؑ سے کہا۔ کہ وہ اُن چیزوں کے نام بتائیں: جب اُنھوں نے بتا دیئے۔ تو رب العزت نے فرمایا۔ کہ میں نے نہ کہا تھا۔ کہ میں زمین و آسمان کے تمام پوشیدہ رازوں کو جانتا ہوں؟

پھر اللہ جلشانہٗ نے حضرت آدمؑ کی پیٹھ میں سے تمام ذرّیت کی رُوحوں کو پیدا کر کے جمع کیا۔ اور اُن کو گویائی کی طاقت عطا کی۔ اور سب سے پوچھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ[2] (یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سب نے کہا۔ "بَلٰی" (یعنی آپ ضرور ہمارے رب ہیں!)

پھر حضرت آدمؑ نے تمام رُوحوں کی طرف نظر کی: آپ نے دیکھا۔ کہ کچھ رُوحیں بے حد منوّر ہیں! آپ نے رب العزت سے پوچھا۔ کہ اس قدر تابناک رُوحیں کس کی ہیں؟ ارشاد ہوا۔ کہ یہ سب انبیاء علیہم السلام وغیرہ کی رُوحیں ہیں! اس کے بعد حضرت آدمؑ کی نظر دوسری رُوحوں پر پڑی۔ وہ اس طرح دکھائی دیں۔ جیسے کوئی (۱) نہایت گورے اور (۲) نہایت سیاہ فام لوگوں کو دیکھ رہا ہو! آپ نے اِس امتیاز کی وجہ دریافت فرمائی۔ تو ارشاد ہُوا۔ کہ یہ امتحان کا نتیجہ ہے۔ یعنی کونسی رُوحیں اپنے رب کا شکر ادا کر کے کامیاب ہوں گی۔ اور کونسی ناشکر گزاری کر کے ناکامیاب رہیں گی!

غرض جب سب رُوحوں نے اپنے رب کی یکتائی کا اقرار کیا۔ تو اللہ جلشانہٗ نے اِن تمام رُوحوں کے باپ حضرت آدمؑ کی حوصلہ افزائی کا مظاہرہ اِس طرح کیا۔ کہ تمام مخلوق کو حکم دیا۔ کہ وہ اشرف المخلوقات کے سامنے سربسجود ہو جائے: فرشتوں نے تو اپنی جبلّی خُوئے تسلیم و رضا کی بنا پر فوراً سر کو خم کر دیا۔ لیکن جنوں میں سے ایک اکڑ گیا! کہنے لگا۔ نار[3]، طین[4] کے سامنے نہیں جھک سکتی! آگ مٹی کے آگے زانوِ ادب نہیں تہ کر سکتی! جب "حسن" نے اُس جن[5] کو اُس کے غرور اور نافرمانبرداری کی وجہ سے اپنی درگاہ سے راندھ دیا۔ تو اُس

---

[1] مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے: (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰):

[2] سورۃ ۷ الاعراف آیت ۱۷۲

[3] آگ:

[4] مٹی:

[5] یہی وہ جن ہے جس کو دُنیا "شیطان" کے نام سے پکارتی ہے!

Marfat.com

وقت سے وہ اِنسان کا "رقیب" بن گیا۔ اور یہ رقابت اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی!

"رقابت" میں "عداوت" کا ہونا ظاہر ہی ہے! چنانچہ اِس "رقیب" نے "عدوِ مبین" ہونے کی حیثیت سے جو سب سے پہلے "عداوت" کی۔ وہ حضرت آدمؑ سے کی! اِس افسانہ کی مختصر سی سرگذشت یوں ہے:

"حُسن" نے جب حضرت آدمؑ کو اپنے مقصدِ عظیم کے لیے چُن لیا۔ تو "حُسن" نے اُن کی دلجوئی کے لیے اُنہی کی پسلی میں سے ایک رفیقۂ حیات عطا کردی! اِسی لیے حدیث میں آتا ہے لِاَنَّھَا خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعِ الْیُسْریٰ (یعنی اِسی لیے حضرت حوّا اُن کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں!)

چنانچہ جب حضرت حوّا' البیلی دُلھن کی صورت میں' حضرت آدمؑ کے سامنے رُونما ہوئیں۔ تو آپ نے پُوچھا "تم کون ہو؟" وہ بولیں۔ میں اِس لیے پیدا کی گئی ہوں۔ کہ ہم آپس میں محبّت کریں! حضرت آدمؑ نے کہا۔ پھر تم میرے قریب آؤ! وہ بولیں (اور اُس وقت اُن کے لہجے میں نہ صرف خودداری و متانت تھی۔ بلکہ تبسّم بھی!) کہ محبّت کی رسم و راہ میں پیار سے پہلے ضروری ہے۔ کہ "پری پیکر" کا پہلے کوئی "پیا" بنے! (یہاں صنفِ نازک کی جبلّی پاکیزگی اور ضبطِ نفس کا ثبوت ملتا ہے!)

غرض اِس "پہلی ملاقات" سے دونو طرف برابر کی آگ تو لگ گئی! لیکن طرفین پریشان و مضطر تھے۔ کہ اِس لگن کی تسکین کس طرح ہو؟ اُس وقت پھر اللہ جلشانہٗ نے دو پریشان دلوں کو ایک دوسرے کی آغوش میں جانے کی نہ صرف صورت سُجھائی۔ بلکہ اجازت بھی عطا کی۔ اور کہا۔ کہ اب تم دونوں جنّت میں عیش کرو۔ لیکن اِس خاص درخت کے پاس نہ جانا!

لیکن جب اِن دونو پریمیوں کو ایک دوسرے کی پریت میں مگن رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا۔ تو ایک دن "عدوِ مبین" نے اُن کو بہکایا۔ کہ وہ ممنوعہ درخت کا پھل ضرور کھائیں۔ کیونکہ اِس طرح اُن کو فرشتوں کی سی حیاتِ ابدی نصیب ہوگی! چنانچہ جب یہ بھولے بھالے اِس فریب میں آگئے۔ تو نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اگر ایک وقت حضرت آدمؑ رُوحانی علوم سے مالامال تھے۔ پھر نہ "حُسن" کا دیدار رہا! نہ اُس کی تجلّیاں!! کفِ افسوس ملنے لگے۔ لیکن کچھ نہ بنا! اور "حُسن" کی درگاہ سے "بہت بے آبرو" ہو کر نکال دیئے گئے! چنانچہ جب اِس دُنیا میں آئے۔ تو رفیقۂ حیات تو ضرور ساتھ تھی۔ لیکن دونو نہایت غمگین' بیحد افسردہ!

چنانچہ روتے روتے جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی ہوگئے۔ تو آہستہ آہستہ' مدت مدید کے بعد بڑی مشکل سے' دل کی بیقراری کو قرار آیا!

اب سوال صرف اتنا ہے۔ کہ دل کی بیقراری کیوں تھی؟ اور قرار کس طرح آیا؟

بیقراری تو اِس لیے تھی۔ کہ "حُسن" سے جُدا ہوگئے!

Marfat.com

اور قرار اس لئے آیا۔ کہ امید کی ایک کرن ابھی باقی تھی! اور وہ یہ کہ محبوب سے جُدائی کے باوجود ابھی "حسن" پر "بالغیب" فریفتہ ہوا جا سکتا تھا! اور یہ فریفتگی آخر کار یہ رنگ لا سکتی تھی۔ کہ "حسن" پھر آشکار ہو! اور اُس کی تجلّیاں پھر وارد ہوں!!

چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام دُنیا کو صرف اِس بات سے آگاہ کرنے کے لئے آئے۔ کہ اگر انسان "حسن" پر بالغیب فریفتہ نہیں ہیں۔ تو وہ فریفتہ ہوں! اور جب وہ فریفتہ ہوں گے۔ تو صرف "حسن" کی یاد[1] سے ہی اُن کے دل خورسند نہیں ہوں گے۔ بلکہ جب "حسن" کی یاد دیدار کی تمنّا کو بیتاب کرے گی۔ اور یہ بیتابی پھر "دیدۂ دیدار طلب" کی شکل میں ہویدا ہوگی۔ تو اِس بیتابی کی تڑپ محض سیماب کی مانند ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ "نشۂ مضراب ساز" کو کچھ اِس طرح "چھیڑا" جائے گا۔ کہ جب کوئی پوچھنے والا "عشق کے انجام" کی بابت سوال کرے گا۔ تو اِس سوال کا جواب اُس کے سوا نہ بن پڑے گا۔ کہ ؎

وصالِ یار کی مسعود ساعتیں مت پُوچھ!

البتہ حضرت آدمؑ و حوّا کی سماوی زندگی اور دُنیاوی زندگی میں یہ فرق ضرور رہا۔ کہ وہاں "حسن" کا دیدار اور اُس کی تجلّیاں ہر وقت موجود! لیکن یہاں معرفت پر موقوف!

یعنی اگر معرفت ہو۔ تو یہ دونوں نعمتیں میسّر، بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اشرف المخلوقات کے لئے مسخّر! لیکن اگر معرفت نہ ہو۔ تو انسان نہ صرف بے بصیرت۔ بلکہ سیرت کے لحاظ سے بدکردار، اور سب ضرورتوں کے لئے غیروں کا حاشیہ بردار!

چنانچہ اِس دنیاوی زندگی میں اب معرفت کی تجلّیات "تدریجی ارتقا" کے اصول کے تحت ظہور میں آرہی ہیں۔ اور انسانیت نے اب تک رُوحانی طور پر "تسخیرِ کائنات" میں جو ترقی کی ہے۔ وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہو رہی ہے:

"تدریجی ارتقا" کے اُصول کے تحت "معرفت" اور کائنات کی "رُوحانی تسخیر"!

آیئے! اب پہلے اُس معرفت پر نظر ڈالیں۔ جو "تدریجی ارتقا" کے اصول کے تحت اب تک ظہور میں آئی ہے: اور اِس معرفت کے نتیجہ کے طور پر جو کائنات کی "رُوحانی تسخیر" ہوئی ہے۔ اُس کے متعلق بھی کچھ آگاہی حاصل کریں:

تدریجی معرفت، انسان کو "لدنّی علم" کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اور تدریج کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ

[1] "ذکرِ الٰہی" سے مقصود یہی ہے!

Marfat.com

انسانیت یکدم اِس علم کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی!

چنانچہ جس طرح پہلے کہا جاچکا ہے۔ اگرایک وقت حضرت آدمؑ معرفت کے علم سے مالا مال تھے۔ جب اِس دُنیاوی ارض پر قدم رکھا۔ تو سوائے "چند کلمات" کے جو اپنی لغزش کو معاف کروانے کے لئے رب العزت سے حاصل کر چکے تھے۔ عرفانی لحاظ سے محض طفلِ مکتب کی حیثیت کو پہنچ چکے تھے! یہانتک کہ سفید اور گورا جسم جھُلس کر سیاہ ہوگیا تھا۔ البتہ متذکرہ بالا "کلمات" کی بدولت آہستہ آہستہ پھر اپنے جوبن پر آگئے!

غرض مدت مدید کے بعد جب حضرت نوحؑ کو اسی لُدنّی علم سے کچھ حصہ ملا۔ تو اُس کی مقدار کا اندازہ صرف اِس بات سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ ساڑھے نو سَو سال میں صرف ۷۲ اِنسان ایمان لائے! اور "عشقِ الٰہی" کے مقابلہ میں پدری محبت آپ کی طبیعت پر ابھی اتنی غالب تھی۔ کہ طوفان کے موقع پر اپنے "غیر صالح" بیٹے کے متعلق ہی سفارش کردی۔ چنانچہ اُس پر فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ[1] سے ہلکی سی سرزنش ہوئی!

اب حضرت ابراہیمؑ کی باری آتی ہے۔ آپ کو حیرانی تھی۔ کہ مُردے کس طرح زندہ کئے جاتے ہیں؟ جب آپ نے اِس تعجب کا اظہار کیا تو ارشاد ہوا کہ کیا یقین نہیں؟ عرض کیا۔ یقین تو ضرور ہے۔ لیکن نبی نوع انسان کی آنکھ کو ابھی دید کی تمنّا باقی ہے۔ لہذا وہ دیدار کی طالب و تشنہ ہے!

غرض اِس گفت و شنید کے بعد حکم ملا فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ[2] (لیکن جب "تدریجی ارتقا" کے اصول نے اپنا کام کیا۔ تو حضرت عیسیٰؑ نے خود مُردے زندہ کئے! یہی "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ" حضرت ابراہیمؑ سے نہیں کہلوایا۔ کیونکہ ابھی زمین "تیار" نہیں تھی!)

پھر حضرت موسیٰؑ کی باری آتی ہے۔ آپ کو یہی خدائی علم کچھ زیادہ مقدار میں ملا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب اُنہوں نے محسوس کیا۔ کہ اُنہیں تو بیحد علم ہے۔ تو یہ مغالطہ رفع کرنے کے لئے اللہ جلشانہٗ نے آپ کو حضرت خضرؑ سے ملنے کے لئے کہا۔ جن کو عَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا[3] کا سرٹیفکیٹ مل چکا ہوا تھا! اور یہ "حسن" کو تاب میں لانے کی قدرت میں کمی ہی تھی۔ کہ جب حضرت موسیٰؑ نے رَبِّ اَرِنِیْ[4] کہا۔

---

[1] یعنی ایسی مانگ نہ مانگو۔ جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو۔ کہ ویسی مانگ جائز بھی ہے۔ یا نہیں! (سورۃ ۱۱ ھود۔ آیت ۴۶)

[2] یعنی چار پرندے پکڑ کر ہلا لو۔ (اس کی باقی تفصیل سورۃ ۲ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۶۰ میں ہے)۔

[3] ہم نے اُسے اپنا علم لُدنّی عطا کیا (سورۃ ۱۸ الکھف۔ آیت ۶۵)

[4] میرے رب مجھے اپنا دیدار دکھا (سورۃ ۷ الاعراف۔ آیت ۱۴۳)

Marfat.com

تو ارشاد ہوا لَنْ تَرَانِیْ[1]!

ایسا کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ انسانیت ابھی "دیدار" کی تاب نہیں لا سکتی تھی! لیکن جب حضورؐ پر نور کی باری آئی۔ تو "قَابَ قَوْسَیْنِ[2]" تک نوبت پہنچی!

اب اس لدنی علم کے ساتھ ساتھ انسانیت نے کائنات کی "روحانی تسخیر" میں جو ترقی کی۔ اس پر بھی ایک نگاہ ڈالتے جائیے:

ہم یہ دیکھ چکے ہیں۔ کہ حضرت آدمؑ اور حواؑ نے تو اپنی تمام عمر گریہ وزاری میں ہی گزار دی!

حضرت نوحؑ صرف آپ بمعہ محدودے چند انسانوں اور جانوروں کے بچے۔ باقی تمام مخلوق غرق ہو گئی۔ گویا "رقیب" نے کسی بات میں پیش نہ جانے دی!

حضرت ابراہیمؑ نے "رقیب" کی آنکھوں کے سامنے آگ سے نجات پائی!

حضرت موسیٰؑ نے اپنے آپ اور اپنی قوم کو بھی بچایا۔ اور دشمن کو بھی غرق کیا!

اب چونکہ انسان کو "رقیب" سے نجات حاصل کرنے کی استعداد حاصل ہو چکی تھی۔ لہذا حضرت سلیمانؑ نے بادشاہت کی۔ اور رفاہِ عام کے امور بھی سرانجام دئے!

حضرت عیسیٰؑ نے محض رفاہِ عام ہی نہیں کی۔ بلکہ رفاہِ عام میں جو مشکل ترین امور تھے۔ اُن کو بھی حل کیا! یعنی کوڑھیوں کو اچھا کیا۔ مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں۔ یہاں تک کہ مُردوں کو زندہ کیا! اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ سب کچھ "حسن" کے حکم سے ہوا۔ اور "حسن" کے ایما سے ہوا۔ یہی "حسن" کی "ادائیں" ہیں!

اب "عشق" کے سردار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی باری آتی ہے!

جہانتک غزوات کا تعلق ہے۔ آپ نے اپنے لئے کوئی انوکھے ہتھیار مہیا نہیں کئے: بلکہ زمانہ کی رفتار کے مطابق تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور نیزہ کے جواب میں نیزہ کو کافی سمجھا۔ کیونکہ مردانگی اسی میں ہے کہ ایک انسان اپنے دشمن کے مقابلہ میں ہم پلہ ہو: چنانچہ ایک بہادر کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ کسی حریف سے جنگ آزما تھا: دونو گھوڑوں پر سوار تھے۔ لیکن حریف کے ہاتھ سے اُس کی تلوار زمین پر گر پڑی: بہادر فوراً گھوڑے سے اُترا۔ اور اُس نے خود حریف کی تلوار کو حریف کے ہاتھ میں دیا۔ کیونکہ وہ بہادر حریف کے خلاف ایک اتفاقی حادثہ سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا! اس کا

---

[1] تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا (سورۃ ۷ الاعراف۔ آیت ۱۴۳)

[2] دو ہاتھ کا فاصلہ (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۹)

Marfat.com

مطلب یہ ہے۔ کہ بہادری اسی میں ہے۔ کہ لڑائی میں فریقین برابر ہوں! چنانچہ اسی لئے عشق کے سردارِ اعظم نے اپنے زمانہ کے حالات کے مُطابق نیزہ و تلوار پر ہی اکتفا کی!

لیکن جہاں تک معرفت کا تعلق ہے۔ عشق کے سردارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ببانگِ دہل فرمایا۔ کہ "نرگس" سینکڑوں اور ہزاروں سال اپنی "بے نُوری" پر یہ کہہ کر روتی رہی ہے

فرض کردم کہ بیادِ تو دلم خور سند است!
لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج؟

جہاں والوں کو مژدہ ہو۔ کہ اب انسان نُور پر بیہوش نہیں ہوا کریں گے! کیوں؟ اس لئے کہ اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى ہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ہ[1] ایک شاعر نے انسان کی اسی "تدریجی ارتقا" کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمے!

اور قرآن نے اس ارتقا کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے:۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ہ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ہ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ہ[2]

اور پھر "دیدۂ دیدار طلب" کی تشفی کرنے کے بعد یہ جتا دیا۔ کہ اگر لوگ "ایمان کی حرارت" کے لحاظ سے اوسط درجہ سے نیچے ہوں گے۔ تو اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ[3] رہیں گے! اوسط درجہ پر ہوں گے تو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ[4]۔ اور

---

[1] یعنی جب سدرۃ المنتہیٰ پر چھا رہا تھا۔ جو چھا رہا تھا: نگاہ نہ تو ہٹی۔ اور نہ اُسے دھوکا ہوا:
(سورۃ ۵۳ النجم۔ آیات ۱۶-۱۷)

[2] اور وہ اونچے کنارہ پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ دو کمان کا یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا۔ پھر اللہ نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کرنا چاہی۔ قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ پھر کیا تم پیغمبر کی دیکھی ہوئی چیز میں جھگڑتے ہو؟ (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیات ۸-۱۲):

[3] نیچی سے نیچی حالت (سورۃ ۹۵ التین۔ آیت ۵)

[4] تم ہی غالب آؤ گے (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۳۹).

Marfat.com

اگر اوسط درجے سے اوپر ہوں گے۔ (جیسا کہ تمام اولیائے کرام ہو چکے ہیں۔ یا ہیں اور ہوں گے)۔ تو اس صورت میں یہ "مٹی کا پتلا" ؎

پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتا ہے!

اور اس حالت میں نہ اُسے ہوائی جہاز کی ضرورت ہے۔ نہ خلائی جہاز کی! اسی لئے نہ حضرت عیسیٰؑ کسی ہوائی جہاز میں آسمان پر گئے۔ اور نہ وہ کسی پیراشوٹ Parachute کے ذریعہ نیچے اُتریں گے!

(نوٹ)

اب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ جن اولیائے کرام کی بابت اُوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ بزرگ ہستیاں کہاں ہیں؟ اس کا جواب اگلے صفحات میں بالتفصیل آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے ؎

زما سلام رسانید ھر کجا ہستند!

Marfat.com

باب دوم

دُنیا کی کہانی کا وسط

تمہید

اس وقت تک ہم نے جو کچھ پڑھا ہے۔ وہ دُنیا کی کہانی کے **آغاز** کا مجمل سا خاکہ ہے:۔ اب دنیا کی **وسط** کی کہانی سُنیئے:۔ یہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے:۔ جس طرح پہلے اشارۃً کہا جا چکا ہے۔ دُنیا کی کہانی کا یہ حصہ اس وقت تمامتر مَنْ **يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ**[1] کی تفسیر ہی ہے:۔ یہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی اصلی وجہ ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہمیں پہلے دُنیا کی تخلیق کی حقیقی وجہ معلوم ہو۔ یا بالفاظ دیگر انسان کی زندگی کے مقصد کا کما حقہٗ راز معلوم ہو۔ نہایت مختصراً وہ راز صرف ایک لفظ میں مضمر ہے۔ اور وہ لفظ ہے "قُرب" یعنی "قُربِ الٰہی"!

اس "قُربِ الٰہی" کا ایک ذیلی لیکن نہایت اہم اقتضا کائنات کی "رُوحانی تسخیر" ہے۔ جس کی مختصر روئداد اُوپر گزر چکی ہے:۔ لیکن چونکہ انسان کے "عدوٌ مبین" کی راہ میں "رُوحانی تسخیر" ایک کانٹا تھی۔ لہٰذا اس کانٹے کو ہٹانے کے لئے اُس نے کائنات کی "مادّی تسخیر" کا ایک منصوبہ بنایا:۔ یہ کیوں بنایا؟ کب بنایا؟ اور کس طرح بنایا؟ اس کی تفصیل آگے آئے گی:۔ یہاں جو نکتہ سمجھنا نہایت لازمی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو موجودہ مسلمانوں کی نظروں سے عموماً اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں سے خصوصاً بالکل اوجھل ہے:۔ ہماری نگاہیں اس وقت کائنات کی موجودہ "مادّی تسخیر" سے اس قدر اُلجھی ہوئی ہیں۔ کہ ہمارے ذہن سے اب یہ تخیّل ہی بالکل مفقود ہو چکا ہے۔ کہ اس دُنیا میں کائنات کی "رُوحانی تسخیر" بھی کوئی شے ہے:۔ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیینؐ کی رسالت تک جتنے بھی معجزات رُونما ہوئے ہیں۔ وہ صرف کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کی بدولت ہی تھے۔ لہٰذا اس وقت جو نکتہ ذہن میں رکھنا نہایت

---

[1] جو زمین میں فساد پھیلائے گا۔ اور خونریزیاں کرے گا:۔ (سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۳۰)

Marfat.com

ضروری ہے - وہ یہ ہے - کہ قرآن کی "معجزات والی کہانی" ختم نہیں ہوگئی - بلکہ اس نے ابھی پورے جوبن پر آنا ہے! جیسا کہ اگلے صفحات میں تشریح کی گئی ہے - کائنات کی موجودہ "مادی تسخیر" جو ہم اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھ رہے ہیں - وہ ایک عارضی شے ہے - گویا موجودہ "مشین کا زمانہ" "ایک عبوری دور" ہے - جس نے اپنی مہلت کے پورا ہونے کے بعد ختم ہو جانا ہے! یعنی جس طرح اس دنیا میں کبھی "زمانۂ حجر" تھا - اور اس کے بعد "زمانۂ جدید" آیا - اسی طرح موجودہ "مشین کے زمانہ" کی بھی ایک خاص مدت مقرر ہے - جب یہ مدت ختم ہوگئی - تو پھر "روحانی زمانہ" آئے گا - جس میں موجودہ "مادی تسخیر" کے مقابلہ میں کائنات کی "روحانی تسخیر" عمل میں آئے گی ؛ اس کی پوری تفصیل آگے آئے گی ؛

یہاں سب سے پہلے جس نکتہ کو سمجھانا مقصود ہے - وہ یہ ہے - کہ آخر کار کائنات کی "روحانی تسخیر" لابدی کیوں ہے؟ اور پھر اس نکتہ پر روشنی ڈالی جائے گی - کہ کائنات کی موجودہ "مادی تسخیر" دنیا میں کس طرح شروع ہوئی؟ کب شروع ہوئی؟ کیوں شروع ہوئی؟ اور اس وقت دنیا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ کی تفسیر کیوں ہے؟ پھر اس بات کی سمجھ آئے گی - کہ دنیا کی کہانی کا انجام کیا ہونا چاہیے؟ اور کیوں ہونا چاہیے؟ اب پہلے کائنات کی "روحانی تسخیر" کے لابدی ہونے کے دلائل سنیئے!

انسان کا حقیقی مقصدِ حیات!

اس راز کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے - کہ ہم انسان کے حقیقی مقصدِ حیات کو اچھی طرح ذہن نشین کریں ؛ اس سلسلہ میں قرآن کے مندرجہ ذیل الفاظ پر نہایت تعمق سے غور کرنے کی ضرورت ہے - یعنی

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (سورۃ ۵۱ - الذریٰت - آیت ۵۶)

(یعنی میں نے پیدا نہیں کیا جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں) ؛

اب اصلی سوال یہ ہے - کہ عبادت سے کیا مراد ہے؟ یعنی کیا غرض صرف یہ ہے - کہ ایک انسان ہر وقت نماز وغیرہ میں مشغول رہے؟ یہی مقام ہے - جس پر عام طور پر ہم میں سے اکثر نے غور نہیں کیا ؛ لہٰذا مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ لیا گیا - کہ جو لوگ نماز و روزہ کے پابند ہیں - اور اسلام کے دوسرے احکام پر عمل پیرا ہیں - وہ اس آیت کا مقصد پورا کر رہے ہیں - گویا اسلام کے نزدیک مقصدِ حیات یہ ہے - کہ لوگ نیک اور متقی بنیں ؛

لیکن اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں ہے ؛ اس سلسلہ میں جس نکتہ پر غور نہیں کیا گیا - وہ یہ ہے - کہ دنیا کی تخلیق کو اس وقت اتنی صدیاں گزر چکی ہیں - کہ اب یہ سمجھنا غلط ہے - کہ انسانیت ابھی طفولیت میں ہے - اور اس کو روحانیت کا ابتدائی سبق دینے کی ضرورت ہے ؛ بلکہ اب معقولیت کے ساتھ اس بات کی توقع کی

Marfat.com

جا سکتی ہے۔ کہ انسانیت اپنے بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ لہٰذا قرآن پاک اس غرض سے نہیں نازل ہوا۔ کہ وہ لوگوں کو نیکی کے ابتدائی سبق پڑھائے۔ بلکہ قدرت اب یہ فرض کر چکی ہے۔ کہ اخلاقی قوانین پر عمل پیرا ہو کر دنیا کے لوگ اب "متقی" ہو چکے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر قدرت کے نزدیک اس وقت ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ "متقی" لوگوں کو اگلا سبق پڑھایا جائے۔ اسی لئے قرآن اپنے آغاز میں ہی هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ[1] کے الفاظ استعمال کرتا ہے! ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے۔ کہ اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے!

اب "متقیوں کے لئے ہدایت" کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ "متقین" تو کہا ہی اُن کو جاتا ہے۔ جو نیک اور پرہیزگار ہوں!

اسلام کی تعلیم کا تمام نچوڑ اس سوال کے صحیح جواب میں مضمر ہے! قرآن کا یہاں مفہوم یہ ہے۔ کہ سینکڑوں اور ہزاروں سال کی ارتقا کے بعد اس دنیا کے لوگ اب ابتدائی دور یا مراحل میں نہیں ہیں۔ کہ فاطر السموٰت والارض کو ہی نہ مانیں۔ اُس کا صحیح تصور ہی نہ کر سکیں۔ یا سچ اور جھوٹ میں ہی تمیز نہ کر سکیں[2]۔ بلکہ قرآن اب یہ توقع رکھتا ہے۔ کہ دنیا کے لوگ اس وقت ارتقا کی ایسی منزل کو پہنچ چکے ہیں۔ کہ وہ آسانی سے خدا کو ایک بھی مان سکتے ہیں۔ اور نیک بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے نزدیک دنیا کے لوگ اس وقت اس سن کو پہنچ چکے ہیں کہ اُن سے یہ توقع کی جائے۔ کہ وہ اب 'از خود' نہ صرف اس پردہ نیلی فام کے پیچھے کسی حسن کو کارفرما سمجھیں (يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ) بلکہ اس حسن کی کچھ "داد" بھی دیں (يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ)۔ اور اپنے آپ کو اُس پر کچھ نچھاور بھی کریں (وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ)! چنانچہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ جب

---

[1] سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲

[2] لیکن اگر ایسا ہے۔ تو اُن کا فرض ہے۔ کہ وہ دنیا کی دوڑ میں اپنے آپ کو پچھاڑی سمجھیں۔ اور کوشش کرکے اپنے آپ کو اگلی صف میں لانے کی کوشش کریں (اسی لئے قرآن میں هُدًى لِّلنَّاس کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں)

لیکن چونکہ قرآن نے بالکل ابتدا میں ہی "الناس" کی بجائے صرف "متقین" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بلکہ "متقین کو بھی" ہدایت دینے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن اپنے مقصد دین کے لحاظ سے "مبتدیوں" کا کورس نہیں، بلکہ کالج کا کورس ہے! گویا یہ عام لوگوں کو محض "عطار" ہی نہیں بناتا، بلکہ "عطاروں" کو "طبیب" بنانا چاہتا ہے!

Marfat.com

اِس قسم کے متقی لوگ اُس کے پاس آئیں گے۔ تو یہ صحیفہ اُنہیں "ہدایت" دے گا۔ یعنی وہ اِن "متقیوں" کو ایک قدم آگے لے جائے گا! اب "ایک قدم آگے" سے کیا مُراد ہے؟ اِس سے مُراد یہ ہے۔ کہ قرآن خدا کے "ماننے" والوں کو خدا تک "پہنچانا" چاہتا ہے۔ تاکہ متقی لوگوں کو "حسن" اپنی تجلیات سے نوازے! (ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)!

چنانچہ اگر ہم دُنیا کو اِس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اسلام کے نزدیک ہر ذی روح انسان کو، زندگی میں، دو منازل طے کرنی ہیں:۔

(الف) خدا کو "ماننا"۔ اور

(ب) خدا تک "پہنچنا"! اسی کو "خدا رسیدگی" یا "معرفتِ الٰہی" کہتے ہیں!

میرے نزدیک اسلام اور دوسرے مذاہب میں صرف فرق ہی یہ ہے۔ کہ دوسرے مذاہب اس وقت زیادہ سے زیادہ (الف) تک محدود ہیں۔ لیکن اسلام کا طرّۂ امتیاز (ب) میں مضمر ہے! (الف) سے انسان صرف "عطار" بنتا ہے۔ اور (ب) سے "طبیب"! گویا (الف) سکول کا کورس ہے۔ اور (ب) کالج کا! اسی لئے حضرت ابنِ عباس جو قرآن کے بہترین مفسّر ہیں۔ وہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں "لِیَعْبُدُوْنِ" دراصل "لِیَعْرِفُوْنِ" کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی ایک انسان کی حیات کا حقیقی مقصد یہ ہے۔ کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرے۔ اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اُنہوں نے وہ حدیثِ قُدسی نقل کی ہے جس کا ذکر ان صفحات میں پہلے بھی آ چکا ہے۔ یعنی

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ٥

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں گنجینۂ مستور تھا۔ میں نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہٰذا میں نے دُنیا بنا دی!)

گویا اس دُنیا کو معرضِ وجود میں لانے کی غرض صرف یہ ہے۔ کہ تمام کائنات خدا کی "معرفت" حاصل کرے: لہٰذا اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ والی آیت کی صرف وہی تفسیر صحیح ہے، جو حضرت ابنِ عباس نے کی ہے: یعنی عبادت سے غرض صرف نماز و روزہ کی پابندی یا محض متقی ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے۔ کہ ہر انسان اپنی زندگی کے اختتام سے پہلے پہلے خدا کی معرفت حاصل کرے! چنانچہ اسی لئے شیخ الاکبر عارف باللہ محی الدین عربی اپنی تفسیر میں یہاں تک فرماتے ہیں۔ کہ:۔

مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ لَمْ يَعْبُدْ

یعنی جس نے خدا کو نہیں پہچانا۔ اُس نے عبادت ہی نہیں کی! (تفسیر محی الدین عربی صفحہ ۱۳۵۔ سطر ۲۰)

Marfat.com

اور جب ایک انسان "معرفتِ الٰہی" حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ پھر نہ صرف "حسن" کی تجلیات سے نوازا جاتا ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس کا ایک نہایت اہم ذیلی انتفاضہ یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے لیے مسخر ہو جاتا ہے[1]! لیکن ہم نے چونکہ محض "اتقا" کو ہی انسان کی معراج سمجھا۔ اور "عرفان" کے رتبہ پر بالکل غور نہ کیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم اسلام کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے ہی قاصر رہے۔ یہاں تک کہ ہم لفظِ "مومن" اور "مسلم" میں بھی تمیز نہ کر سکے! کیونکہ اگر ہم انسانی زندگی کے مندرکرہ بالا دونوں مراحل[2] کو سامنے رکھتے۔ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی تھی۔ کہ جب تک ایک شخص زندگی کے پہلے مرحلہ میں رہتا ہے۔ یعنی خدا کو مانتا ہے۔ تب تو قرآن اُسے عام طور پر لفظِ "مومن" سے یاد کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس مرحلہ سے گزر کر خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر قرآن ایسے باکمال شخص کو "مسلم" کے لفظ سے یاد کرتا ہے! اگلے صفحات میں اسی ایک نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے:۔

اسلام میں لفظِ "مُسلم" کی صحیح تعریف اور اُس کا قرآنی ثبوت

سنہ ۱۹۵۳ء میں تحریک "ختمِ نبوت" کے موقع پر حکومت پاکستان نے جب ایک کمیشن بٹھائی۔ تو اُس کے صدر آنریبل مسٹر جسٹس محمد منیر نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا۔ کہ جو بیانات مسلمانوں نے کمیشن کے سامنے دیے۔ اُن سے لفظِ "مسلم" کی کوئی متفقہ تعریف وضع نہیں کی جا سکی!

حقیقت یہ ہے۔ کہ قرآنِ پاک نے لفظِ "مسلم" کو عام طور پر فرمانبردار اور مطیع کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن جب قرآن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ اس فرمانبرداری اور اطاعت کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ جس معیار تک کہ ہر انسان کو مرنے سے پہلے پہلے پہنچنے کی ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ تو اُس وقت پھر قرآن اُس منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو کہ ایک انسان کی حیات کا حقیقی مقصد ہے!

گویا قرآنِ پاک نے لفظِ "مسلم" کو عام معنوں کے علاوہ ایک خاص معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ جس کا تعلق انسان کے مقصدِ حیات سے ہے:۔

چنانچہ آئندہ صفحات میں پہلے صرف اُنہی قرآنی آیات سے بحث کی گئی ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن جب اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ دُنیا کے لوگ مرنے سے پہلے پہلے خدا کے مطیع ضرور رہوں۔ تو

---

[1] اس نظریے کے دلائل۔ ثبوت اور تفصیل آگے آئے گی:۔

[2] یعنی (الف) خدا کو ماننا اور (ب) خدا تک پہنچنا!

Marfat.com

اُس وقت اُس کا منشا یہ ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے اختتام سے پہلے پہلے "عارف" ضرور ہوں۔ اور قرآن ان "عارفین" کو پھر "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اِس کے ثبوت میں میرے نزدیک قرآن کی ذیل کی آیت بالکل کافی ہے:-

یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سورۃ البقرہ آیت ۱۳۲)

یعنی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے۔ کہ بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک سچا دین چُنا ہے۔ تم اُس دین کی پیروی کرکے مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کی منزل پر ضرور پہنچنا!

یہ ظاہر ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کے فرزندان چونکہ پیغمبر زادے تھے۔ لہذا جب یہ دونوں پیغمبر اپنے بیٹوں کو مندرجہ بالا نصیحت کیا کرتے تھے۔ تو وہ خدا کو تو مانتے ہی تھے۔ اور صالح بھی تھے۔ پھر ان حالات میں اُن کو یہ تاکید کرنا۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کی منزل پر ضرور پہنچیں۔ صرف اِس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ پیغمبر زادے خدا کی اطاعت کرکے "خدا رسیدگی" کی منزل پر ضرور پہنچیں:

جن لوگوں کے علم میں گہرائی نہیں۔ وہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ کے الفاظ کا مطلب یہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ جب اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے تھے تو اُن کا مقصد یہ تھا۔ کہ چونکہ وہ پیغمبر زادے "مسلمان" تھے۔ لہذا وہ اس حالت سے نیچے نہ گریں۔ یعنی "کافر" نہ ہوجائیں۔ اور اگر ایسی صورت رُونما ہو بھی جائے۔ تو وہ موت سے پہلے پہلے پھر "اطاعت شعار مسلمان" ضرور ہو جائیں:

اگر مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کا یہ مطلب لیا جائے۔ تو نصیحت کا تمام مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے:

یہاں جو نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر کچھ لڑکوں کے باپ بالکل غیر تعلیم یافتہ ہوں۔ وہ تو یہی چاہیں گے۔ کہ اُن کے لڑکے کم از کم کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لکھ جائیں: لیکن جو باپ نہ صرف علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرکے حکومت کے اُونچے اُونچے عہدوں پر فائز ہو چکے ہوں۔ وہ یہ ہرگز نصیحت نہیں کر سکتے کہ اُن کے لڑکے (مثال کے طور پر) میٹرک ضرور پاس کر لیں۔ تاکہ وہ مرنے سے پہلے کم از کم ایک کلرک کی حیثیت کو ضرور پہنچ سکیں: بلکہ وہ یہ چاہیں گے۔ کہ اُن کے لڑکے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے مرنے سے پہلے کم از کم افسر ضرور بنیں: اسی طرح جو پیغمبر خود "خدا کی معرفت" حاصل کر چکے تھے۔ اُن کی یہ خواہش ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کہ اُن کے لڑکے موت سے پہلے پہلے محض "اطاعت شعار مسلمان" ضرور ہوں۔ بلکہ اُن کی نصیحت یہ ہوگی۔ کہ اُن کے لڑکے مرنے سے پہلے پہلے مقصدِ حیات والی منزل پر ضرور پہنچیں۔ یعنی وہ "خدا رسیدہ" ضرور ہوں!

لہذا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی نصیحت کا مطلب یہ تھا۔ کہ اُن کے صاحبزادے محض "اطاعت

Marfat.com

شعار مسلمان" ہی نہ رہیں۔ بلکہ مرنے سے پہلے "عارف" ضرور ہوں۔ کیونکہ جس حدیث کا پچھلے اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً الخ) اُس میں مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" بنایا گیا ہے۔ محض "اطاعت شعار مسلمان" ہونا نہیں کہا گیا! چنانچہ آخر کار وہی پیغمبر زادے پھر خود پیغمبر ہوئے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ایک انسان پیغمبر تب ہی ہوتا ہے۔ جب وہ خدا تک رسائی حاصل کر چکتا ہے!

اِن وجوہ کی بنا پر مندرجہ بالا آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک انسانی کمال کے معیار کا تعلق ہے۔ یعنی جس معیار تک کہ قرآن یہ توقع رکھتا ہے کہ لوگ مرنے سے پہلے پہلے ضرور پہنچیں۔ وہ خدا کی معرفت حاصل کرنا یا خدا رسیدگی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ اِس منزل پر پہنچتے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قرآن اُنہیں "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اِسی لئے جب قرآن اُمتِ محمدیہ کو مخاطب کرتا ہے۔ تو پھر بھی وہ (انسان کی رُوحانی ترقی کی مختلف منازل کی نشاندہی کر کے) آخر میں اِس بات پر ہی زور دیتا ہے۔ کہ حضورؐ کے اُمتی بھی مرنے سے پہلے پہلے "عارف" ضرور ہوں۔ اور پھر اس سلسلہ میں وہی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں استعمال کئے گئے ہیں:۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۰۲)

اِس آیت میں رب العزت مومنوں سے خطاب فرماتا ہے۔ کہ اے مومنو! اللہ سے ڈرو۔ اور ایسا ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور پھر تاکید فرماتا ہے۔ کہ مرنے سے پہلے پہلے اِتقا کے اِس اِنتہائی درجہ تک ضرور پہنچنا چاہیئے:۔ اور جو مومنین اِتقا کے اِس درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن اُنہیں پھر "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے:۔ لہٰذا اِس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

(۱) خواہ ایک انسان کے قلب کے اندر ایمان کی حرارت کم ہی ہو۔ (لیکن ہو ضرور)۔ اُس کو "مومن" کہا جاتا ہے:۔ ایسے مومنوں کو رب العزت نے پہلے تو یہ فرمایا۔ کہ وہ اللہ سے ڈریں۔ یعنی متقی بنیں۔ لیکن چونکہ "معمولی ڈرنے" کو "منزل" نہیں سمجھا گیا۔ لہٰذا دوسری تاکید یہ فرمائی۔ کہ

(۲) مومنین خدا سے ایسا ڈریں جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے:۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ "معمولی ڈرنے"

---

[1] اِس ڈرنے میں، خدا تعالیٰ کے تمام احکام کی پیروی، لازمی طور پر شامل ہے!

Marfat.com

کی منزل پر تو سب "متقی" کہلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا سے ایسا ڈرتے ہیں۔ جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ وہ پھر اللہ والے یا عارف ہی ہوتے ہیں! لہٰذا یہی تاکید نہیں فرمائی۔ کہ مومن لوگ۔ اللہ سے ایسا ڈریں۔ جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ بلکہ زور اِس پر دیا گیا۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے اس منزل پر ضرور پہنچیں! اور پھر

(۳) اِس قسم کے لوگوں کو "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کیا ؛ گویا یہ لازمی قرار دیا گیا۔ کہ ہر "مومن" مرنے سے پہلے "مسلم" کی منزل (یعنی حَقَّ تُقٰتِہٖ گویا انتہائی اِتقا۔ یا بالفاظِ دیگر "خدارسیدگی" کی منزل) پر ضرور پہنچے!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک "خدارسیدگی" کی بابت قرآن کی مختلف آیات سے استدلال ہی کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہاں لکھا ہے۔ کہ اِس دُنیا میں اِنسان واقعی خدا کو پا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ[1] پر غور کرنے کی ضرورت ہے ؛ سوال صرف یہ ہے۔ کہ ہم بار بار یہ کیوں کہتے ہیں۔ کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ یا سیدھے راستہ پر چلا؟ اِس سوال کے صحیح جواب میں ہی "خدارسیدگی" کے معمّے کا حل ہے! چنانچہ اِس معمّہ کی پردہ کُشائی قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے :۔

إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (سورۃ ۱۱ ہود۔ آیت ۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ، حضرت ہودؑ کے دہن مُبارک سے یہ کلمات کہلواتا ہے۔ کہ "میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے"! اِسی لئے ہم بار بار یہ دُعا مانگتے ہیں

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۵

تاکہ انسانیت "صراطِ مستقیم" پر پہنچ کر اپنے رب کو پالے[2]!

---

[1] ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کر (سورۃ الفاتحہ۔ آیت ۵)

[2] چنانچہ اِسی لئے قرآن میں حضورؐ کی شان میں ارشاد ہوتا ہے :۔

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۙ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۗ (سورۃ ۳۶ یٰسین۔ آیات ۳-۴)

(تحقیق آپ رسولوں میں سے ہیں۔ اور سیدھے راستہ پر ہیں)

تاکہ دُنیا کو معلوم ہو جائے۔ کہ جس طرح تمام پیغمبران علیہم السلام "صراطِ مستقیم" پر تھے۔ اِس طرح حضورؐ بھی "صراطِ مستقیم" پر ہیں۔ یعنی اپنے خدا کو پا چکے ہیں ؛ اور اِسی لئے حضورؐ کی سُنّت "خدا کو پانے کے لئے لازمی قرار پائی۔ تاکہ یہ سعادت اب سب کو حاصل ہو سکے ؛ گویا ہر "مومن" مرنے سے پہلے سُنّت پر عمل پیرا ہو کر "مسلم" کی منزل (یعنی انتہائی اِتقا یا بالفاظِ دیگر "خدارسیدگی" کی منزل) پر ضرور پہنچ سکے!

اور جو خوش قسمت لوگ سیدھے راستہ پر چل کر اپنے رب کو پا لیتے ہیں۔ قرآن بھر ایسے باکمال لوگوں کو "مسلمین" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اس نظریئے کی تائید مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی ہوتی ہے :۔

حضرت ابراہیم کے پاس چند فرشتے آئے :۔ آپ نے جب اُن سے اُن کی آمد کی وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے کہا :۔

اِنَّآ اُرۡسِلۡنَآ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ (سورۃ ۵۱ الذاریت - آیت ۳۲)

یعنی ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ ہم اُن کو پتھراؤ کریں :۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بات سُن کر ذرا گھبرائے۔ چونکہ جس قوم کی طرف وہ فرشتے عذاب کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہ حضرت لُوطؑ کی قوم تھی۔ اور حضرت لُوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے عزیزوں میں سے تھے :۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ تو فرشتوں نے اُن کو یقین دلایا۔ کہ مومنین عذاب سے ضرور محفوظ رہیں گے! مومنین کے عذاب سے بچنے کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ کَانَ فِیۡهَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡهَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۝[1]

یعنی جن لوگوں کو عذاب ہوا۔ اُن میں سے ہم نے مومنوں کو بچا لیا۔ اور جو لوگ عذاب سے بچ گئے تھے۔ اُن میں "مسلمین" کا صرف ایک ہی گھر نکلا!

گذشتہ تین آیتوں سے یہ باتیں ثابت ہوتی ہیں :۔

(۱) جن لوگوں پر عذاب ہوا۔ قرآن نے اُن کے لئے "مجرمین" کا لفظ استعمال کیا ہے :۔

(۲) جو لوگ مجرم نہیں تھے۔ اُن کے لئے قرآن نے "مومنین" کا لفظ استعمال کیا ہے :۔ اور

(۳) قرآن کہتا ہے۔ کہ ان مومنین میں صرف ایک گھر "مسلمین" کا تھا! جو بظاہر حضرت لُوطؑ اور اُن کے خاندان والوں کا تھا!

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ حضرت لوطؑ چونکہ پیغمبر تھے۔ لہٰذا وہ تو "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ضرور ہی تھے۔ لیکن چونکہ قرآن نے بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُس گھر میں نہ صرف حضرت لُوطؑ "خدا رسیدہ" تھے۔ بلکہ اُن کے خاندان کے کچھ اور لوگ[2] بھی "خدا رسیدہ" تھے۔ اسی لئے قرآن نے اس سلسلہ میں "مسلمین" (جمع) کا لفظ استعمال کیا ہے!

---

[1] سورۃ ۵۱ الذاریت - آیات ۳۵ - ۳۶

[2] یہ حضرت لوطؑ کی لڑکیاں تھیں۔ (ورنہ اُن کی بیوی تو مجرمہ تھی!)

Marfat.com

گویا یہاں یہ بات یقینی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ کہ جو لوگ "خدا رسیدگی" کی منزل کو پہنچ چکتے ہیں۔ قرآن اُنہیں پھر "مسلمون" اور "مسلمین" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے!

بالکل اِسی وجہ سے قرآن نے رسول پاکؐ کے متعلق یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:-

أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۱﴾ (سورۃ ۲۷ النمل۔ آیت ۹۱)

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں "مسلمین" کے گروہ کا ایک فرد بن کر دکھاؤں: یہی نہیں۔ بلکہ:

أُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ (سورۃ ۳۹ الزمر۔ آیت ۱۲):

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں تمام "مسلمین" میں اوّل نمبر پر ہو کر دکھاؤں!

اِس تشریح سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن جب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ انسانی ارتقا کے کمال کا معیار کیا ہے؟ تو اُس وقت وہ "مسلم" کے لفظ کو "عارف" "ولی" یا "خدا رسیدہ" کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اور مندرجہ بالا متعلقہ آیات اس نظریئے کی صریح طور پر تائید کرتی ہیں:

لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان پہلے تو "مومن" ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ سنّت کی صحیح معنوں میں پیروی کرے تو وہ "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ہو سکتا ہے!

گویا اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر انسان پہلے "مومن" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مسلم"!

لیکن اس نظریئے کے برعکس عام طور پر مشہور یہ ہے۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے اور بعد میں "مومن"۔ اور اس کے ثبوت میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پیش کی جاتی ہے:-

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ

(سورۃ ۴۹ الحجرات۔ آیت ۱۴)

(یعنی یہ گنوار کہتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرما دیجیے۔ کہ تم ایمان تو نہیں لائے۔ لیکن یوں کہو۔ کہ ہم مخالفت چھوڑ کر مطیع ہو گئے ہیں۔ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔)

اس آیت کا عام طور پر ہم نے مفہوم یہ لیا۔ کہ چونکہ جن کے دل میں ابھی ایمان کی حرارت نہیں۔ اُن کو "مومن" نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا "اَسْلَمْنَا" کی رعایت سے اُن کو "مسلم" کہہ لینا چاہیئے۔ اور اس سے پھر نتیجہ یہ نکالا۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مومن"!

یہاں ہم نے "اَسْلَمْنَا" کی ترکیب سے دھوکا کھایا: اِس آیت میں "اَسْلَمْ" کا لفظ فعل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا "اَسْلَمْنَا" کا مطلب یہ ہے۔ کہ "ہم اسلام لے آئے"۔ یہ نہیں۔ کہ "ہم مسلم ہو گئے"۔

Marfat.com

قرآن کا یہاں مفہوم یہ ہے۔ کہ جب ایک انسان "اسلام لے آتا ہے"۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ وہ مسلم ہو گیا ہے"۔ بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ "اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیا ہے"۔ کیونکہ جیسا کہ پہلی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ (انسانی کمال کی رُو سے) قرآن "مسلم" کے لفظ کو "ولی" یا "خدا رسیدہ" کے معنی میں استعمال کرتا ہے: چنانچہ مندرجہ بالا "الاعراب" والی آیت میں جب اس بات کا ذکر آتا ہے۔ کہ چند گنوار "اسلام لے آئے"۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ "اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے"۔ یعنی وہ خدا اور اُس کے رسولؐ پر زبان سے ایمان لے آئے۔ اور نتیجہ کے طور پر اُنہوں نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ نماز پڑھنی شروع کر دی۔ وغیرہ وغیرہ: لیکن ایسی حالت میں بھی قرآن کہتا ہے۔ کہ ایسے لوگ ابھی محض "اسلام ہی لائے ہیں"۔ یعنی بالفاظِ دیگر یہ ابھی ("مسلم" تو کجا) "مومن" کہلانے کے بھی حقدار نہیں۔ کیونکہ "مومن" کہلانے کے وہ اس وقت حقدار ہوں گے۔ جب اُن کے دلوں میں کم از کم ایک خاص حد تک ایمان راسخ ہو جائے گا۔

گویا انسانی کمال کے لحاظ سے قرآن "مسلم" کا لفظ تو اُس وقت استعمال کرتا ہے۔ جب ایک انسان "خدا رسیدہ" ہو جائے! لیکن جب تک وہ اِس منزل کو نہیں پہنچتا۔ تب تک قرآن اُسے عام طور پر "مومن" کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک انسان اسلام تو لے آئے۔ لیکن اُس کے دل میں ایک خاص حد تک ابھی ایمان راسخ نہ ہوا ہو۔ تو پھر ایسی صورت میں اسلام اُسے "مومن" کہنے کو بھی تیار نہیں!

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی بچہ "کچی پہلی" جماعت میں داخل ہو۔ تو باوجود اس بات کے کہ وہ روز سکول جاتا ہے۔ ہم اُسے "طالبعلم" کہنا شروع نہیں کر دیتے۔ بلکہ اُس کو "طالبعلم" ہم تب سے ہی کہنا شروع کرتے ہیں۔ جب وہ تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھنا شروع کر دیتا ہے:

قرآن نے بھی بالکل یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ ایک انسان کو "مومن" کا خطاب تب ہی دیتا ہے جب اُس کے دل میں ایمان ایک خاص حد تک راسخ ہو جائے۔ خواہ وہ اسلام لا ہی چکا ہو:

اب یہ سوال کہ جب ایک شخص "اسلام لے آئے"۔ تو اُسے "مسلم" کیوں نہیں کہا جا سکتا؟ اس کا جواب مندرجہ ذیل دو مثالوں سے واضح ہو جائے گا:۔

(۱) فرض کیجئے۔ کہ ایک شخص ایک ماہ کے لئے پشاور میں قیام پذیر ہوتا ہے: اُس کے اِس تھوڑی سی مدت کے قیام کے باعث اُس کو "پشاوری" نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ اِس حق کے حصول کے لئے ایک خاص مدت مقرر ہے۔ یعنی جب تک ایک انسان ایک شہر میں ایک خاص عرصہ کے لئے نہ رہے۔ اُس کو اُس کی شہریت کے حقوق نہیں مل سکتے!

Marfat.com

(۲) فرض کر لیجئے۔ کہ ایک شخص علیگڑھ کا باشندہ ہے۔ پھر بھی ہم اُس کو "علیگ" نہیں کہیں گے۔ کیونکہ ایک شخص کو "علیگ" ہم صرف اُس صورت میں کہتے ہیں۔ جب وہ علیگڑھ کالج میں داخل ہو۔ اور وہاں ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ ڈگری حاصل کرے!

پس جس طرح ہم ایک شخص کو "پشاور" میں تھوڑی سی مدت کے قیام کے باعث "پشاوری" نہیں کہہ سکتے۔ یا جس طرح ہم ایک شخص کو "علیگ" نہیں کہہ سکتے۔ جب تک کہ وہ علیگڑھ کالج میں کچھ سال تعلیم حاصل کر کے ڈگری نہ لے۔ بالکل اُسی طرح قرآن، ایک شخص کو محض اسلام لے آنے سے "مسلم" کا خطاب نہیں دیتا!

لہذا قرآن نے "مسلم" کہلوانے کے لئے مندرجہ ذیل منازل کو عبور کرنا ضروری قرار دیا ہے:۔

(۱) اگر ایک شخص ابھی اسلام نہیں لایا۔ تو وہ اسلام لائے :۔ (گویا پہلے وہ "کچی پہلی" میں داخل ہو):۔

(۲) اُس کے دل میں ایک خاص حد تک ایمان راسخ ہو۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو "مومن" کہلا سکے :۔

(۳) اُس کے دل میں خدا کا خوف بھی ہو۔ تاکہ وہ متقی کہلا سکے :۔

(۴) پھر یہ خوف بھی معمولی حد تک نہ ہو۔ بلکہ وہ آہستہ آہستہ خدا سے ایسا ڈرے۔ جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کا اتقا صرف اہل اللہ میں ہی ہوتا ہے، جو کامل ہوتے ہیں۔ اور عارف، ولی، یا "خدارسیدہ" کہلاتے ہیں! اور اِس قسم کے لوگوں کو پھر قرآن "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے :۔

غرض ایک انسان جب تک یہ چار منازل طے نہیں کرتا۔ انسانی کمال کے لحاظ سے قرآن اُسے "مسلم" کا خطاب نہیں دیتا!

یہاں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ مقصدِ حیات کی یہ معراج لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں سے صرف چند کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر "مومن" کو یہ تاکید کی گئی ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے "مسلم" (یعنی "خدارسیدگی") کی منزل پر ضرور پہنچے!

اب اس سے آپ اندازہ لگائیں۔ کہ اسلام نے انسانیت کے لئے، مقصدِ حیات کی جو معراج مقرر کی ہے۔ وہ کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور انسانیت اِس وقت ہے کس مقام پر؟

یہی نہیں۔ بلکہ جو قوم اپنے آپ کو قرآن کی حامل کہتی ہے۔ وہ کس مقام پر ہے؟

اس تمام بحث کو اب ایک جدول (دیکھو صفحہ ۴۹) کی صورت میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسے نیچے سے اُوپر کی طرف پڑھیں۔ یعنی نمبر ۱ سے ۵ کی طرف آئیں :۔

Marfat.com

نمبر شمار	نام	درجہ	کیفیت	قرآنی ثبوت
۵	مسلم	الف	درجہ ب کے اوپر وہ متقی آتے ہیں جو خدا سے ایسا ڈرتے ہیں جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے یعنی وہ کامل عارف یا خدا رسیدہ جن کو اسلام "مسلمون" یا "اولیاء" کے لفظ سے یاد کرتا ہے!	یہاں قرآن نہ صرف درجہ ب کے لوگوں کو درجہ ا پر آنے کی تلقین یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ کے الفاظ سے کرتا ہے۔ بلکہ تاکید کرتا ہے۔ کہ وہ مریں نہیں جب تک کہ وہ اس درجہ پر نہ پہنچیں۔ اور اس مقصد کیلئے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کے الفاظ استعمال کرتا ہے!
۴	متقی	ب	درجہ ج کے اوپر "متقی" آتے ہیں۔ یعنی وہ جن کے دل میں ایمان کی حرارت بھی ہے۔ اور خدا کا خوف بھی۔	قرآن درجہ ج کے لوگوں کو درجہ ب پر آنے کی تلقین ان الفاظ میں کرتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ
۳	مومن	ج	درجہ د کے اوپر "مومن" آتے ہیں جنکے قلب کے اندر ایک خاص حد تک ایمان کی حرارت موجود ہوتی ہے؛	ان کو قرآن یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا کے الفاظ سے خطاب کرتا ہے؛
۲	"کچی پہلی" جماعت کے لوگ	د	درجہ س کے اوپر "کچی پہلی" جماعت کے لوگ آتے ہیں۔ یعنی وہ جو باوجود اس بات کے کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ لیکن اُن کے دلوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوا؛	ان کیلئے قرآن قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی ایسے لوگ یہ نہ کہیں۔ کہ وہ "ایمان لے آئے ہیں"۔ بلکہ یہ کہیں کہ وہ "اسلام لے آئے ہیں"؛
۱	کافر	س	درجہ کے لحاظ سے "کافر" سب سے نیچے آتے ہیں جو یا تو خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر برائے نام مانیں بھی تو (اپنے غرور کی وجہ سے) اُس کی نافرمانبرداری کرتے ہیں؛	اسی لئے کفار کے "باوا آدم" کو قرآن ان الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ[1] (سورۃ البقرۃ ۲ آیت ۳۴)

مندرجہ بالا جدول کو سامنے رکھ کر اب آپ اس بات پر غور کریں۔ کہ ہم نے "الاعراب" والی آیت میں قرآن کے

---

[1] نافرمانی کرکے غرور کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

Marfat.com

الفاظ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا سے استدلال یہ کیا۔ کہ چونکہ جب ایک شخص اسلام لے آئے تو اُس کے دل میں فوراً ایمان نہیں پیدا ہو جاتا۔ اور چونکہ قرآن ایسے شخص کو مومن کہنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کو "اسلمنا" کی رعایت سے "مسلم" کہ لینا چاہیئے :۔ بالفاظِ دیگر "مسلم" سے مراد ایسا شخص لیا گیا۔ جس میں (اوپر کے جدول کے مطابق) ایمان کی حرارت موجود نہ ہو! گویا درجہ "د" (یعنی کچی پہلی جماعت کے لوگ)!

اور پھر اس غلط مفہوم سے نتیجہ یہ نکالا۔ کہ اسلام میں "مومن" کا درجہ اوپر ہے۔ اور "مسلم" کا نیچے! اور یہ بالکل نہ سوچا۔ کہ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ والی (دوسری) آیت[1] میں خدا تعالیٰ نے "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کے درجہ پر ضرور پہنچیں :۔ یہ لامحالہ صرف اُسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں۔ کہ "مومن" کا درجہ نیچے ہے۔ (یعنی درجہ "ج") :۔ اور "مسلم" کا درجہ اوپر ہے۔ (یعنی درجہ الف) :۔

اسی لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو یہ تاکید کی۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" (یعنی "خدا رسیدگی") کے درجہ کو ضرور پہنچیں!

اور بالکل اسی لئے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا۔ کہ وہ "مسلمین" کے گروہ میں اول نمبر ہو کر دکھائیں :۔

اب اگر مندرجہ بالا تمام آیات میں "مسلمین" کے گروہ سے "خدا رسیدہ" ہستیوں کا گروہ مراد نہ لیا جائے اور ہم "مسلم" کو "مومن" سے نچلا درجہ دیں۔ تو پھر اس بات کے سوا چارہ ہی نہیں دیتا۔ کہ ہم "مسلم" سے مراد "کچی پہلی" جماعت (یعنی درجہ "د") کے لوگ لیں! ایسی صورت میں پھر اُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ[2] والی آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پھر اس آیت کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ رسولِ پاکؐ کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ وہ "کچی پہلی" جماعت والے لوگوں میں اوّل نمبر ہو کر دکھائیں :۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کا مفہوم بالکل لغو ہے!

اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ کہ جب ہم نے "الاعراب" والی آیت سے یہ استدلال کیا۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مومن" تو اُس وقت :۔

(۱) ہم نے اس بات کا لحاظ ہی نہیں کیا۔ کہ ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے "مومن" پیدا ہوتا ہے۔ "مسلم" نہیں۔ لہٰذا ایک انسان پہلے "مسلم" اور بعد میں "مومن" کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور

---

[1] سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۰۲ :۔

[2] سورۃ ۳۹ الزمر آیت ۱۲ :۔

(۲) ہم نے اِس بات کو بھی ذہن میں نہ رکھا۔ کہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ والی دوسری آیت[1] میں قرآن نے "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کے درجہ پر ضرور پہنچیں ؛ اگر ایک انسان پہلے "مسلم" ہوتا۔ اور بعد میں "مومن"۔ تو قرآن اس آیت میں "مسلمین" سے خطاب کرتا "مومنین" سے نہ کرتا ؛ لیکن چونکہ قرآن نے اس آیت میں "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان پہلے "مومن" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مسلم"! گویا "مسلم" کا درجہ اوپر ہے۔ اور "مومن" کا نیچے!

اِس سلسلہ میں ہم سے جو دوسری چوک ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اِس نکتہ کو نظر انداز کر دیا۔ کہ انسان کے حقیقی مقصدِ حیات کی ہمارے پاس جو سند موجود ہے۔ وہ صرف فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ والی حدیث قدسی ہی ہے ؛ لہذا قرآن جب اس بات کی تاکید کرتا ہے۔ کہ انسان مرنے سے پہلے پہلے کسی خاص منزل پر ضرور پہنچے۔ تو وہ (مندرجہ بالا حدیث کی رُو سے) صرف "عرفان" کی منزل ہی ہو سکتی ہے۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی!

اِس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآنی آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں لِيَعْبُدُوْنِ کے معنی لِيَعْرِفُوْنِ ہی کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں کئے جا سکتے!

اِس سے یہ بھی ثابت ہو گیا۔ کہ ہم نے "الاعراب" والی آیت میں "اَسْلَمْنَا" کے لفظ سے غلط استدلال کر کے لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ والی دونو آیات کا حقیقی مقصد ہی فوت کر دیا۔ یعنی یہ کہ ہر "مومن" مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" یعنی "عارف" ضرور ہو!

اب جب کہ اِس سلسلہ میں سب شبہات پوری طرح رفع ہو گئے ہیں۔ ہم اب آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ انسان جب "خدا کی معرفت" حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ گویا خدا کو "ڈھونڈ" لیتا ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ دنیا دراصل ایک "آنکھ مچولی" کا کھیل[2] ہے۔ یعنی "حسن" یہاں چھپا ہوا ہے۔ اور

---

[1] سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۰۲

[2] یہاں "کھیل" کا لفظ قرآنی الفاظ لَهْوٌ وَّلَعِبٌ کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے ؛ (دیکھو سورۃ ۲۹ العنکبوت۔ آیت ۶۴) ؛

Marfat.com

ایک انسان اِس دُنیا میں صرف اِس غرض کے لئے آیا ہے۔ کہ وہ اس "مخفی حسن" کو ڈھونڈ لے!

"مسلم" "مومن" اور "کافر" میں فرق

لہٰذا اس دنیا وی زندگی میں:۔

(۱) جو لوگ "حسن" کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح میں "مسلم" کہلاتے ہیں!

(۲) جو اس راہ پر ابھی گامزن ہیں۔ لیکن منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے۔ وہ عام طور پر "مومن" کہلاتے ہیں! اور

(۳) جو "حسن" کو مانتے ہی نہیں۔ وہ "کافر" کہلاتے ہیں!

مُسلمانوں کے تنزّل کی وجوہات کا تجزیہ!

اب یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے۔ کہ ہر "مومن" مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ضرور ہو۔ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آج تک اگر خدا رسیدہ ہستیوں کی گنتی کی جائے تو وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہو گی: لہٰذا اس لحاظ سے آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا!

لیکن اس معمّہ کو حل کرنے کے لئے پہلے یہ لازمی ہے۔ کہ ہم دنیا کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ تاکہ اُس کے صعُود و ہبُوط کا فلسفہ صاف طور پر ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جائے:

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ جاننا لازمی ہے۔ کہ (جس طرح اشارةً اوپر کہا گیا ہے) یہ دنیا دراصل ایک کھیل ہے۔ اور یہ کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔ لہٰذا جب تک یہ کھیل ختم نہ ہو۔ یہ کہنا کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ قبل از وقت ہے:

دوسرے یہ سمجھنا لازمی ہے۔ کہ اِس دنیا میں صعُود و ہبُوط کا جو لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اُس کے فلسفہ کے صحیح اِدراک کے لئے ذرا عمیق نظر کی ضرورت ہے: لہٰذا اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل میں جانا ہو گا:

آسانی کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ اِس دنیا کے "آنکھ مچولی" والے کھیل میں سب انسان ایک کرکٹ (cricket) کے کھلاڑی کی حیثیت بھی رکھتے ہیں: انسانوں کا "رقیب" ہم سب کی طرف فرداً فرداً ہر وقت گیند پھینکتا رہتا ہے۔ اور ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ ہم سب ہِٹ (hit) لگانے اور رنز (runs) بنانے کی کوشش کرتے رہیں: لیکن "رقیب" کی ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ

Marfat.com

ہم ہر گیند پر آؤٹ (out) ہی ہوتے جائیں!

مثلاً جب کسی مرد کے سامنے کوئی عورت آئے تو "رقیب" یہی چاہتا ہے۔ کہ مرد اُس کے حُسن کا نہایت اچھی طرح مشاہدہ کرے! اب اگر اُس مرد نے عورت کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر تو گویا جو گیند "رقیب" نے اُس کی طرف پھینکی تھی۔ اُس پر اُس نے ایک بونڈری (boundary) لگا دی! لیکن اگر وہ عورت کے حُسن و جمال کو دیکھنے لگا۔ تو پھر جو گیند اُس کی طرف پھینکی گئی تھی۔ وہ عین وکٹوں (wickets) میں جا کر لگی!

بالکل اِسی طرح اگر کسی نے ہم سے کوئی بات پوچھی۔ اور ہم نے جواب میں سچ بولا۔ پھر تو ہم نے ایک رن (run) بنائی۔ لیکن اگر جھوٹ بولا۔ تو آؤٹ (out) ہو گئے!

اِس لحاظ سے ہم ہر لحظہ یا تو ایک پوائنٹ (point) جیتتے ہیں۔ یا ہارتے ہیں: اب آخر کار اگر ہمارا اسکور (score) سو میں سے اکاون رہا۔ پھر تو ہم جیت جائیں گے! لیکن اگر انچاس رہا۔ تو ہار جائیں گے!

چنانچہ اس تمام کشمکش میں انسانیت کے "رقیب" کی کوشش یہی ہوتی ہے۔ کہ ہم تمام پوائنٹ (points) ہار جائیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک سلیم الفطرت انسان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام پوائنٹ (point) جیتے!

غرض "رقیب" کی تمام کوشش صرف ایک نقطہ پر مرکوز رہتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان نہ صرف خدا کی طرف رجوع ہی نہ کرے۔ بلکہ اُس کا رجحان بُرائی کی طرف ہو: اور ایک انسان کی مردانگی اس میں ہے۔ کہ وہ نہ صرف خدا کی معرفت کی جستجو میں رہے۔ بلکہ اس مقصد سے ایک لحظہ بھی غافل نہ ہو!

یہاں پر بدی کی تخلیق کا فلسفہ بھی حل ہو جاتا ہے!

بدی اس لئے تخلیق نہیں کی گئی۔ کہ لوگ بدکردار ہوں۔ بلکہ دنیا کے "کھیل" میں بدی جان بوجھ کر رکھی گئی ہے۔ تاکہ لوگوں کا امتحان لیا جا سکے۔ کہ کون کس خوش اسلوبی سے بدی پر قابو پاتا ہے۔ اور پھر کس پیمانہ کا نیکی کا علمبردار بنتا ہے؟

اِس لحاظ سے بدی کی مثال ایک "دشوار گزار دوڑ" (Obstacle Race) کی سی ہے: اس قسم کی دوڑ میں مختلف قسم کی رکاوٹیں اس لئے نہیں رکھی جاتیں۔ کہ لوگ گریں اور چوٹیں کھائیں۔ بلکہ وہ اس لئے رکھی جاتی ہیں۔ کہ لوگوں کا امتحان لیا جا سکے۔ کہ کون کس نمبر پر کامیاب ہوتا ہے؟

اب جس طرح ایک اچھے کرکٹ کے کھلاڑی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ گیند کے متعلق یہ شکایت کرے کہ وہ بہت سخت ہے۔ اور اس سے چوٹ لگنے کا ڈر ہے۔ بالکل اُسی طرح ایک انسان کی مردانگی اس میں ہے۔ کہ وہ (حالات خواہ کسی قسم کے ہوں) میدان چھوڑ کر نہ بھاگے!

Marfat.com

اب چونکہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ سب مشیت ایزدی کے ساتھ ہی ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ میں جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے۔ اُس وقت الناہبّت کا "رقیب" رب العزت کی درگاہ میں حاضر ہو کر اپنا "منصوبہ" پیش کرتا رہا ہے کہ وہ فلاں نبی کی اس قسم کی روش پر اپنا اس اس قسم کا دام بچھانا چاہتا ہے۔ اُس کی منظوری دی جائے!

مثلاً حضرت نوحؑ کے وقت "رقیب" نے کہا۔ کہ وہ بیشک ساڑھے نَو سو سال تبلیغ حق کرتے رہیں۔ لیکن ۲۰ سے زیادہ انسان ایمان نہ لائیں! "حسن" نے کہا۔ منظور! لیکن جن لوگوں نے ہمارے پیغمبر کی بات نہ سُنی۔ وہ غرق کر دئے جائیں گے! "رقیب" نے کہا، مجھے بھی منظور!

(یہاں اس "رقیب" کی عداوت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اُس نے حضرت نوحؑ کی ساڑھے نَو سو سالہ محنت اکارت کروا دی۔ اور دوسری طرف جس قوم کو اُس نے حضرت نوحؑ سے ورغلایا تھا۔ اُس تمام قوم کو غرق کروا دیا! اسی لئے قرآن نے اُسے "عدو" "مبین" کہکر پکارا ہے۔ تاکہ ذی فہم لوگ یہ سمجھ سکیں کہ اس سے ہمیں کس قدر بچ کر رہنا ہے۔ کیونکہ یہ کبھی آگے سے آتا ہے۔ کبھی پیچھے سے: کبھی دائیں جانب سے آتا ہے۔ اور کبھی بائیں سے)!

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے وقت "رقیب" نے کہا۔ کہ مَیں نمرود کو ایسا سبق پڑھاؤں گا۔ کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو حق کی دعوت دینے پر آگ میں پھینک دے! "حسن" نے کہا۔ تمہاری درخواست منظور۔ لیکن ہم حضرت ابراہیمؑ کے لئے وہ آگ گلزار بنا دیں گے!

غرض حضرت عیسیٰؑ کے وقت "رقیب" کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کوڑھیوں کو اچھا کریں گے۔ مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں گے۔ یہاں تک کہ مُردوں کو زندہ کریں گے۔ تو "رقیب" نے کہا میں ایسے پیغمبر کو سُولی پر چڑھوانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں! "حسن" نے کہا۔ ہم اُس کو آسمان پر چڑھا لیں گے۔ لیکن تمہاری "کوشش" والی درخواست منظور!

آخر رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی "رقیب" نے جب یہ دیکھا۔ کہ قدرت کا اصلی منشا یہ ہے کہ یہ خاک کا پُتلا کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" کرے۔ اور اُس کے ثبوت میں اُس نے یہ دیکھا کہ اتنی بڑی محیر العقول دنیا کو انسانؐ اب بازیچۂ اطفال بنا رہا ہے۔ مثلاً چاند جیسی چیز کو یونہی انگلیوں کے اشاروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ یا سورج کو آگے پیچھے کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی انسانؐ نے ایک ایسی جماعت بھی تیار کر لی ہے۔ جس کے سب افراد "درخشندہ ستارے" ہیں۔ تو گھبرا گیا۔ اور ربّ العزت کی درگاہ میں حاضر ہو کر درخواست کی:

"حضور! ابھی دنیا نے اپنی مہلت کی چند صدیاں اور گزارنی ہیں: میں اپنے تمام ہتھکنڈے کر چکا۔

اُور داد بھی پا چکا:۔ مثلاً جب میں نے کسی جیب کترنے والے کو "ہاتھ کی صفائی" سکھائی تو سب نے واہ واہ کی۔ کہ صاحب کیا کمال کیا! لوگوں کی بھیڑ میں اُس نے دس جیبیں کاٹیں لیکن کسی کو پتہ نہ چلا۔ کہ جیب کا مال کب غائب ہوا؟ کس طرح غائب ہوا؟ اور کس نے غائب کیا؟ اسی طرح عورتوں کو اغوا کرایا۔ تو ایسی صفائی سے۔ کہ محلہ بھر کے لوگ سوئے رہے۔ لیکن اغوا کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی!

"لیکن باوجود میری سب کوششوں کے دنیا نے آخر ذی فہم ہونا ہے۔ چنانچہ مجھے معلوم ہے کہ زود یا بدیر، لوگ جیب کتروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس اغوا کرنے والوں کو بھی حقارت سے ہی دیکھا جائے گا۔ لہٰذا ان ہتھکنڈوں سے اب میں کچھ آپ ہی تنگ آ گیا ہوں:۔ مشرق کے لئے تو خیر یہ باتیں ابھی کچھ اور دیر کے لئے مناسب ہیں۔ لیکن مغرب کے لئے میرا پروگرام کچھ اور ہے! میں وہاں ایک ایسی "صنّاعی" کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہوں۔ جو ہو گی تو "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری"۔ لیکن نظر کو ایک دفعہ تو "خیرہ" کر دے گی!"[1]

اس سے "رقیب" کی مراد "مشین کے زمانہ" کی بنیاد رکھنی تھی! لیکن چونکہ اُسے یہ معلوم تھا۔ کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی "رُوحانی تسخیر" کے سامنے "مادی تسخیر" مضحکہ انگیز معلوم ہو گی۔ لہٰذا اُس نے ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دی:۔

"حضور! میری صنّاعی تو صرف اُس صورت میں ہی چل سکتی ہے۔ کہ آپ اپنے لوگوں کو جو اس دنیا کو (چاند کے ٹکڑے کر کے۔ یہاں تک کہ سورج کو آگے پیچھے کر کے) بازیچۂ اطفال بنا رہے ہیں۔ اُن کو ذرا پس پردہ کر دیجئے[2]! اور پس پردہ بھی اس اہتمام سے کیجئے۔ کہ دوم تسخیر

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے! (اقبال)

[2] اس درخواست کی تہ میں یہ بات تھی۔ کہ چونکہ دنیا کی "رُوحانی تسخیر" کے سامنے "مادی تسخیر" کی دال ایک لحظہ کے لئے بھی نہیں گل سکتی تھی۔ لہٰذا "رقیب" کے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا تھا۔ اور وہ یہ کہ (جیسا اوپر کہا گیا ہے) جو ہستیاں اس دنیا کو (چاند کے ٹکڑے کر کے۔ یہاں تک کہ سورج کو آگے پیچھے کر کے) بازیچۂ اطفال بنا رہی تھیں۔ وہ میدان میں نہ رہیں۔ بلکہ کسی صورت میں پس پردہ ہو جائیں۔ تاکہ "رقیب" کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ اور وہ بھی آزادی سے "طبع آزمائی" کر سکے! چنانچہ "رقیب" کی سر توڑ کوشش یہ تھی۔ کہ "خلافتِ راشدہ" کی بجائے دنیا میں کسی طرح "ملوکیت" قائم ہو جائے۔ تاکہ پھر وہ دنیا میں "رُوحانی تسخیر" کی بجائے "مادی تسخیر" کی داغ بیل ڈال سکے۔ چنانچہ آخر کار یہی ہو کر رہا!

Marfat.com

آپ جیتیں۔ تو چار مرتبہ میں! یعنی وہ شمع جس نے چالیس برس تک غاروں میں اُجالا کیا ہے اُس ﷺ کی تو میں جان بخشی کرتا ہوں۔ کہ اُس کا وصال تو طبعی طریقہ سے ہی ہو۔ اور اُس شمع کا پہلا پروانہ، یعنی وہ صدیق جس کے لیئے "خداؐ رسول بس" ہے۔ اور جس کی رُوح ہر وقت "تشنہٴ مضراب" رہتی ہے۔ میں اُس کو بھی نہیں "چھیڑتا" لیکن دوسرا پروانہ جو گھر سے تو شمع کو بُجھانے کے لیئے نکلا تھا۔ لیکن اپنے گھر کے چراغ سے ہی اپنے آپ کو آگ لگا بیٹھا۔ اُس کو نہیں چھوڑا جا سکتا! اسی طرح باقی دو پروانے بھی میری گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ سب اپنے اپنے خون میں غسل کریں! یہی نہیں۔ بلکہ جس ذات کے ساتھ آپ کو سب سے زیادہ پیار ہے۔ اُس کا جگر گوشہ بھی خون میں تڑپے۔ یہاں تک کہ تپتی دھوپ میں اُس کو پانی کا ایک قطرہ نصیب نہ ہو!"

چنانچہ ایسا ہی ہوا! یعنی وہ لوگ جو اپنی "رُوحانی تسخیر" کی بدولت اس دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا رہے تھے۔ اُن کو "پس پردہ" یُوں کیا گیا۔ کہ سب "درخشندہ ستارے" جو اُس وقت کی "محفلِ ہستی" کی رونق تھے۔ آن کی آن میں "رونقِ محفل" نہ رہے! اور آج تک دنیا اس راز کو نہ سمجھ سکی۔ کہ آخر کیا بات تھی۔ کہ یہ محبّانِ صادق سے

آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!

۱؎ مصرعہ ؎ صدیق کے لیئے ہے خدا کا رسول بس' (اقبال)

۲؎ و ۳؎ مصرعہ ؎ تُو ذرا چھیڑ تو دے تشنہٴ مضراب ہے ساز! (اقبال)

۴؎ یہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے قبل کے واقع کی طرف اشارہ ہے ÷ کفر کی حالت میں آپ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن ہو گئے تھے ÷ چنانچہ ایک دن آپ نے تہیّہ کر لیا۔ کہ وہ سردارِ دو جہاںؐ کو قتل کر دیں گے ÷ اس نیّت سے شمشیر ہاتھ میں لے کر گھر سے نکلے ÷ راستہ میں ایک صاحب ملے۔ انہوں نے اس شدّت سے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ کہ عمرؓ! کہاں کے ارادے ہیں؟ کہنے لگے۔ کہ آج ارادہ ہے۔ کہ اس نئے پیغمبرؐ کا سر قلم کر دُوں! اُس نے کہا۔ کہ پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو۔ آپ کی ہمشیرہ اسلام لا چکی ہیں! چنانچہ اُسی طیش میں اُنہوں نے اپنی ہمشیرہ کے گھر کا رُخ کر لیا ÷ وہاں پہنچے تو اندر سے کچھ آواز آئی ÷ آپ آواز کو سننے کے لیئے رُک گئے۔ معلوم ہُوا۔ کہ آپ کی ہمشیرہ قرآن کی آیات تلاوت کر رہی ہیں ÷ آپ آپے سے باہر ہو گئے ÷ نہایت غصّہ میں ہمشیرہ سے جا کر پوچھا۔ کہ وہ کیا پڑھ رہی ہیں؟ اُنہوں نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی لیکن حضرت عمرؓ کے اصرار پر اُنہی آیات کو تلاوت کرنا شروع کر دیا ÷ وہ طٰہٰ کی سورۃ تھی۔ جب آپ نے اُسے سنا تو معاً کلامِ ربّانی نے ایسا اثر کیا۔ کہ عشقِ حقیقی کی آگ لگ گئی ÷ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ سردارِ دو جہاںؐ کے ہاں حاضر ہو کر ایمان لے آئے! یہ اُسی (اپنی بہن کی لگائی ہوئی) "آگ" کی طرف اشارہ ہے! ۵؎ یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ÷ ۶؎ یعنی حضرت حسینؓ ÷ ۷؎ یعنی تمام صحابہ کرامؓ!

Marfat.com

غرض یہ پسِ منظر تھا۔ جس کی وجہ سے چار یارانِ نبی میں سے تین شہید ہوئے۔ اور حضرت حسینؓ جیسے رسولؐ کے لاڈلے کو بھی جامِ شہادت نوش کرنا پڑا! یہ حالات تھے جنکی وجہ سے "خلافتِ راشدہ" کو ختم کر کے "ملوکیت" قائم کر دی گئی! یہاں تک کہ موقع آنے پر اولیائے کرام کو بھی کہدیا گیا ؎

بس ہو چکی نماز مصلّیٰ اُٹھائیے!

اَب وہ بیچارے چھُپ چھُپ کر زندگی کے دن کاٹتے رہے: کبھی کوئی ہجویریؒ ظاہر ہو گیا۔ اور کہیں جیلانیؒ اور اِس طرح "مشین کے زمانہ" کی "تمہید" کے طور پر ہزار سال گزر گئے!

اور اب جب "صنّاعی" کا اصلی وقت آیا۔ تو وہی "رقیب" پھر "حُسن" کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا:-

"حضور! آج سے ہزار سال قبل جو گزارش کی تھی۔ اُس کی یاد دہانی کروانے کو آیا ہوں! اب تو "میو ہسپتال" کھلینگے۔ لیکن اگر ایک "عیسیٰؑ" اُس کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ تو آنکھ کا اپریشن کروانے اندر کون جائے گا؟ اب تو "ہوائی جہاز" اُڑیں گے۔ لیکن اگر کسی ولی نے یہ ثابت کر دیا کہ "عالم بشریت کی زد میں ہے گردُوں"! تو کام کس طرح چلے گا؟ لہذا اب براہِ مہربانی "ہجویریؒ" اور "جیلانیؒ" اس طرح غائب ہوں۔ جیسے کہ وہ اس دنیا میں کبھی موجود ہی نہ تھے[1]!"

غرض "عشق" کے "سردارِ اعظم" کو جب اِس (۱) خونفشاں ڈرامہ[2] اور (۲) "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" والی "صنّاعی[3]" کی اطلاع ملی۔ تو "حُسن" سے فرمانے لگے ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

اور اپنے جان نثاروں کو تمام کہانی سُنا ڈالی! سب خوش تھے۔ سب شادمان تھے۔ سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے! وہ غمگین ہو کر فرمانے لگے۔ مجھے کیوں نثار نہیں کیا گیا[4]؟ ارشاد ہوا اس میں ایک بھید ہے۔ یہ "رازِ چمن" ابھی "بیرونِ چمن" نہیں جا سکتا! یہ راز اُس وقت کھلے گا۔ جب قیامت کے قریب "پھول غمّازِ چمن" بنیں گے۔ اور پھر "بوئے گل" "چمن کے راز" کو "بیرونِ چمن" لے جائے گی[5]!

---

[1] اِسی لئے اس وقت تمام اولیائے کرام رُوپوش ہیں!

[2] کربلا کا واقعہ

[3] مشین کا زمانہ

[4] یعنی جس طرح حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی جام شہادت پیا ہے۔ اُن کو اسی قسم کی شہادت سے کیوں محروم رکھا گیا؟

[5] بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن۔ کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن! (اقبال)

Marfat.com

شمع کے پروانوں نے پوچھا اِسکی نشانی ؟

ارشاد ہُوا۔ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ

زمانوں کا زیروبم !

"درخشندہ ستارے" اِس اشارہ کو فوراً سمجھ گئے۔ اور بخوبی سمجھ گئے۔ لیکن ہم بالکل نہ سمجھے ! ہم نے حضورؐ کے ارشاد کی تصویر یوں کھینچی :

رسولِ پاکؐ کا زمانہ .... ق

تابعین کا زمانہ .... ر

تبع تابعین کا زمانہ .... ن

اُس کے بعد کا زمانہ یعنی موجودہ "مشین کا زمانہ" ...... ی

گویا انسانیت نیچے ہی نیچے لڑھکتی چلی جائے گی : لیکن حضورؐ کا مطلب یہ نہ تھا : زمانہ کبھی اوپر سے نیچے یا چپ و راست نہیں جاتا۔ وہ گردش میں رہتا ہے ! لہذا آپ کے اشارہ کی تصویر دراصل مندرجہ ذیل شکل سے ظاہر ہوتی ہے :

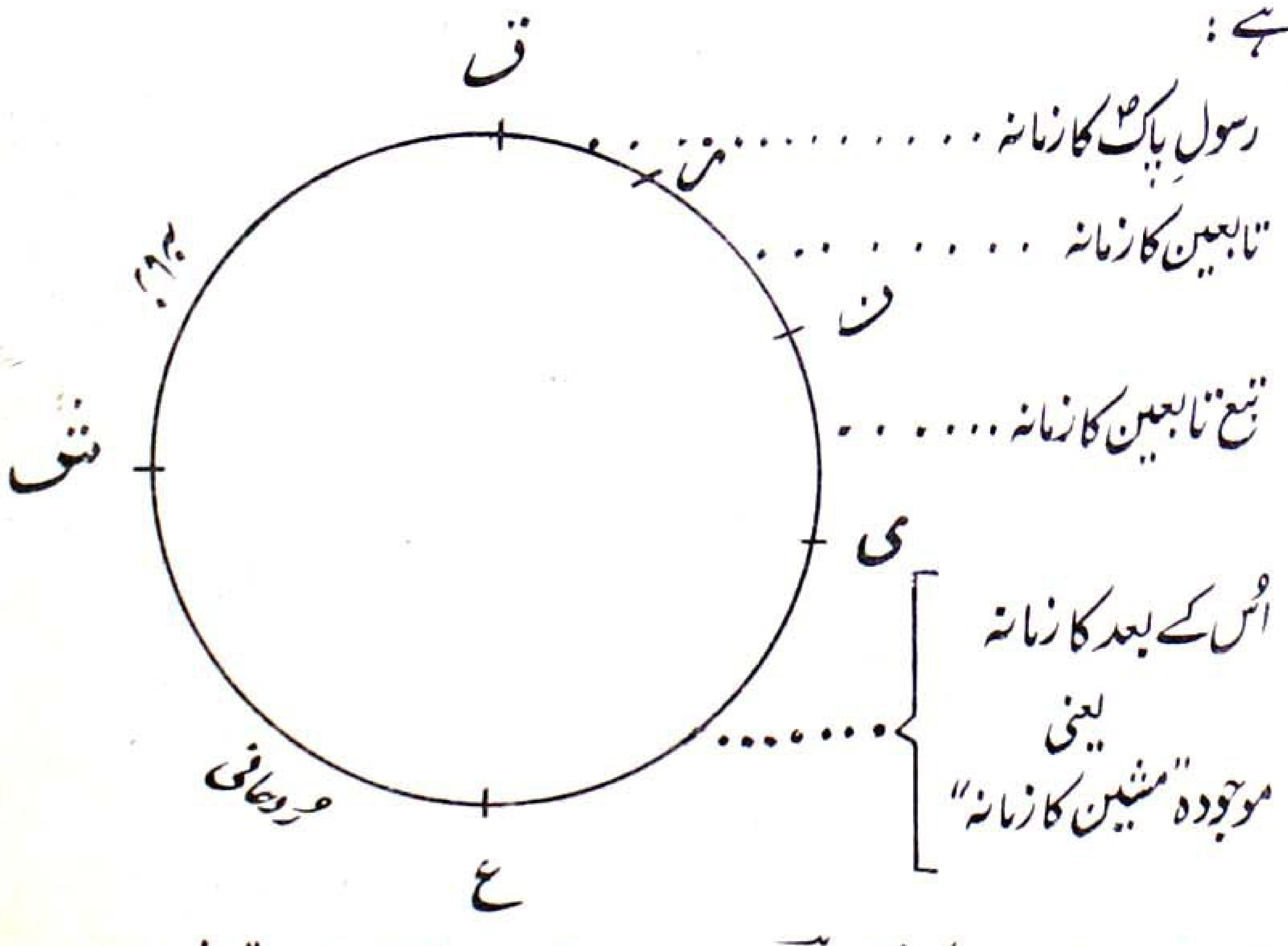

یعنی حضورؐ نے ارشاد یہ فرمایا تھا۔ کہ نقطہ ق سے نقطہ ی تک تو "قرنی" یعنی "عشقِ الٰہی" کا زمانہ ہوگا۔ پھر دُنیا سے محبت اُٹھنی شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ "عشق" کو "نظر بند" کر دیا جائے گا۔ اور پھر آخر کار آجکل

۱؎ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اُس سے کمتر اُن لوگوں کا زمانہ ہے۔ جو میرے بعد آئیں گے (یعنی تابعین)۔ اُن سے بھی کمتر اُن لوگوں کا زمانہ ہے۔ جو اُن کے بعد آئیں گے (یعنی تبع تابعین) ::

کا "مشین کا زمانہ" آجائے گا: لیکن جونہی زمانہ گردش کرتے کرتے ع کے نقطہ پر پہنچے گا۔ تو "عشق" پھر آزاد کر دیا جائے گا۔ یعنی وہ "طائران حرم" جو "مومنیت" کو آگے لانے کے لئے "پس پردہ" کر دئے گئے تھے (اور جو آج کل روپوش ہیں) - پھر ظاہر ہو جائیں گے! لہذا اس وقت دنیا میں جو "مادی تسخیر" کا دَور دَورہ چل رہا ہے - وہ اِن طائرانِ حرم کے ظہور کا پیش خیمہ ہے! بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے - کہ جس طرح ایک وقت اس دنیا میں زمانہ "حجر" تھا - اور اُس کے بعد "زمانہ حدید" آیا - اور اپنی اپنی مُہلت کے گزرنے کے بعد یہ دونو دَور ختم ہو گئے - عین اُسی طرح موجودہ "مشین کے زمانہ" کی بھی ایک معینہ مُہلت ہے - اُس کے گزرنے کے بعد اِس نے بھی ایک روز ختم ہو جانا ہے! لہذا دنیا کی موجودہ "مادی تسخیر" بالکل ایک عارضی شے ہے - کیونکہ یہ مادی ترقی صرف ایک خاص نقطہ تک ہی جا سکتی ہے - اِس نقطہ سے وراء جانے کی اس میں اہلیت ہی نہیں!

اِسی لئے قرآن موجودہ زمانہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں چیلنج کرتا ہے :-

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ؏ (سورۃ الرحمٰن - آیت ۳۳)

(یعنی اے جن و انسان کے گروہو! تم میں اگر یہ قدرت ہے - کہ تم آسمان و زمین کی حدود سے باہر نکل جاؤ - تو نکل کر دیکھو - لیکن یہ بغیر ہماری منظوری یا ایمانی طاقت کے ممکن نہیں!)

یہاں لفظ "سلطٰن" کے معنی یا "خدائی منظوری" کے ہیں - (جو خدا رسیدہ انسانوں کے بغیر اور کسی کو نہیں مل سکتی) - یا "ایمانی طاقت" کے ہیں - (جو صرف "براھیمی ایمان" میں پائی جاتی ہے) - اِس سے "اٹمی قوت" مراد نہیں! اِسی لئے آج کل کے خلائی جہاز (spaceship) ایک حد تک تو آسمان کی طرف جا سکتے ہیں - لیکن اُس سے آگے نہیں - چونکہ آگے "شعلے اور آگ کے دھوئیں ہیں - جن سے معمولی انسانوں کو چھٹکارا نہیں! اسی لئے قرآن میں مندرجہ بالا آیت کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے :-

یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ؏ (سورۃ الرحمٰن - آیت ۳۵)

(یعنی اگر تم "خدائی منظوری" یا "براھیمی ایمان" کی قوت کے بغیر آسمان و زمین کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرو گے - تو تم پر آگ کے شعلے اور دھوئیں چھوڑے جائیں گے - جن سے بچنے کے لئے تمہیں کوئی مدد نہ پہنچ سکے گی۔)

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا: امریکہ کے رسالے "لائف انٹرنیشنل

لے اولیائے کرام

Marfat.com

مورخہ ۸ رمئی ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں "البرٹ روزن فیلڈ" نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے "سماوی نیا معمّہ" اُس میں وہ لکھتے ہیں :-

(آزاد ترجمہ)

"سائنسدانوں کو حال ہی میں اچانک آسمانوں میں کچھ ایسے شعلے دکھائی دئے ہیں۔ جو اُن کے لئے بالکل معمّہ ہیں :: اِس معمّہ سے اُن کو جو حیرت لاحق ہوئی ہے۔ اُس میں وہ بالکل حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ جو شعلے اُن کو دکھائی دئے ہیں۔ وہ آگ کی تمازت کی ایک ایسی ہولناک صورت ہے۔ جیسے دس لاکھ آفتاب یکجا کر دئے گئے ہوں :: وہ شعلے ایک ایسی بھڑک دار آگ میں سے نکلتے ہیں۔ کہ اگر آسمان کے تمام کروڑہا ستاروں کو یکجا کر دیا جائے۔ اور پھر اُنہیں سو گنا بھی کر دیا جائے۔ تو اُن شعلوں کی روشنی ان تمام ستاروں کو ماند کر دے گی !"

یہاں یہ نکتہ سمجھنا لازمی ہے۔ کہ اِس وقت دنیا جو چاند تک چھلانگیں لگا رہی ہے۔ آسمانی فضا کی وہ محض "ابتدائی منزل" ہے۔ اِس کے آگے ایک اَور منزل ہے۔ جس میں آگ کے ایسے شعلے[1] اور دھوئیں ہیں۔ کہ اِس کرۂ عرض کے "دنیا دار" لوگ اُن سے بچ نہیں سکتے ! لیکن یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت عیسٰیؑ اِنہیں آگ کے شعلوں اَور دھوؤں میں سے گزر کر آسمان پر گئے۔ اَور رسول پاکؐ کو معراج بھی اِنہی شعلوں اَور دھوؤں میں سے گزر کر ہوا۔ اَور اُن کا ایک بال بھی بِیکا نہ ہوا ! آخر یہ ایسا کیوں ہوا ؟ یہ اِس لئے کہ اِن میں براھیمی ایمان تھا۔ اَور "براھیمی ایمان" کی نشان ہی یہ ہے۔ کہ اُس کے لئے آگ "گلزار" کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن خلائی ہوا بازوں کے لئے یہ حکم نہیں !

ہمارے غور و فکر کے لئے اِس میں ایک وسیع میدان تھا۔ لیکن ہم نے اِس طرف توجہ دینے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی !

اَور جن لوگوں نے اِس معاملہ میں کچھ سوچا بھی ہے۔ اُن کے فکر کی سطح بہت پست ہے !

مثال کے طور پر مندرجہ بالا پہلی آیت میں جو "سُلطٰن" کا لفظ آیا ہے ایک صاحب نے اُس کے معنی "ایٹمی قوت" کے لئے ہیں ! ظاہر ہے۔ کہ ہم اس قسم کے معانی موجودہ "چاند کی دھوم" سے مرعوب ہو کر کر رہے

---

[1] قرآن کی مذکورہ آیت اَور مندرجہ بالا اقتباس میں اسی آگ کے شعلوں کا ذکر ہے !

Marfat.com

ہیں۔ ورنہ قرآن کی آیت میں اِس قسم کے معنی کی کوئی گنجائش نہیں :: اِس کتاب کے باب چہارم[ا] میں اِس قسم کی اٹکل پچو بانوں کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے ::

اِسی طرح مندرجہ بالا دوسری آیت میں "شعلوں" کا ذکر آیا ہے۔ اُن سے ایک صاحب[۲] وہ حدت اور تمازت مراد لیتے ہیں۔ جو خلائی جہازوں کو اُس وقت پیش آتی ہے۔ جب کہ وہ زمین کے ارد گرد تین چار سو میل گھیرے کرّہ ہوائی سے نکلتے اور واپس آتے ہیں! اور اسی وجہ سے خلائی جہاز فی الحال سمندر میں اتارے جاتے ہیں۔ اور کئی طریق سے اُن کی واپسی پر رفتار میں کمی کی جاتی ہے ::

ظاہر ہے۔ کہ متذکرہ بالا آیت میں سوال تو آگ کے صفوں اور کائناتی اقلیموں کو عبور کرنے کا ہے۔ لہذا اِس آیت میں "شعلوں" سے مراد وہ تمازت نہیں ہو سکتی۔ جو خلائی جہازوں میں اُن کی رفتار کی تیزی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ::

اِن وجوہ کی بنا پر قرآن کا صحیح منشا وہی شعلے ہیں۔ جن کا تذکرہ مندرجہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے ::

اِسلام کا صحیح فلسفہ اور انسان کے "عدوٌ مُبین" کا اُس کے خلاف ردِّ عمل !

باب ہیں

جس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کا صحیح فلسفہ کیا ہے؟ انسان کے "عدوٌ مبین" کا اُس کے خلاف ردِّ عمل کیا ہوا؟ اور اِس زمانہ میں اُس نے دنیا کو کیا چکمہ دیا ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اِس دنیا میں دو طاقتیں ہیں :: ایک مثبت (خدا) اور دوسری منفی (شیطان)! مثبت طاقت یہ چاہتی ہے۔ کہ ایک انسان کو تمام عمر صرف ایک ہی دُھن رہے۔ وہ یہ کہ جو ذات اِس دنیا میں مستور ہے۔ وہ اُس کو ڈھونڈ لے! اور جب ایک انسان اِس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُس کے حکم کے تحت ہو جاتا ہے۔ آگ پھر اُسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اُسے ڈبو نہیں سکتا۔ ہوا اُسے نیست و نابود نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ ولی کے بارے میں ایک حدیث ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں اُس کے کان ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتا ہے! میں اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے! میں اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ پکڑتا ہے! میں اُس کے پاؤں ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ چلتا ہے!

[ا] دیکھیں فصل "انگریزی دان علماء"!

[۲] اِن خیالات کا اظہار ڈاکٹر یوسف علی (سول ہسپتال۔ ملتان) نے "سیارہ ڈائجسٹ" (بابت نومبر ۱۹۶۹ء) قرآن نمبر جلد دوم کے صفحہ ۸۹۶ پر کیا ہے ::

Marfat.com

اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے۔ تو اُس کو ضرور دیتا ہوں! اور ایسا ہونا بالکل قرینِ قیاس بھی ہے۔ کیونکہ آخر انسان کے اندر "رُوحِہٖ" تو ہے! اور یہی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کی صحیح تفسیر ہے!

لیکن اس کے برعکس "منفی طاقت" یہ چاہتی ہے۔ کہ ایک انسان دنیا میں سب کچھ کرے۔ لیکن صرف "مثبت طاقت" کو بھول جائے۔ یعنی نہ رب العزت کو اپنے خیال میں لائے۔ اور نہ اُس کی طرف جھکے!

چنانچہ دنیا کی تاریخ میں دو قسم کے زمانے پائے جاتے ہیں۔ ایک "مادی زمانہ" اور دوسرا "رُوحانی زمانہ"، یہ ایک دوسرے کے بعد پے در پے آتے رہتے ہیں!

"مادی زمانہ" میں دنیا صرف مادی چیزوں کی طرف ہی رغبت کرتی ہے۔ اور خدا کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیتی ہے۔ لیکن "رُوحانی زمانہ" میں وہ دنیا کی تمام رغبتوں سے غافل ہو کر صرف خدا کی طرف رُخ کر لیتی ہے!

چنانچہ موجودہ "مشین کا زمانہ" بھی "مادی زمانہ" کی ہی ایک کڑی ہے!

اس زمانہ میں "منفی طاقت" نے جو سب سے گہری چال چلی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اُس نے منصوبہ یہ بنایا کہ چونکہ کائنات کی رُوحانی تسخیر کے لئے انسان کو لازماً خدا کو ماننا اور اُس کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے انسان کو کائنات کی "تسخیر" تو حاصل ہو جائے۔ (خواہ وہ ادھوری اور ایک خاص حد تک ہی ہو) لیکن اُس کو خدا کو ماننے یا اُس کے سامنے جھکنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے!

چنانچہ اُس نے کمال کید سے "مشین کے زمانہ" کا پروگرام بنایا۔ اور اُس کی "خشتِ اوّل" اس طرح رکھی۔ کہ انسان کا دل جو خدا کی تجلیات کی آماجگاہ ہے۔ اُس کی بابت تو سبق یہ پڑھایا۔ کہ وہ تو محض "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ اور بس! اور دماغ کو دنیوی علوم سے نشوونما کرنے کی ترغیب دی۔ تاکہ انسان کائنات کی مادی تسخیر کے لحاظ سے تو بیل گاڑی سے خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ جائے۔ لیکن خدا کو ماننے یا اُس کے سامنے جھکنے کی اُس کو ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

اس تدبیر کی تہ میں جو اصلی بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسانی دماغ میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں! یہ تمیز صرف "ضمیر" میں ہے۔ جو انسان کے دل یا قلب میں ہوتی ہے۔ اور جس کی نشوونما صرف خدا کے ساتھ لو لگانے سے ہوتی ہے! لیکن اس کی بابت ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ کہ اس کو "خون کے دوران کے آلہ" کے سوا اب اور کچھ نہیں سمجھا جاتا!

۱؎ سورۃ ۳۲ السجدۃ۔ آیت ۹ :

۲؎ سورۃ ۹۵ التین۔ آیت ۴ : اور تحقیق ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت پر بنایا :

Marfat.com

اِن نکات کی باریکیوں کو چونکہ صحابہ کرام اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لہٰذا انسان کے "عدوٌ مبین" کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی۔ کہ اُس زمانہ کے "درخشندہ ستارے" جو اُس وقت کی دنیا کی "رونق" تھے۔ وہ "رونقِ محفل" نہ رہیں! چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ "خلافت" پیچھے ہو جاتی۔ اور "ملوکیت" آگے بڑھ جاتی! چنانچہ اِس "منصوبے" کی ابتدا تو حضرت علیؓ کی خلافتِ حقہ کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کی خود مختار حکومتِ شام سے ہوئی۔ اور کربلا کے واقعہ نے اِس انقلاب پر ایک قسم کی "مہرِ دوام" ثبت کر دی!

اب غور سے دیکھا جائے۔ تو اِس انقلابِ عظیمہ کے پسِ منظر وہی تدابیر تھیں جن کا مختصراً ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ یعنی موجودہ دنیوی علوم سے انسانی دماغ کی پوری طرح نشوونما کی جائے۔ چنانچہ اُس کا نتیجہ اب یہ ہے۔ کہ جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے۔ انسان مٹی کے ڈبے سے بجلی تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن ؎

"زندگی بے بندگی شرمندگی" کے راز کو نہیں سمجھ سکا!

اب اگر مندرجہ بالا تدابیر کو کربلا کے واقعہ کا صحیح پسِ منظر تصور کر لیا جائے تو غور و فکر میں تھوڑے سے تعمق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جن صحابہ کرام نے حضرت حسینؓ کو کوفہ جانے سے روکا۔ وہ تو اِس نقطۂ نگاہ سے حق بجانب تھے۔ کہ اِن کو مشیتِ الٰہی معلوم تھی۔ کہ اِس وقت "خلافتِ الٰہیہ" نے پیچھے ہو جانا ہے۔ اور "ملوکیت" نے آگے بڑھنا ہے' لیکن حضرت حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں نے سر کی بازی اس وجہ سے لگائی۔ کہ مشیتِ ایزدی یہ بھی تھی۔ کہ نہ صرف انسان کے "عدوٌ مبین" بلکہ آنے والی تمام نسلوں پر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ "حق" سر کی بازی لگا دیتا ہے۔ لیکن پیچھے کبھی نہیں ہٹتا! خاص کر ایسی صورت میں جب کہ "حق" کو یہ معلوم ہو۔ کہ "عدوٌ مبین" کی چال میں گہرائی اِس حد تک ہے۔ کہ وہ دنیا کی "مستقل اقدار" کو ہی بدلنے کے درپے ہے!

اس کا ثبوت اِس سے ملتا ہے۔ کہ قرآن کے بیسویں صدی کے "نئے" مفسرین اب "خدا کی معرفت" کی بجائے "مادہ کی معرفت" کو ہی مقصدِ حیات تصور کر رہے ہیں! اِس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی[۱] یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ مندرجہ بالا تدابیر کو بروئے کار لانے کے لئے موجودہ زمانہ میں "منفی طاقت" نے دنیا کو کائنات کی "مادی تسخیر" کا چکمہ دیا۔ اور یہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ کہ اگر پٹرول سے ایک موٹر چل سکتی ہے۔ تو ہوائی جہاز اُس سے اُڑ سکتا ہے۔ اور پھر دعویٰ یہ کیا۔ کہ جب تک اِن دونوں کی مشینیں ایک خاص انداز میں درست ہوں گی۔ تب تک دنیا کی کوئی طاقت ایک کو چلنے اور دوسرے کو اُڑنے سے روک نہیں سکتی!

---

[۱] دیکھیں فصل "انگریزی دان" علماء!

Marfat.com

لیکن دنیا کو کیا معلوم ؟ کہ قدرت نے روزِ آفرینش سے خدا کے نائب (یعنی انسان) کے لئے کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" مقدّر کی ہے !

(نوٹ)

اس قسم کی "رُوحانی تسخیر" کب ہو گی ؟ کیوں ہو گی ؟ اور کس طرح ہو گی ؟
اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی ؛ یہاں صرف اِتنا اِشارہ کافی ہے - کہ ؎

کُلبۂ احزاں شود رُوزے گُلستاں غم مخُور !

Marfat.com

باب سوم

دنیا کی کہانی کا انجام

تمہید اب جب کہ ہم اسلام کے صحیح فلسفہ اور اُس کے خلاف انسان کے "عدو مبین" کے ردِعمل سے آشنا ہو چکے ہیں۔ ہم اس وقت ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ہم اب کائنات کی "روحانی تسخیر" کے بارہ میں سنجیدگی سے کچھ سوچ سکیں۔ سمجھ سکیں۔ یا وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکیں:

اس سلسلہ میں اب ہماری کوشش یہ ہوگی۔ کہ ہم پہلے قرآن کی آیات کا مطلب قرآن کی آیات سے ہی سمجھیں۔ اور جب یہ سمجھ میں آجائے۔ تو پھر جو کچھ دُنیا میں اس وقت ہو رہا ہے۔ اگر وہ قرآنی مفہوم کے خلاف ہوتا دکھائی دے۔ تو اُس سے مرعوب بالکل نہ ہوں۔ تاکہ پھر ہم "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کی تفسیر تو نہ بنیں۔ بلکہ ہمارا ایمان "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" کی تفسیر ہو!

قرآن میں لفظِ "نعمت" کی تفسیر اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے قرآن میں لفظِ "نعمت" کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لہذا ہمیں اب سورۃ الفاتحہ کے الفاظ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ [1] پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے:۔ سوال صرف یہ ہے۔ کہ رب العزت جن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں۔ تو ان نعمتوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ میں قرآن کی صرف دو آیتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ کہ قرآن جب نعمت کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ تو اُس سے اُس کا مدعا کیا ہوتا ہے؟

(۱) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب حضرت عیسیٰؑ کی توجہ ان احسانات کی طرف منعطف کرانا چاہیں گے۔ جو اُن پر کئے گئے۔ تو فرمائیں گے:

يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ (سورۃ ۵ المائدہ آیت ۱۱۰)
(یعنی اے عیسیٰؑ مریم کے بیٹے یاد کر میری نعمت کو جو میں نے تجھ پر انعام کی!)

---

[1] اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ (سورۃ الفاتحہ آیت ۷)

Marfat.com

اس آیت میں "نعمت" سے مراد حضرت عیسیٰؑ کے وہ تمام معجزات ہیں۔ جو اُن سے سرزد ہوئے۔ مثلاً "کوڑھیوں کو اچھا کرنا! مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دینا! مُردوں کو زندہ کرنا! وغیرہ وغیرہ ؛

اسی طرح حضرت سلیمانؑ جب اُن احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ جو رب العزت نے اُن پر کئے۔ تو فرماتے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ (سورۃ ۲۷ النمل۔ آیت ۱۹) ؛

(یعنی اے رب مجھے توفیق دے۔ کہ میں تیری اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں۔ جو تو نے مجھے انعام کے طور پر عطا کیں) ؛

اور حضرت سلیمانؑ جن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی معجزات ہی تھے۔ جو اُن کو عطا کئے گئے ؛ مثلاً اُن کا تخت ہوا میں اُڑانا! پرندوں کی بولیاں سمجھنا! چیونٹیوں کی باتوں کو سُننا! جنوں پر حکومت کرنا وغیرہ وغیرہ ؛

گویا قرآن میں "نعمت" کے لفظ سے مراد معجزات ہیں ؛

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جن نعمتوں کے عطا ہونے کی دُعا کی جاتی ہے۔ وہ کون سی ہیں ؟

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے جس نکتہ کا سمجھنا لازمی ہے' وہ یہ ہے۔ کہ اُمّتِ محمدیہ کا زیادہ تر تعلق اُن نعمتوں سے ہے جن کے اِتمام کا ذکر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں آیا ہے :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۳)

(یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں نے آج کے دن تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دی ہیں!) ؛

یہ ظاہر ہے۔ کہ اس آیت میں جن نعمتوں کے "اِتمام" کا ذکر ہے۔ وہ رسول پاک کے زمانہ کے تمام معجزات ہیں۔ مثلاً حضورؐ کا معراج پر تشریف لے جانا۔ قَابَ قَوْسَیْنِ[1] کی حد تک پہنچ کر دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونا۔ چاند کو شق کرنا۔ یا سورج کو آگے پیچھے کرنا! وغیرہ وغیرہ ؛

اب چونکہ پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور اُن سے کسی قسم کے معجزات سرزد نہیں ہو سکتے۔ لہذا پہلے زمانوں میں جو معجزات پیغمبروں کو عطا ہوتے تھے۔ اب وہ (حضورؐ کی حدیث عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْل کی رُو سے) صرف اولیائے کرام کے لئے وقف ہو چکے ہیں ؛ اور چونکہ اولیائے کرام کے حق میں یہ معجزات صرف کرامات کی صورت میں ہی نمودار ہو سکتے ہیں۔ لہذا ان سے پھر کائنات کی "رُوحانی تسخیر"

---

[1] یعنی خدا تعالیٰ کے جلوے اور حضور صلعم میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۹)

Marfat.com

ہی منتج ہو سکتی ہے! اور سورۂ فاتحہ میں دعا بھی صرف اسی ایک مقصد کو پورا کرنے کے لئے کی جاتی ہے!

یہاں شاید یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ "نعمتوں" سے مراد کرامات ہی کیوں لی جائیں۔ ہوا۔ پانی۔ آگ یا سورج کی روشنی کو کیوں خدا کی نعمتیں نہ تصوّر کیا جائے؟

مندرجہ بالا اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي والی آیت[1] میں جن نعمتوں سے مراد لی گئی ہے۔ وہ ہوا۔ پانی اور آگ وغیرہ اس لئے نہیں ہو سکتیں۔ کہ اس آیت میں صرف اُن نعمتوں کا ذکر ہے۔ جن کی حضورؐ کے زمانہ میں تکمیل ہوئی؛ اب چونکہ ہوا اور پانی وغیرہ کی نعمتیں روزِ آفرینش سے اس دنیا میں موجود ہیں۔ لہذا ان کی تکمیل کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا؛

اسی طرح بعض لوگ آج کل کی دنیا کی ایجادات (مثلاً بجلی۔ ریل۔ موٹر۔ ہوائی جہاز وغیرہ) کو نعمتیں سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ یہ چیزیں صرف دو تین صدیوں سے اس دنیا میں وجود میں آئی ہیں۔ نعمتوں کے "اتمام" والی آیت کے نُزول کے وقت یہ دنیا میں موجود ہی نہیں تھیں۔ لہذا زیر بحث آیت میں ان چیزوں کے اطلاق کا سوال بھی پیدا نہیں ہو سکتا؛

ان وجوہ کی بنا پر یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کہ:

(۱) چونکہ قرآن نے "نعمت" کے لفظ کو معجزہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور

(۲) اُمتِ مسلمہ کا خاص تعلق صرف اُن نعمتوں سے ہے۔ جن کی تکمیل حضورؐ کے زمانہ میں ہوتی۔ اور یہ اُوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ

(الف) حضورؐ کے زمانہ میں جن نعمتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ یا تو قابَ قوسَین تک رسائی ہے۔ اور یا شق القمر اور سورج کو آگے پیچھے کرنے والے معجزات ہیں۔ اور

(ب) سورۂ فاتحہ میں جن نعمتوں کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ وہ اولیائے کرام کے حق میں صرف کرامات کی صورت میں ہی نمودار ہو سکتی ہیں! لہذا

(۳) اُمتِ مسلمہ کے حق میں "قابَ قوسَین" والی نعمت سے مراد "دیدارِ الٰہی" کی فراوانی یا قُربِ الٰہی ہے۔ اور "شق القمر" والے معجزے سے مراد کائنات کی رُوحانی تسخیر ہے!

گویا یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی۔ کہ سورۂ فاتحہ کو نازل کر کے قدرت کا منشا یہ ہے کہ آخر کار انسان کائنات

---

[1] سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۳

Marfat.com

کے ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" کرے۔ "مادی تسخیر" اُس کا منشا نہیں ہے۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی۔ کہ زُود یا بدیر بالآخر کائنات کی "رُوحانی تسخیر" لابُدی ہے!

چنانچہ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے۔ جب زمانہ گردش کرتے کرتے (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ۵۸) نقطہ ع پر پہنچے گا۔ تو "طائرانِ حرم"۔ جو "مُلوکیت" کو آگے کرنے کے لئے ارادۃً پیچھے ہوئے تھے۔ اور اس وقت جان بُوجھ کر رُوپوش ہیں۔ اُن کا ظہور ہو جائے گا۔ اور پھر ان ہستیوں کے اُن کارناموں کی وجہ سے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" عمل میں آئے گی۔ اور موجودہ "مادی تسخیر" کی مُہلت ختم ہو جائیگی!

غرض اس وقت فضائے عالم میں جو ماہ رس تفنگے (rockets) یا خلائی جہاز (spaceships) گھوم رہے ہیں۔ اُن میں حکمت ہی صرف یہ ہے۔ کہ جب وہ عالم بالا کے اُس نقطہ پر پہنچیں۔ جہاں آگ کے شعلے اور دھوئیں ہیں ـــــ اور وہ اُس مقام تک ابھی نہیں پہنچے ـــــ اور وہاں پہنچ کر خاک سیاہ ہوتے رہیں۔ اور آخر کار اُن کے مُوجد اپنی ناکامی کی وجہ سے مایُوس ہو جائیں۔ عین اُس وقت پھر غیب سے اُن "طائرانِ حرم" کا اُس مردِ کامل کی سرکردگی میں ظہور ہو۔ جس کے بارہ میں اقبالؒ نے "آئی و بصد ناز آئی"[1] کی صدا لگائی تھی! تاکہ دُنیا اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کرے۔ کہ خلائی جہازوں (spaceships) کے "پیکرانِ محسوس" تو خاک سیاہ ہوتے رہے۔ لیکن وہ "پیکر"۔ جو "دانائے راز" ہوتے ہیں۔ وہ انہی شعلوں اور دھوؤں میں سے کس آن اور شان کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں!

"طائرانِ حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی!

چنانچہ موجودہ "مشین کے زمانہ" کی مُہلت ختم ہونے پر جب "رُوحانی زمانہ" شروع ہوگا۔ تو "طائرانِ حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی اغلباً یہ ہوگی۔ کہ وہ چاند کو شق کریں گے اور وہ اس طرح کہ اُس کے مختلف ٹکڑے :

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ

کے الفاظ میں منتقل ہو جائیں گے!

اس نظارہ کا تمام دُنیا نظارہ کرے گی!

---

[1] اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی!
بے حجابانہ سُوئے محفلِ ما باز آئی!
(اقبال)

Marfat.com

یہ "نُور کے زمام" کی پہلی کڑی ہو گی !

یہ اِس بات کی ایک بین نشانی ہو گی ۔ کہ مشین کے زمانہ کی مُہلت قریب الختم ہے !

اِس کے بعد "طائرانِ حرم" چاند کو ایک دفعہ پھر شق کریں گے ۔ اِس مرتبہ اُس کے ٹکڑے (اغلباً) مندرجہ ذیل الفاظ میں منتقل ہو جائیں گے ۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (سورۃ، الاعراف۔ آیت ۳۴):

(یعنی ہر ایک اُمت کے لئے ایک مُہلت مقرر ہے ۔ پس جب وہ مُہلت ختم ہو جاتی ہے ۔ اور اُس کی "اجل" آجاتی ہے ۔ تو پھر نہ وہ ایک لمحہ کے لئے پیچھے ہو سکتی ہے ۔ اور نہ آگے ہو سکتی ہے !)

اُس وقت "مشین کے زمانہ" کی مُہلت ختم ہو جائے گی !

اُس وقت پھر (دنیا کو اِس بات سے آگاہ کرنے کے لئے کہ آئندہ حالات کیا صورت اختیار کرنے والے ہیں) ۔ کچھ عرصہ کے لئے دنیا کی تمام مشینیں ایک خاص وقت پر چند ساعتوں کے لئے رُک جایا کریں گی ! گویا جس طرح حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بحرِ قلزم خشک ہو گیا تھا ' بالکل اُسی طرح ریل چلتی چلتی تھم جائے گی ! موٹر دوڑتی دوڑتی رُک جائے گی ! ہوائی جہاز اڑتا اُڑتا ہوا میں معلق ہو جائے گا ! اور دنیا کی کوئی طاقت اِن مخصوص ساعتوں میں نہ ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکے گی اور نہ ہلا سکے گی !

گویا زمانہ اُس وقت پھر زبانِ حال سے پُکارے گا ؎

سامنے تقدیر کے رُسوائی تدبیر دیکھ !

اِس طرح دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی ۔ کہ انسانوں کی نظروں کے سامنے یہ کیا ہو گیا ؟ کیوں ہو گیا ؟ اور کس طرح ہو گیا ؟

تب عوام النّاس دنوں گھنٹوں اور لمحوں میں ایک طرف تو یہ سبق سیکھیں گے ۔ کہ اِس کائنات کے ورا کوئی طاقت ہے ۔ جس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا ۔ یعنی :

لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ [1]

اور دوسری طرف "منفی طاقت" نے دنیا کو اِس وقت جو "مادی تسخیر" کا چکمہ دیا ہوا ہے ۔ اُس کی قلعی کھل جائے گی ! اور آخرکار دنیا اِس بات کی قائل ہو جائے گی ۔ کہ ؎

خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے !

---

[1] اللہ کے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا !

Marfat.com

یہاں جس فلسفہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ قرآن کی "معجزات والی کہانی" ختم نہیں ہوگئی۔ اس نے ابھی "کرامات" کے رُوپ میں رُونما ہونا ہے! اس صورتِ حالات کا ثبوت تو گذشتہ صفحات میں دیا جاچکا ہے۔ لیکن اس ثبوت کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر "دین کی تکمیل" سے پہلے:

(۱) حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ "انداز گلستان" پیدا کرسکتی تھی! یا

(۲) حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا مسخّر ہوسکتی تھی! یا

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے صرف قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ کہنے سے مُردے جی سکتے تھے!

تو "دین کی تکمیل" کے بعد صورتِ حال کیا ہونی چاہیئے؟ اس سوال کے صحیح جواب میں ہی حضورؐ پر جو "اتمامِ نعمت" ہوئی ہے۔ اُس کی تفسیر مضمر ہے اور اسی نکتہ سے ہی اولیائے کرام کی کرامات پر بھی روشنی پڑتی ہے!

لہٰذا اس سلسلہ میں یہاں جو کچھ بھی کہا گیا ہے۔ اور جن الفاظ میں بھی کہا گیا ہے۔ اِن کو "پیشین گوئی" نہ سمجھیں۔ بلکہ "اشارات" سمجھیں۔ کہ "رُوحانی زمانہ" میں واقعات کی اُفتاد کیا ہوگی؟

بایں‌ہمہ یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ مانا، جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے۔ وہ پیشین گوئی نہ سہی۔ بلکہ محض واقعات کی "اُفتاد" کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اِس قسم کی "اُفتاد" کی آخر سند کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس دُنیا میں تخلیقی (original) باتوں کے متعلق دلائل تو دیئے جاسکتے ہیں۔ لیکن نہ کوئی ثبوت مُہیّا کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ سند دی جاسکتی ہے:

مثال کے طور پر جب سٹیفنسن (Stephenson) کو یہ سُوجھی۔ کہ آگ اور پانی کے بخارات سے ریل کا انجن چل سکتا ہے۔ تو وہ اُبلتے ہوئے پانی کی دیگچی کے ڈھکنے کے بار بار اُٹھنے کو دلیل کے طور پر تو پیش کرسکتا تھا۔ لیکن نہ کوئی ثبوت پیش کرسکتا تھا۔ کیونکہ پہلے کبھی اس قسم کا انجن بنا نہیں تھا۔ اور نہ کوئی سند دے سکتا تھا:

بالکل اُسی طرح گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے۔ کہ یہ سب کچھ ردِّ عمل ہوگا۔ اُن تمام "چالوں" کا جو انسان کے "عدوٌ مبین" نے "مشین کے زمانہ" کو کامیاب بنانے میں چلیں!

باقی رہی، اس ردِّ عمل کی سند کہ چاند کس طرح شق ہوسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ جب کوئی امر ایک دفعہ واقع ہوجائے۔ تو اُس کا دوبارہ واقع ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں!

اِس کے علاوہ ایک اور نکتہ جو اس سلسلہ میں ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ قیامت تک کائنات کی سرداری، حضورؐ کے ہاتھ میں ہی ہے۔ لہٰذا حضورؐ ہی اس وقت دنیا میں "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ" کی تفسیر ہیں۔ یہ اس لحاظ سے کہ یہ دنیا چونکہ دارالاسباب ہے۔ لہٰذا ہر امر کا کرنے والا گو خدا ہے۔ لیکن وہ کرداتا اپنے بندوں سے ہی ہے۔ چنانچہ دنیا کے لوگ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ کے "محض بندے" ہیں۔ تو حضورؐ "حقیقی عبدہٗ" ہیں!

Marfat.com

اِس لئے جس ذات نے پہلے چاند کو شق کیا تھا۔ اُسی نے پھر چاند کو شق کرنا ہے! فرق صرف اتنا ہے۔ کہ پہلے بذاتِ خود حضورؐ کے ہاتھ سے یہ فعل سرزد ہوا۔ اب وہ ہاتھ "بہانہ" بنیں گے جنہوں نے حضورؐ کی نظرِ کرم سے فیض پایا ہوگا!

پہلے چاند محض دو ٹکڑے ہوا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اُس وقت کی دُنیا اَن پڑھ تھی: اب اگر اُس کے ٹکڑے مختلف الفاظ میں منتقل ہوں گے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہوگی۔ کہ اب دنیا پڑھی لکھی ہے!

اب رہی یہ بات کہ یہ نکات لئے کہاں سے گئے ہیں؟ تو اِس کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے ؎

سرِّ خدا کہ عارفِ کامل بہ کس نہ گفت!
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

غرض اِس وقت ضرورت اِس امر کی ہے۔ کہ ہم یہ کھوج لگانے کی کوشش کریں۔ کہ اسلام دراصل کائنات کی "مادی تسخیر" کا قایل ہے۔ یا "رُوحانی تسخیر" کا؟

روزِ آفرینش سے دنیا کی رفتار کی اُفتاد ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ اگر اسلام "مادی تسخیر" کا قایل ہوتا۔ تو قدرت کا گذشتہ صدیوں میں رویہ کچھ اِس قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ کہ حضرت نوحؑ کو تو فزکس (physics) کے اصول سمجھائے جاتے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو کیمسٹری (chemistry) کے: اِس طرح پھر اگر حضرت موسیٰؑ دخانی جہاز کے مُوجد ہوتے۔ تو حضرت سلیمانؑ ہوائی جہاز کے: لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ نہ صرف گذشتہ انبیاء علیہم السلام نے کائنات کی "مادی تسخیر" کی طرف رُخ ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ ذات جس کی زبان پر ہر وقت "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً" کا وِرد رہتا تھا۔ اُس کو بھی قدرت کی طرف سے پہلا اور آخری فارمولا (formula) اگر ملا۔ تو وہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ" کے سوا اور کچھ نہ تھا!

لہٰذا اسلامی دُنیا میں جس بات نے "فساد" پیدا کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے نہ صرف "خدا رسیدگی" کو مقصدِ حیات نہ سمجھا۔ بلکہ کائنات کے "ذرّات کی معرفت" کو ہی "خدا کی معرفت" سمجھنا شروع کر دیا! (اِس کی تفصیل باب چہارم[1] میں آئے گی)

کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی تسخیر!

اب پیشتر اس کے کہ ہم آگے بڑھیں۔ یہاں

---

[1] دیکھیں فصل "انگریزی دان" علماء!

Marfat.com

قرآن کی آیت سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ[1] کی تفسیر سمجھنے کی ضرورت ہے :۔ یہ آیت ذُو معنی ہے :۔ اِسکا ایک مطلب تو یہ ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کے فائدے کے لئے کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر رکھا ہے :۔ یعنی سورج ہر روز مشرق سے طلوع ہوگا ۔ اور عین ایک فلکی نظام کے تحت طلوع ہوگا :۔ یہ نہیں ۔ کہ ایک دن وہ مشرق سے طلوع ہو ۔ اور دوسرے دن جنوب سے ۔ اور اِس طرح انسان کو پتہ ہی نہ چلے ۔ کہ کائنات کا نظام کیا ہے ؟ اور نہ اِس طرح طلوع ہوگا ۔ کہ ایک دن صبح چھ بجے نکلے اور دوسرے دن بارہ بجے ! لیکن انہی "سَخَّرَ لَكُمْ" الفاظ کے دوسرے معنی یہ ہیں ۔ کہ اِنسان کے لئے کائنات کا ذرّہ ذرّہ مسخر کر دیا گیا ہے ۔ گویا وہ اِس سے اپنی ضرورت کے مُطابق کام لے سکتا ہے !

اَب یہ تسخیر دو قسم کی ہے ۔ ایک مادی اور دوسری رُوحانی :۔ مادی تسخیر کی ابتدائی مثال یہ ہے ۔ کہ گھوڑا اور ہاتھی انسان کے لئے "مسخّر" کئے گئے ہیں :۔ اِس سے بڑھ کر اور اُونچی "مادی تسخیر" وہ ہے ۔ جو موجودہ سائنس نے ریل یا ہوائی جہاز کی صورت میں کی ہے ۔ لیکن ان سے بھی اُوپر ایک اور "رُوحانی تسخیر" ہے :۔ یہ تسخیر مشروط ہے ۔ کہ انسان پہلے سلیم الفطرت ہو ۔ اور پھر تقوے کی ایک خاص منزل تک پہنچ چکا ہو :۔ یعنی رب العزت نے جو قوانین قرآن کے ذریعہ نازل فرمائے ہیں ۔ اور اُس کے آخری رسول ؐ نے اُن قوانین پر جس طرح عمل فرمایا ہے اُس سُنّت کا پوری طرح تابع ہو :۔ یا یوں کہیئے کہ ایمان کے لحاظ سے وہ نہ صرف صحیح العقیدہ ہو ۔ بلکہ راسخ العقیدہ ہو ۔ اور سُنّت کی پیروی کے لحاظ سے وہ ایسا فنافی الرسول ؐ ہو ۔ کہ ؎ "ہر رہگذر پہ نقشِ کفِ پائے یار دیکھ" اُس کا بنیادی اصول ہو :۔ یعنی وہ "شہادت گہِ اُلفت" کی سچی تصویر ہو ! جب اِن شرائط پر وہ پورا اترے گا ۔ تو پھر ؎

آگ اُس کے لئے "اندازِ گلستاں" پیدا کر سکتی ہے ! اور
اُس کی اپنی ہستی "بے نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے" !

اَب یہاں جو نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ اِس قسم کی تسخیر پیغمبروں اور رسولوں کے لئے تو ممکن ہے ۔ اور اُن کو یہ میسّر بھی ہوئی ۔ لیکن کیا یہ عوام النّاس کے لئے بھی ممکن ہو سکتی ہے ؟ اگر ہو سکتی ہے ۔ تو صحابۂ کرام کے لئے اِس قسم کی تسخیر ممکن ہونی چاہیئے تھی ۔ اور اگر اُن کو یہ میسّر تھی ۔ تو اُنہوں نے اِس سے کام کیوں نہ لیا ؟

اِس آخری سوال کا جواب مختصراً یہ ہے ۔ کہ اگر اِس قسم کی تسخیر کو صحابۂ کرام کے زمانہ میں روزمرہ کے کاموں کے

---

[1] سورۃ ۳۱ لقمٰن ۔ آیت ۲۰

لیے استعمال میں لایا جاتا۔ اور یہی سلسلہ پھر اولیائے کرام بھی جاری رکھتے۔ تو "منشین کے زمانہ" کا انعقاد ہی ناممکن تھا!
چونکہ منشیتِ ایزدی میں یہ تھا۔ کہ "منشین کا زمانہ" اپنے پورے جوبن میں ظاہر ہو۔ لہٰذا رسولِ پاکؐ کے زمانہ
میں تو اس قسم کی تسخیر محض گاہے بگاہے جھلکتی رہی :۔
مثلاً معراج کے وقت حضورؐ کا عرشِ بریں پر جانا اور پل میں واپس آنا کیا ظاہر کرتا ہے؟ نہ صرف یہ کہ ؎

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں!

بلکہ

عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

اور یہ اس لیے کہ "احسنِ تقویم" کی تفسیر یہ نہیں ہے۔ کہ انسان ہوائی جہازوں کا موجد بنتا رہے۔ بلکہ انسان کی اپنی ہستی ؎

پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے!

لیکن وہ "درخشندہ ستارے" جن کی تعلیم "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" اور "اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"[1] کے بعد تکمیل کو پہنچی۔ اُن کو متنبہ کر دیا گیا۔ کہ چونکہ "منشین کے زمانہ" کے انعقاد کے لیے کرامات کی رموز کو اخفا میں رکھنا لازمی تھا۔ لہٰذا اوّل تو حسن کی "ادائیں"[2] ظاہر ہی نہ ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی۔ تو اُن کی آواز نہ ہو!
چنانچہ "یَاسَارِیَۃُ الْجَبَل" کی آواز یا اُس کے بعد بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے والی چند کرامات کے علاوہ اور کوئی ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے۔ جن سے موجودہ زمانہ پر کوئی خاطر خواہ اثر پڑتا :۔
لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ صحابہ کرامؓ اور اولیائے کرامؒ کی زندگیوں کو بدقتِ نظر مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگر انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کو ایک "چھلکتے ہوئے پیمانے" سے تشبیہ دی جائے۔ تو "طائرانِ حرم" کے متعلق بھی یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُن کی زندگیاں بھی ؎

ملتی جلتی ہیں چھلکتے ہوئے پیمانے سے!

اسی وجہ سے حضورؐ نے اپنے حقیقی علماء کے لیے یہ الفاظ استعمال فرمائے :۔

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَآئِیْل

(یعنی میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہوں گے!)
بنی اسرائیل کے انبیاءؑ میں دو صفتیں پائی جاتی تھیں۔ یعنی :۔
(۱) وہ خدا رسیدہ تھے۔ اور

---

[1] سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۳

[2] کرامات

(۲) وہ صاحبِ معجزہ تھے :۔

بالکل اسی طرح حضورؐ کی امت کے حقیقی علماء (یعنی خدارسیدہ بزرگوں) میں بھی دو صفتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی :۔

(۱) وہ عارف ہوتے ہیں۔ اور

(۲) وہ صاحبِ کشف و کرامات ہوتے ہیں!

انہی کے بارہ میں کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[۱] کے الفاظ قرآن میں آتے ہیں :۔ یہی وہ ہستیاں ہیں۔ جو حقیقی اسلام کی روحِ رواں ہیں۔ اور یہی بزرگ دراصل ناموسِ رسولؐ کی صحیح معنوں میں لاج رکھنے والے ہیں!

اس سلسلہ میں اب پہلا سوال یہ ہے۔ کہ حضورؐ نے ان عارفوں کو نیست سے ہست یعنی معرضِ وجود میں لانے کے لئے کیا تدابیر اختیار فرمائیں؟ یہ ایک نہایت روح افزا کہانی ہے۔ جو یہاں سنانی لازمی ہے :۔

جب قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی :۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا[۲]

(سورۃ ۳۳ الاحزاب۔ آیت ۵۶)

نوجوان نثاروں نے پوچھا۔ کہ وہ حضورؐ پر کن الفاظ میں درود بھیجیں؟ اس کے جواب میں حضورؐ نہایت آسانی سے یہ فرما سکتے تھے۔ کہ :۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ[۳]

کہہ لیا کرو۔ لیکن نثار ہوجیئے اُسی اُمّیؐ رسول کی شفقت پر، اور قربان جائیے۔ رحمۃ للعٰلمین کے اُس احسان پر جو آپ نے تمام نوعِ انسانی پر اس طرح فرمایا۔ کہ نماز والے درود میں صرف اوپر کے الفاظ ہی استعمال نہ فرمائے۔ بلکہ اپنے نام مبارک کے ساتھ :۔

وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ[۴]

کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا! چنانچہ اس وقت حضورؐ پر نثار ہونے والے جتنے بھی پروانے ہیں۔

---

[۱] سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۱۰ (یعنی تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے)

[۲] تحقیق اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے نبی صلعم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی اُن پر درود اور خوب سلام بھیجو :۔

[۳] اے اللہ محمدؐ پر درود بھیج

[۴] اور محمدؐ کی آل پر جیسی کہ تو نے رحمت فرمائی ابراہیم پر اور آل ابراہیم پر

Marfat.com

(اَور یہ ظاہر ہے۔ کہ ان میں سب سے اوپر اولیائے کرامؒ اَور اہل اللہ ہی ہیں) ۔ اُن پر ہر فرض ۔ سُنّت اَور نفل نماز کے موقع پر ہر نمازی یہ درُود بھیجتا ہے ۔ کہ اے اللہ! ان بزرگ ہستیوں پر اپنی رحمت اَور برکت بھیج ۔ ایسی رحمت اَور برکت جیسی کہ تُو نے ۔

حضرت ابراہیمؑ پر فرمائی !

حضرت موسیٰؑ پر فرمائی !

حضرت سلیمانؑ پر فرمائی ! اَور

حضرت عیسیٰؑ پر فرمائی !

اب یہ ظاہر ہے ۔ کہ رب العزّت نے ان انبیاء علیہم السلام پر کس قسم کی رحمت و برکت فرمائی ؟

حضرت ابراہیمؑ پر یہ رحمت فرمائی ۔ کہ اُن کے لئے آگ گلزار بنی !

حضرت موسیٰؑ پر یہ رحمت فرمائی ۔ کہ اُن کے لئے پانی پھٹ گیا ۔ اَور وہ اُس میں سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بخیر و خوبی گزر گئے !

حضرت سلیمانؑ پر یہ رحمت فرمائی ۔ کہ ہوا اُن کے لئے مسخر کر دی گئی !

حضرت عیسیٰؑ پر یہ رحمت فرمائی ۔ کہ اُنہوں نے کوڑھیوں کو اچھا کیا ۔ مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں ۔ یہاں تک کہ مردُوں کو زندہ کیا !

بالکل اسی قسم کی رحمت اَور برکت اس وقت بھی "آلِ محمدؐ" (یعنی اولیائے کرام) پر ہو رہی ہے ! اَور آئندہ قیامت تک ہوتی رہے گی !

چنانچہ اسی لئے حضرت ہجویریؒ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ارشاد فرماتے ہیں ۔ کہ کوئی زمانہ بھی خدا رسیدہ ہستیوں کے بغیر نہیں گزرا ؛ وہ ہمیشہ رہے ۔ اس وقت ہیں اَور ہمیشہ رہیں گے ؛ بلکہ آپ نے یہاں تک واضح فرما دیا ۔ کہ ان برگزیدہ ہستیوں کی ایک باقاعدہ حکومت ہے ۔ اَور اُس حکومت کی تشکیل یُوں ہے ۔ کہ اُن میں جو زیادہ مشہور ہیں ۔ اُن کی تعداد تین سو ہوتی ہے ۔ وہ اخیار کہلاتے ہیں ؛ اُن کے اوپر چالیس ہوتے ہیں ۔ جو ابدال کہلاتے ہیں ؛ اُن کے اُوپر سات ہوتے ہیں ۔ جو ابرار کہلاتے ہیں ؛ اُن کے اوپر چار ہوتے ہیں ۔ جو اوتاد کہلاتے ہیں ؛ اُن کے بھی اوپر تین ہوتے ہیں ۔ جو نقبا کہلاتے ہیں ؛ اَور ان سب کے اوپر ایک ہوتا ہے ۔ جو قطب یا غوث کہلاتا ہے !

چنانچہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ۔ موجودہ "مشین کا زمانہ" جب اپنی مقررہ گردش پوری کرنے کے بعد نقطہ ع (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ۵۸) پر پہنچا ۔ اَور "آلِ محمدؐ" کا ظہور ہُوا ۔ یعنی یہ سب اخیار ۔ ابدال ۔

Marfat.com

ابرار۔ اوتاد۔ نقبا اور غوث یا قطب انسانیت کی ہدایت کے لئے "صفحہ ہستی پر نمودار ہوئے۔ تو موجودہ "مشین کے زمانہ" کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ایک نیا دور شروع ہوگا۔ جس کو آسانی کے لئے "رُوحانی زمانہ" کہ لیجئے:

اُس وقت پھر "خلافت الٰہیہ" جو "ملوکیت" کو آگے لانے کی خاطر "پس پردہ" کر دی گئی تھی۔ پھر رُونما ہو جائے گی!

یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ کہ آئندہ دنیا میں کسی "نئی خلافت الٰہیہ" نے قائم ہونا ہے، بلکہ یہ "قائم شدہ" ہے۔ اور صدیوں سے "رونقِ محفل" ہے۔ لیکن "پسِ پردہ"!

اس حکومت کے پاس نہ ٹیلیفون ہے۔ نہ تار برقی! لیکن اس کے باوجود اس حکومت کا ہر فرد سورج کو آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ اور چاند کو شق کر سکتا ہے! اور یہی "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی صحیح تفسیر ہے! (اس کی تفصیل باب ششم میں آئے گی):

موجودہ زمانہ میں صورت یہ ہے۔ کہ اگر کسی کو ایک چھوٹی سی بات کا بھی علم ہو جائے۔ تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا میں اُسے مشتہر کر دیتا ہے:

لیکن اِس حکومت کا حال یہ ہے کہ دُنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھتی ہے! سمجھتی ہے! جانتی ہے! لیکن مُنہ سے ایک لفظ نہیں کہتی!

وہ محسوس کرتی ہے۔ کہ موجودہ دُنیا کی تمام "صنّاعی" "چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے۔ لیکن لب تک نہیں ہلاتی!

حیران و ششدر ہے! اس لئے کہ ؎

جنہیں خبر نہیں، آئینِ میکدہ کیسا ہے؟
یہ کیا غضب ہے کہ وہ مینا و جام کھنکائیں!

لیکن نہ حرکت کرتی ہے! اور نہ جُنبش میں آتی ہے!!

کیا دنیا میں ضبط اور "آئینہ جیسی خاموشی" کی کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے؟ یا وقار اور تنظیم کی کوئی ایسی نظیر پیش کی جا سکتی ہے؟

اس حکومت کا نہ کوئی دفتر ہے۔ اور نہ کوئی دفتری کارروائی! اس کا تمام آئین صرف "سُنّت" کے ایک لفظ میں مضمر ہے!

یہ صرف حضورؐ کے "اشاروں" پر چلتی ہے!

Marfat.com

اقبال نے اپنے "شکوہ" میں اسی حکومت کے "مردِ کامل" کو ان الفاظ میں صدا دی ہے ؎

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی!

غرض جب اس "مردِ کامل" کی سرکردگی میں "خلافتِ الہیہ" ایک دفعہ پھر "بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی"۔ تو اُس وقت موجودہ کائنات کی "مادی تسخیر" جو اس وقت سائنس کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اُس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور کائنات کی "روحانی تسخیر" عمل میں آئے گی! اُس زمانہ میں پھر "نمرود کی آگ" بیکار ہو جائے گی۔ اور ہر سلیم الفطرت شخص آپ اپنا "سلیمان" اور آپ اپنا "عیسیٰ" ہوگا! وہ زمانہ پھر "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کی زندہ تفسیر ہوگا!

اس نظریئے کے ثبوت کے لئے "نماز والے درود میں لفظِ کما" پر غور کرنے کی ضرورت ہے:۔ اس لفظ سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

(۱) اسلام کی دعاؤں کا لُبِ لباب یہ ہے۔ کہ "آلِ محمدؐ" یعنی حضورؐ کے تمام امتی آخر کار کَمَا اَبْرَاھِیْم اور کَمَا آلِ اَبْرَاھِیْم ہوں!

(۲) گویا اس سے ثابت ہوا۔ کہ "آلِ محمدؐ" کَمَا اَبْرَاھِیْم اور کَمَا آلِ اَبْرَاھِیْم ضرور ہو سکتی ہے!

(۳) اس سے یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ آلِ محمدؐ کی ایک تعداد اس وقت بھی واقعتاً کَمَا اَبْرَاھِیْم اور کَمَا آلِ اِبْرَاھِیْمَ ہے ورنہ نماز والا درود ہی بے معنی ہو جاتا ہے!

اب ہمیں جس بات سے اُلجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کے لوگ کہاں ہیں؟ کیونکہ "ابراہیم اور آلِ ابراہیم" اس دنیا میں ظاہر تھے "چھپے ہوئے نہیں تھے"!

اب یہ سوال کہ اس قسم کے لوگ ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ کیوں چھپے ہوئے ہیں؟ اور کب سے چھپے ہوئے ہیں؟ اس کی تشریح پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ یہاں اتنا اشارہ اور کافی ہے۔ کہ اگر وہ اخفا میں نہ رہتے۔ تو "مشین کے زمانہ" کا اجرا ہی ناممکن تھا۔ چونکہ (مثال کے طور پر) اگر آج کوئی "عیسیٰ" لاہور کے میو ہسپتال کے باہر بیٹھا ہوا ہو تو کیا کوئی مریض ہسپتال کے اندر جائے گا؟

Marfat.com

اِس سے قطع نظر، درُود میں لفظِ "کَمَا" کا ہی اقتضا یہ بھی ہے۔ کہ وہ "آلِ محمد" (جو "کَمَا ابراہیم" اور "کَمَا آلِ ابراہیم" ہو۔ وہ) ظاہر بھی ہو کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ ابراہیم اور آلِ ابراہیم اِس دنیا میں چھپے ہوئے نہیں تھے! گویا اس سے ثابت ہُوا۔ کہ اِس پائے کی خاص "آلِ محمد" کا ظاہر ہونا "کَمَا" کے لفظ کا لازمی اقتضا بھی ہے! چنانچہ حضرت اقبال کے قلب پر جب اِس "نقش" کا انکشاف ہُوا۔ تو وہ متعجب ہو کر چلا اُٹھے ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

غرض دُنیا کے ڈرامہ میں وہ کارنامے جو "رُوحانی زمانہ" میں انجام پائیں گے۔ اور جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ (مثلاً دنیا جہان کی مشینوں کا چلتے چلتے رُک جانا) ان کی تہ میں راز یہ ہے۔ کہ "حسُن" کو کچھ مزہ ہی اِس بات میں آتا ہے۔ کہ انسان کا "عدو مبین" پہلے اپنی حسرت کو پوری طرح نکال لے۔ یعنی اپنے "کید" کے دام کو پوری طرح بچھائے۔ اور جب یہ بچھ جائے تو پھر "حسُن" اپنی "اداؤں" سے اِس دام کو تہ و بالا کر دے۔ اُس کے کر کی کرکری کر دے۔ اور اُس کی تمام چالوں کو تہس نہس کر دے!

چنانچہ حضرت نوحؑ کے وقت جب انسانیت کے "عدوِ مبین" نے پوری کی پوری قوم کو ساڑھے نو سو سال تک ورغلائے رکھا۔ تو "حسُن" جو ہمیشہ اپنی "اداؤں" کے لئے مشہور ہے۔ "برہم" ہو گیا۔ اور اس برہمی نے قہاری کی ایسی صورت اختیار کی۔ کہ سوائے چند انسانوں اور جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے، تمام مخلوق زیرِ آب غرق ہو گئی!

پھر جب حضرت ابراہیمؑ کے وقت "عشق" "آتشِ نمرُود" میں کُود پڑا۔ تو "عقل" کی ایسی کرکری ہوئی۔ کہ وہ "محوِ تماشائے لبِ بام" ہی رہ گئی!

بالکل اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے وقت جب فرعون نے فرعونیت دکھائی۔ تو "حسُن" کی "جفا" جباریت کے رنگ میں ظاہر ہوئی؛ لیکن ساتھ ہی "ادا" نے بھی ایسے کرشمے دکھائے۔ کہ فرعون کے تمام ساحر منہ کے بل گر کے "ھُوَ اللہُ احد" کہنے پر مجبُور ہو گئے!

یہاں ایک خاص نکتہ جو غور طلب ہے۔۔ وہ یہ ہے۔ کہ "تدریجی ارتقا" کے اصول کے ماتحت "رقیب" آہستہ آہستہ پسپا ہی ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے وقت "حسُن" کی "ادائیں" ہی "ادائیں" تھیں۔ "برہمی" ختم ہو گئی۔ اور اُس کے ساتھ "جفائیں" بھی!

اور جب اپنے حبیبؐ کا وقت آیا۔ تو اگر ایک طرف "عشق" نے چاند کو شق کیا۔ تو دوسری طرف فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کی بیتابی نے "حسُن" کو ایسا مجبُور کیا۔ کہ "قابَ قوسین" کی قُربت تک نوبت پہنچی! گویا "دیدارِ الہیٰ" کی فراوانی ہوئی!

"جھوٹے نگوں" کی "صنّاعی" کو فروغ! اور شاعرِ اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے تخیّل کی افتاد میں فرق!!

اب اِن "اداؤں" سے انسانیت کا عدوِ مبین گھبراتا نہ تو کیا کرتا؟ گڑگڑایا۔ کہ "شمع" کے "پروانوں" کو پس پردہ کر دیجیے۔ تاکہ اُس کو بھی موقع ملے۔ کہ وہ "جھوٹے نگوں" کی "ریزہ کاری" سے ایک ایسی "صنّاعی" کو فروغ دے۔ کہ اچھے اچھوں کی نظریں ایک دفعہ تو "خیرہ" ہو کر رہ جائیں! چنانچہ ایسا ہی ہُوا! سطح بیں نظریں اِس "صنّاعی" سے ایسی "خیرہ" ہوئیں کہ اُنہوں نے "حُسن" کی "اداؤں"[1] سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا! چنانچہ سرسیّد نے "حُسن" کی "ہر ادا" کی تأویل کی![2]

---

[1] اِن سے معجزات مراد ہیں :

[2] رسالہ "نگار" (کراچی) بابت مارچ اپریل ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر شرف الدین (اُستاد شعبہ اُردو سندھ یونیورسٹی) نے ایک مضمون زیرِ عنوان "سرسید کے سیاسی افکار" لکھا ہے۔ جس میں وہ اِس طرح رقمطراز ہیں :۔

"علی گڑھ کالج کی تاسیس و تعمیر اور اُس کے ذریعے ایک خاص قسم کے نظامِ تعلیم کی ترویج' مخصوص لباس کا التزام' عقیدۂ قومیّت کی اشاعت' اصلاحِ معاشرت کی کوشش' اِن سب کی تہ میں سیاسی جذبہ کارفرما تھا۔ حتیٰ کہ مذہبی اصلاح کی طرف بھی وہ اِس لئے مائل ہوئے کہ مسلمانوں کا موجودہ تصورِ مذہب مانعِ ترقی اور سرسیّد کے قومی مقاصد کی راہ میں حائل تھا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سرسیّد کی سیاست خود غرضی یا مفاد پرستی سے عبارت نہ تھی۔ بلکہ بنیاد ایثار' خلوص' خدمتِ خلق اور قومی بھلائی کے جذبہ پر رکھی گئی تھی :"

مندرجہ بالا خط کشیدہ الفاظ اِس نکتہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہ سرسیّد نے ہر معجزے کی تأویل کیوں کی؟ اِسی سلسلہ میں پھر آگے چل کر مضمون نگار سرسیّد کے رسالہ "بغاوتِ ہند" کے متعلق لکھتے ہیں :۔

۱۸۵۷ء کی نہضت کے متعلق عام طور پر تین قسم کے نقطہ ہائے نظر ظاہر کئے گئے ہیں : ایک نقطۂ نظر حکمراں قوم انگریز کا تھا۔ جس نے اُسے غدر سے تعبیر کر کے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو مشقِ ستم کا نشانہ بنایا : دوسرا نقطۂ نظر قوم پرستوں کا ہے۔ جنہوں نے اُسے جنگِ آزادی' جہاد اور تحریکِ حریّت جیسے مقدس ناموں سے یاد کیا : سرسیّد نے جس تیسرے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی۔ وہ اوّل الذکر دو رایوں کے درمیان کا راستہ ہے : یہ تیسرا نقطۂ نظر حقائق اور واقعات کی روشنی میں کہاں تک صائب ہے۔ اِس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس امر سے انکار نہیں۔ کہ اُس وقت کے پیچیدہ سیاسی ماحول میں یہی راہِ نجات تھی : سرسیّد نے .... فریقین میں جس کو جس حد تک قصور وار پایا۔ بلاکم و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰ پہ)

اس زنجیر کی دوسری کڑی یہ تھی۔کہ علامہ مشرقی نے "تذکرہ"[1] لکھا۔ اور آہستہ آہستہ نوبت بہ اینجا رسید۔کہ "ایک قرآن" کے "دو قرآن"[2] بن گئے! یہی نہیں بلکہ علامہ اقبال تک جو اپنے "عشق" کے لئے مشہور تھے۔"فلسفی" رنگ میں بھی ظاہر ہونے لگے۔چنانچہ جب وہ "عشق" کے رنگ میں ظاہر ہوتے تو فرماتے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی!
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

لیکن جب "فلسفہ" کے رُوپ میں ظاہر ہوتے۔تو پھر یوں گوہر افشانی فرماتے:۔

"The truth is that all search for knowledge is essentially a form of prayer. The scientific observer of Nature is a kind of mystic seeker in the act of prayer." (The Reconstruc-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹ کا)

کا ست و بدُل بیت و لعل صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا۔ البتہ بہ تقاضائے مصلحتِ وقت سرسید کا لہجہ آقا اور غلام کے لئے اُن کی حیثیتوں کے مُطابق مختلف ہے۔یعنی کمپنی بہادر اور انگریزی حکام کا جہاں نام آیا ہے۔ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔اور جہاں مجاہدین کا ذکر آیا ہے انہیں مفسد، نمک حرام، فتنہ پرواز اور وحشی کے خطابات دیئے ہیں:۔ اس رسالے میں سرسید نے غدر کو فوجی بغاوت قرار دے کر اُس کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے۔اور جس بات کو فساد کا اصلی سبب قرار دیا ہے۔لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانی کا شریک نہ کیا جانا ہے۔اور باقی دوسرے اسباب بھی ہیں مگر اُن کی نوعیت فروع کی ہے:"

ان اقتباسات میں خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:۔ مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اس وقت جتنی رُوحانی کمزوری پائی جاتی ہے۔وہ انہی بیجوں کا پھل ہے۔اور جو انہوں نے مادی ترقی کی ہے۔ وہ سرسید کے خلوص کا نتیجہ ہے!

[1] اس کتاب میں علامہ مشرقی نے صرف اس بات پر زور دیا ہے۔کہ کائنات کی "مادی تسخیر" جو اس وقت موجودہ سائنس کی ایجادات کے ذریعہ ہو رہی ہے۔وہی حقیقی اسلام ہے!

[2] اس سے مراد پروفیسر غلام جیلانی برق کی تصنیف "دو قرآن" ہے:۔ اس میں بھی صرف اس بات پر زور دیا گیا ہے۔کہ قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے۔کہ انسان کائنات کی "مادی تسخیر" کرے!

Marfat.com

tion of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal — Reprint March 1958, p.91).

(یعنی حقیقت یہ ہے۔ کہ علم کی جستجو ایک قسم کی عبادت ہے۔ اور ایک سائینسدان جو کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا تجزیہ کر رہا ہے۔ اُس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی "حسن" کی جستجو کرنے والا عبادت میں مشغول ہو!)

اگر یہ نظریہ واقعی حقیقت پر مبنی ہوتا۔ تو رُوس جیسا ملک جو آج سائنس کی صفِ اوّل پر کھڑا ہے۔ "حُسن" سے اس قدر باغی نہ ہوتا! چنانچہ رُوسی "خلاباز" ٹی ٹوو Titov نے ۱۹۶۴ء کے شروع میں جو اخبارات کو بیان دیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے:

"We must accomplish a special test in our sphere to bring striking proof that God dose not exist. When one plunges deeper and deeper into space, one sees, with absolute conviction, that there is no place for God either on earth or in the sky." (vide *Pakistan Times*, dated 1st February 1964).

(یعنی ہمیں اس مقصد کے لئے ایک خاص تجربہ کرنا چاہیئے۔ جو یہ حتمی ثبوت مہیا کرے۔ کہ اس دُنیا میں خدا کی ہستی مطلقاً موجود نہیں! جب ایک انسان خلا کی بے پناہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ تو وہ نہایت وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ خدا کی ہستی نہ زمین پر ہے۔ اور نہ آسمان پر! (دیکھو "پاکستان ٹائمیز" مورخہ یکم فروری ۱۹۶۴ء)۔

غرض اگر ایک سائنسدان کی مثال واقعی ایسی ہوتی۔ جیسے کوئی "حسن" کی جستجو کرنے والا "عبادت" میں مشغول ہو۔ تو خدا کی ہستی کا انکار ایسے وثوق کے ساتھ نہ کیا جا سکتا!

Marfat.com

لہٰذا جس نکتہ کو ڈاکٹر اقبال نے بدقسمتی سے نظر انداز کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک مادی ذرّوں کے تجزیہ کا تعلق ہے۔ وہ تو ایک "حسن" کا باغی بھی کر سکتا ہے۔ یعنی ریل یا ہوائی جہاز کے مُوجد کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ اُس میں کوئی "ایمانی حرارت بھی ہو۔ کیونکہ ایک خدا کا منکر بھی ویسا ہی ریڈیو کا مُوجد بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک خدا کو ماننے والا! چنانچہ علامہ اقبال سے جہاں چُوک ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے مقصدِ حیات تو "دیدارِ خدا" ہی سمجھا۔ [چونکہ اُنہوں نے اپنی مندرجہ بالا کتاب کے صفحۂ اوّل پر مقصدِ حیات "Direct Vision of Reality" (یعنی "دیدارِ الٰہی") ہی لکھا ہے] ۔ لیکن "ذرّات کی معرفت" کو "خدا کی معرفت" کا ذریعہ سمجھا! اس میں کچھ شک نہیں کہ جب ایک حساس سائنسدان ذرّات کا تجزیہ کرتا ہے۔ تو خدا کی بے شمار قدرتوں کو دیکھ کر اُس کی حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اور "خدا کی معرفت" کی راہ میں جو "حیرت" کا مقام ہے۔ وہ اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک اَن پڑھ مالی بھی پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ جب وہ ایک دن زمین میں بیج بوتا ہے۔ اور چند دن کے بعد دیکھتا ہے۔ کہ اُس ننھے سے بیج میں سے ایک نرم و نازک پھول پیدا ہو گیا ہے۔ جس کے رنگ و بُو کی دُنیا میں مثال نہیں۔ تو وہ حیرت کی تصویر بن جاتا ہے! لہٰذا اس مقام پر ہم نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد "خدا تک پہنچنا" ہے۔ "حیرت کے مقام تک پہنچنا" نہیں! تخیل کی اس افتاد کے نتیجہ کے طور پر ہم نے جو بات محسوس نہیں کی۔ وہ یہ ہے۔ کہ "حسن" کے دیدار کے لئے "عشقِ الٰہی" کی ضرورت ہے۔ کائنات کے ذرّوں کے تجزیہ کی ضرورت نہیں! کیونکہ "حسن" بھی بھلا کوئی "عنصر" ہے۔ کہ اُسے دُوربین کے ذریعہ دیکھا جا سکے۔ یا وہ کوئی "منزل" ہے۔ کہ جہاں خلائی جہاز کی سیڑھی لگا کر چڑھا جا سکے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ آج کل کی دُنیا نے "علم" کے لفظ کے صحیح مفہوم کو ہی نہیں سمجھا: موجودہ دنیا نے اس لفظ کی جو تعریف کی ہے۔ وہ اگر ایک طرف رکھ دی جائے۔ اور دوسری طرف حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کا مندرجہ ذیل مصرعہ۔ تو علم کی تعریف میں یہ ایک مصرعہ موجودہ زمانے کی لائبریریوں سے زیادہ وزنی نکلے گا یعنی ؎

علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است!

اسی سلسلہ میں عربی کا بھی ایک محاورہ ہے۔ جو نہایت ہی معنی خیز ہے۔ یعنی "اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرُ"[1] سعدی علیہ الرحمۃ کے مصرعہ اور اس عربی محاورہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو علم اُس "حسن" کو بے نقاب نہ کر سکے۔ جو اس دُنیا میں "مستور" ہے۔ وہ حجاب ہی حجاب ہے! اور یہ حجاب ہی پھر سب سے بڑی جہالت ہے!

---

[1] یعنی علم سب سے بڑا حجاب ہے!

Marfat.com

اب یہاں یہ نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ علم تو حجاب اُٹھاتا ہے۔ اور جہالت کو دُور کرتا ہے۔ یہ حجاب یا جہالت کس طرح بن سکتا ہے؟

اس دقیق مسئلہ کو صرف اُسی صورت میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ہم پہلے بالکل واضح طور پر اس نکتہ کو ذہن نشین کر لیں۔ کہ انسان کے جسم میں دو اعضا ہیں۔ جو با شعور ہیں۔ ایک دماغ اور دوسرا دل ؛

انسان کے دماغ میں عقل ہے۔ اور دل میں بصیرت ؛ عقل اور بصیرت میں فرق یہ ہے۔ کہ عقل صرف مادی شعور کا نام ہے۔ اور بصیرت رُوحانی شعور کو کہتے ہیں ؛

عقل آج کل کے دنیوی علوم کو پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بصیرت نیک کرداری اور خدا پر ایمان لانے سے حاصل ہوتی ہے ؛ (اس مسئلہ کی تفصیل "انسانی شعور" کے تحت باب چہارم میں آئے گی) ؛

جس طرح گذشتہ صفحات میں کہا جا چکا ہے۔ انسان کے "عدو مبین" نے جب یہ دیکھا۔ کہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد صرف "خدا کی معرفت" ہے۔ (جو نیک کرداری اور خدا پر ایمان لانے سے حاصل ہوتی ہے) اور اس "معرفت" کے نتیجہ کے طور پر یہ خاک کا پتلا نہ صرف چاند کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ بلکہ اُس کی رُوحانی ترقی "قاب قوسین" کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ تو اُس کو یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ بنی نوع انسان کو ہر وقت کسی ایسے کام میں مشغول رکھا جائے۔ جس میں نہ سجدہ رہے نہ مسجود!

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُس کو دماغ کی نشو و نما کی سُوجھی۔ اور اس سلسلہ میں اُس نے چال صرف یہ چلی۔ کہ دل جو رب العزت کی تجلیوں کی آماجگاہ ہے۔ اُس کے متعلق تو سبق یہ پڑھایا۔ کہ وہ تو محض "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ اور بس! اور پھر صرف دماغ کی نشو و نما کی ہی ترغیب دی!

لیکن آج کل کی دُنیا جس راز کو عام طور پر سمجھ نہیں سکی۔ وہ یہ ہے۔ کہ دماغ میں خیر و شر یا نیک و بد میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔ یہ تمیز صرف انسانی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام انسان کا دل ہے۔ دماغ نہیں! اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ اگر ہم ریاضی کے مشکل سے مشکل سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ تو ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنے دماغ پر زور ڈال رہے ہیں۔ اور وہ اس بوجھ سے پھر تھک بھی جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم کوئی خوشی یا غم کی خبر سنیں۔ تو اُس وقت مسرت یا راحت دل ہی کو پہنچتی ہے۔ اور غمگین بھی دل ہی ہوتا ہے۔ دماغ نہیں۔ چونکہ دماغ میں نہ حس ہے، نہ جذبہ! نہ لگاؤ ہے، نہ ہمدردی! نہ محبت ہے، نہ عشق!

اسی وجہ سے دل اور دماغ کی نشو و نما میں فرق یہ ہے۔ کہ دل کی نشو و نما اخلاقِ حمیدہ اور خدا پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ [اس کی تشریح بھی باب چہارم (فصل انسانی شعور) میں آئے گی]۔ لیکن دماغ کی نشو و نما کے لئے صرف موجودہ مادی علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ خواہ انسان میں اخلاقِ حمیدہ ہوں یا نہ ہوں۔ خدا پر ایمان ہو۔ یا نہ ہو! اسی

Marfat.com

لئے ایک انسان، خدا کو ماننے کے بغیر اور کسی نیک عملی کے بغیر بہتر سے بہتر ریاضی دان یا سائنسدان تو بن سکتا ہے، لیکن "زندگی، بے بندگی، شرمندگی" کے راز کو نہیں سمجھ سکتا! یہ اس وجہ سے ہے کہ آج کل کی "آزاد" یا "عُریاں" زندگی میں "شرمندگی" تو ایک انسان صرف اُس صورت میں ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جب وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے! لیکن ہم یہ اُوپر پڑھ آئے ہیں۔ کہ آج کل کا "آزاد" انسان اپنی تمام "قابلیت" اپنے دماغ کو موجودہ دنیوی علوم سے نشو و نما کر کے حاصل کرتا ہے۔ اور انسانی دماغ میں یہ اہلیت ہی نہیں۔ کہ وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ یہ خصوصیت صرف انسان کے دل یا قلب میں ہے۔ جس کو آج کل کی دُنیا محض "خون کے دوران کا آلہ" سمجھ رہی ہے!

اب چونکہ انسانی دماغ کی نشو و نما موجودہ مادی علوم سے ہی ہوتی ہے۔ اور اس نشو و نما سے ایک انسان صرف مادی ترقی ہی کر سکتا ہے۔ اور اس مادی ترقی سے انسان کو اپنی تمام مادی ضروریات اور سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ لہٰذا اس وقت کے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ تقویٰ و پرہیز گاری کی!

یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل کی تعلیم یافتہ دنیا کسی قسم کی عبادت کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اور ایک انسان کے لئے یہی سب سے بڑا حجاب اور یہی سب سے بڑی جہالت ہے!

اب چونکہ ان حالات میں ایک بے بصیرت انسان کو دنیا تو پوری طرح حاصل ہو جاتی ہے۔ اور خدا کی اُسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے اس وقت کے انسان کو اس بات کی فرصت ہی نہیں کہ وہ سنّت کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس طرح "ڈاڑھی و عمامہ" یا "حجاب و نقاب" کے مخمصوں میں پھنسے!

اس کا اب نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت کی انسانیت دُنیاوی ترقی کے لحاظ سے تو مٹی کے چراغ سے بجلی تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن رُوحانیت کے لحاظ سے بالکل کوری ہے!

اور یہی انسان کے "عدوِ مبین" کا حقیقی مقصد تھا۔ کہ انسان اپنے دماغ کی نشو و نما کر کے بیل گاڑی سے تو خلائی جہاز تک پہنچ جائے۔ لیکن اُس کا دل جو رب العزت کی تجلیات کی آماجگاہ ہے۔ وہ بالکل ظلمت میں ہی رہے!

لیکن یہاں جو نہایت عجیب بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ شاعر اقبال کو اس دقیق نکتہ کا پوری طور پر علم تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کلام میں نہایت واضح طور پر فرماتے ہیں ؎

عقل گو آستاں سے دُور نہیں۔ اُسکی تقدیر میں حضور نہیں!

یہاں عقل سے مراد "دماغ" ہے۔ کیونکہ اسی لئے وہ اسی شعر کے آگے نہایت پتہ کی بات کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب!

Marfat.com

کیوں؟ اس لئے کہ ے

آنکھ کا نُور دل کا نُور نہیں!

لیکن اس کے باوجود بھی اقبال جب فلسفہ کے "رُوپ" میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں۔ کہ ایک سائنسدان کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی "حسن" کی "جستجو" کرنے والا "عبادت" میں مشغول ہو! اور اس نکتہ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ چونکہ انسانی دماغ میں نہ کسی قسم کی حس ہے۔ نہ جذبہ۔ لہٰذا وہ تو بالکل ایک مشین یا آلہ کی طرح ہے۔ جو حساب کے سوال تو درست نکال سکتا ہے۔ یا ریڈیو کا مُوجد تو بن سکتا ہے۔ لیکن خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ اُس کی تقدیر میں "حضوری" ہے ہی نہیں!

ان حالات میں دماغ خواہ وہ کسی سائنسدان کا ہو یا ایک عام آدمی کا۔ وہ تو بہر حال "حجاب" میں ہی رہے گا!

اب جو شعُور (یعنی دماغ) ہر وقت "حجاب" میں ہی رہتا ہے۔ اور جس کی تقدیر میں "حضوری" ہے ہی نہیں۔ وہ کسی قسم کی "عبادت" میں کس طرح مشغول ہو سکتا ہے؟

چنانچہ انسان کے "عدوٌ مبین" نے اِس زمانہ میں صرف چال ہی یہ چلی ہے۔ کہ آج کل کا انسان اپنے دماغ کی پوری طرح نشوونما کر کے مٹی کے چراغ سے تو بجلی تک پہنچ جائے۔ لیکن اسی بجلی کی "چمک" سے اُس کی نظر ایسی "خیرہ" ہو۔ کہ وہ "ذرات کی معرفت" کو ہی "خدا کی معرفت" سمجھنے لگے!

اسی لئے قرآن کے بیسویں صدی کے "نئے" "مفسرین" اب اسی نظریئے کے شیدائی ہیں! اس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی (دیکھو فصل "انگریزی دان علماء")

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ڈاکٹر اقبال سے جب بھی کبھی کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ تو شاعر اقبال کس طرح اُس کی تصحیح کر دیتے ہیں؟ اس طرح پھر یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ شاعر اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے فکر کی افتاد میں بعض مقامات پر کتنا نمایاں فرق ہے؟[1]

اب یہاں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" والا نظریہ منطق، فلسفہ یا مذہب کی رُو سے خواہ کتنا ہی دُرست اور معقول کیوں نہ ہو۔ کیا موجودہ صورتِ حالات میں سائنس کی ترقی کی طرف سے ہماری (خاص کر پاکستانیوں کی) ذرہ بھر بے توجہی بھی خودکشی کے مترادف نہیں؟ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو لڑائی ہوئی ہے۔ اور اُس میں پاکستان کی فوج نے جس بہادری اور شجاعت

---

[1] اس کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۹۷ تا ۸۵

Marfat.com

کا ثبوت دیا ہے۔ کیا یہ دلیری اور مردانگی ممکن ہوتی۔ اگر پاکستانی فوج کے پاس وہ اسلحہ نہ ہوتا۔ جو آج کل کی سائنس نے مہیا کیا ہے۔ اور اُس اسلحہ کے استعمال کی ویسی جنگی مہارت نہ ہوتی۔ جس کا کہ موجودہ زمانہ مقتضی ہے!

اِس سلسلہ میں جس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ اِن صفحات کا مقصد موجودہ سائنس کی ترقی کو ٹھکرانا نہیں ہے۔ اور نہ دنیوی علوم سے بے توجہی کا مشورہ دینا ہے۔ بلکہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کی غیر موجودگی میں یہاں تک کہا جا سکتا ہے۔ کہ اِس زمانہ کی حیرت انگیز ایجادات "بیسویں صدی کے معجزے" ہیں! لہٰذا جس محنت، جانفشانی اور جد و جہد سے یہ ترقی حاصل کی گئی ہے۔ وہ داد کے قابل ہے۔ لیکن آج کل کی ایجادات کو صرف اِسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا درست نہیں ہے! کیونکہ جس طرح تصویر کا ایک رُخ ہم نہایت اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔ اُسی طرح تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہماری نظروں کے عین سامنے ہونا چاہیئے!

لہٰذا اِس وقت زیرِ بحث سوال صرف یہ ہے۔ کہ اسلام کائنات کی کس قسم کی تسخیر کا حامی ہے؟ اور اُس خاص قسم کی تسخیر کے سامنے "موجودہ" "مادی تسخیر" کی پوزیشن کیا ہے؟

اِن دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔ کہ اسلام کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کا حامی ہے۔ اور اِس قسم کی تسخیر کے سامنے "موجودہ" "مادی تسخیر" بازیچۂ اطفال ہے!

لہٰذا موجودہ علوم کی دھاک صرف اُس وقت تک ہی ہے۔ جب تک کہ "مشین کے زمانہ" کی مہلت ختم نہیں ہوتی: جب یہ ختم ہو گئی۔ تو اِن علوم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پھر صرف اُن علوم کی قدر ہوگی۔ جو "معرفتِ الٰہی" میں ممد و معاون ہوں گے۔ اور یہی حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کے مصرعہ ؎

علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است!

کی صحیح تفسیر ہے۔ کیونکہ جہاں تک مادی علوم کا تعلق ہے۔ اِن کے ذریعہ ایک انسان ہوائی جہاز کا موجد تو بن سکتا ہے۔ لیکن "خدا رسیدہ" نہیں ہو سکتا: لہٰذا ہمیں یہ نہایت واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اسوقت کے تمام دنیوی علوم "شرِ ناگزیر (یعنی necessary evil:) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ یہ "عبادت" کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور نہ اِنہیں "مقصدِ حیات" سمجھنا چاہیئے!

غرض اگر ہم دنیا کی موجودہ بے رہروی کا صحیح سُراغ لگانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں دنیا کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی: حقیقت یہ ہے۔ کہ عشق کے سردارِ اعظمؐ کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ہی صرف یہ تھا۔ کہ وہ "محبت" جس کا آغاز حضرت آدمؑ کے وقت ہوا تھا۔ وہ انجام کار اپنی "معراج" کو پہنچے! یعنی "خدا کی معرفت" کے نتیجہ کے طور پر "خدا کا دیدار" ہو! چنانچہ "یار کے دیدار" کی منزل اِس وقت کسی تجرباتی مراحل کے دَور میں نہیں ہے۔ کہ وہ موجودہ

Marfat.com

سائنس کی محتاج ہوا! چودہ سو سال ہوئے۔ یہ منزل طے ہو چکی ہے۔ اور اس شان سے طے ہو چکی ہے۔ کہ اب ڈھونڈے سے بھی اُس کی نظیر نہیں ملتی!

آئیے۔ اب اِس افسانہ کو ذرا مختصر الفاظ میں دُہرائیں۔ کہ یہ منزل آخر طے کس طرح ہوئی تھی؟

واقع یہ ہے۔ کہ "حسن" نے جب آشکار ہونا پسند کیا۔ اور حضرت آدمؑ اِس حُسن کی تجلیات سے ایک وقت تک بہرہ اندوز بھی ہوئے۔ تو ایک لغزش کی وجہ سے زمین پر پھینک دئے گئے؛ اور تجلیات سے بہرہ اندوز ہونے کا سلسلہ یکدم منقطع ہو گیا! پھر حکم یہ ہوا۔ کہ اب انسانیت نئے سرے سے "حسن" کی تاب لانے کی قدرت پیدا کرے!

چنانچہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے پہلے انسانیت محض "طفلِ مکتب" کی حالت میں رہی! البتہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے انسانیت ذرا "جوبن" پر آنا شروع ہوئی؛ چنانچہ آزمانے کے لئے کہ انسانیت ابھی "حسن" کی تاب لا سکتی ہے یا نہیں۔ "حسن" نے ایک دفعہ یونہی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے! لیکن آہستہ آہستہ انسانیت نے ایسی ترقی کی۔ کہ جب عشق کے سردارِ اعظمؐ کا وقت آیا۔ تو دیدار کی فراوانی اتنی ہوئی۔ کہ "قَابَ قَوْسَیْنِ"[1] تک نوبت پہنچی!

چنانچہ عشق کے سردارِ اعظمؐ کی سُنّت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ وہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑ دیتی ہے! گویا "دیدارِ الٰہی" کا راز محض عشق کے سردارِ اعظمؐ کی سُنّت کی پیروی میں مضمر ہے۔ کسی سائنس کی لبارٹری (Laboratory) میں ذرّوں کے تجزیہ کرنے میں نہیں!

لیکن چونکہ ہم نے اِس راز کو نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے سنّت کے معنی صرف یہ لئے، کہ ایک انسان منہ پر ڈاڑھی رکھے۔ اور نماز پڑھتے وقت پاجامہ ٹخنوں سے اُوپر کرے۔ لیکن یہ بات کہ اِس سنّت کی پیروی سے آخر کار انسان کو "خدا رسیدہ" ہونا چاہئے۔ اس سے بالکل بے خبر رہے! اور دوسرے گروہ نے اِن باتوں کو "دقیانوسی" سمجھ کر "کرزن فیشن" کو ترجیح دی! یہی نہیں۔ بلکہ "ذرات کے تجزیہ" کو ایک قسم کی "عبادت" سمجھ لیا!

مغربی ممالک کے لوگوں کی حیرت انگیز ایجادات کو دیکھ کر ہم نے جس نکتہ کو نظر انداز کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے یہ دیکھنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی۔ کہ جس دماغ کی نشوونما میں اس وقت دنیا مشغول ہے۔ اُس کی تقدیر میں تو "حضوری" ہے

---

[1] سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۹ (یعنی اللہ تعالیٰ کے جلوے اور محبوبؐ میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا)

Marfat.com

ہی نہیں۔ لہذا ہمارا مقصدِ حیات محض ہوائی جہازوں میں اُڑنا نہیں ہے۔ بلکہ "عشقِ الٰہی" ہے!

غرض خیالات کی اس غلط افتاد کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہمارے لب پر تو "ذکرِ حجاز" ہی رہا۔ لیکن دل میں "لندن کی ہوس" نے جگہ کر لی۔ اور آخر کار صرف "ذرّات کے تجزیہ" کی توفیق ہی ہم سب پر چھاگئی! اور اس طرح "عشقِ الٰہی" کی جگہ پہلے "فلسفہ" نے لی۔ اور پھر "سائنس" نے!

آئیے۔ اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں۔ کہ یہ تغیّر رُونما کس طرح ہُوا؟

اس سلسلہ میں ایک نہایت ضروری نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان کے صحیح ادراک کی تمام تر بنیاد خدا کے صحیح تخیّل پر منحصر ہے؛ جب یہ تخیّل درست ہوتا ہے۔ تو انسان کا ادراک اور فہم بھی درست ہوتا ہے۔ لیکن جب اس تخیّل میں ذرا سا بھی نقص واقع ہو جائے۔ تو پھر انسان اپنا صحیح ادراک کھو بیٹھتا ہے۔ اس سلسلہ میں شاعر اور ڈاکٹر اقبال میں تضاد کی ایک اور مثال[1] بھی عجیب و غریب ہے:

اسلام کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے۔ کہ خدا کے متعلق اُس کا تخیّل صحیح ترین ہے! چنانچہ شاعر اقبال اس تخیّل کو جاوید نامہ میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

می شناسی طبعِ ادراک از کجاست؟ نُورے اندر نگہِ خاک از کجاست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟ قوّتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل۔ ایں وارداتِ روز کیست؟ ایں فنون و معجزاتِ روز کیست؟
گرمئ گفتار داری؟ از تو نیست! شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!

لیکن جب یہی اقبال "فلسفہ دان" کے رُوپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو پھر فرماتے ہیں:۔

"My feelings, hates and loves, judgements and resolutions are exclusively mine," so much so that "God Himself cannot feel, judge and choose for me when more than one course of action are open to me." (*The Reconstruction of Religious Thought in Islam* by Dr. Muhammad Iqbal p.100).

---

[1] پہلی مثال کے لئے دیکھیں صفحات ۷۹ تا ۸۵؛

Marfat.com

(یعنی میرے احساسات، میری نفرت اور میری محبت، میرے فیصلے اور میرے ارادے، سب میرے اپنے ہیں ؛ گویا کسی ذات کو ان میں دخل نہیں ؛ یہاں تک کہ جب میرے سامنے کسی معاملہ میں ایک سے زائد راستے کھلے ہیں۔ تو خدا خود ان کے بارہ میں نہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ اور نہ چن سکتا ہے!)

نہایت سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص ایک کمرہ میں بیٹھا ہو۔ جس میں دو دروازے ہوں۔ ایک مشرق کی جانب۔ اور دوسرا مغرب کی جانب۔ تو خدا نہ یہ محسوس کر سکتا ہے۔ کہ وہ شخص اس کمرہ کی مشرقی جانب سے باہر نکلے گا۔ یا مغربی جانب سے ؛ نہ خدا اس بارہ میں فیصلہ دے سکتا ہے۔ کہ اس شخص کے لئے کس دروازہ سے نکلنا بہتر ہے ؛ اور نہ ہی خدا یہ چن سکتا ہے۔ کہ اس شخص کے لئے کس دروازہ سے نکلنا زیادہ موزوں ہے!

اور یہ سب کچھ اس خدا کے بارہ میں کہا جا رہا ہے۔ جس سے تمام دنیا کے مومن ہر وقت اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ٭ کہہ کر مدد اور استعانت طلب کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ہر قدم پر "دو راہے" نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اے اللہ! ہم کو سیدھا راستہ سجھا۔ تاکہ ہم صحیح راستہ پر چلیں۔ اور غلط راستہ کی طرف رخ نہ کریں۔ کیونکہ ہم "ظلمت" کی طرف نہیں جانا چاہتے۔ بلکہ "نور" کی طرف آنا چاہتے ہیں ؛

اور ہم یہ اس لئے کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان یہ ہے۔ کہ جب تک ایک انسان کے ساتھ فضلِ ایزدی شاملِ حال نہ ہو۔ وہ راہِ راست پر نہیں چل سکتا ؛ اور یہ ایمان بھی خود ساختہ نہیں ہے۔ بلکہ خدا خود کہتا ہے۔ کہ وہ مومنوں کو :

یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۵۷) ؛

(یعنی تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے!)

لیکن جب ایک شخص اسی خدا کے بارہ میں یہ کہنا شروع کر دے۔ کہ "نہ وہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ اور نہ چن سکتا ہے" تو ایسا خدا "قدرتوں والا" خدا تو نہ ہوا! اب اس قسم کی تحریروں کو اگر عربی کے محاورہ "اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر" کی تفسیر نہ کہا جائے۔ تو کیا کہا جائے ؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ علامہ اقبال کے مندرجہ بالا انگریزی کے قول کی تہ میں اُن کا "خودی" کا فلسفہ کارفرما ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئیے۔ کہ صحیح "خودی" میں دو باتوں کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ ایک تو یہ کہ "خودی" میں خودداری تو ہو۔ لیکن نخوت نہ ہو! اور دوسرے اس "خودی" کا تعلق، صرف انسانوں کے آپس میں میل جول تک، محدود ہو؛ اس حد تک "خودی" ایک بہترین انسانی خصلت ہے۔ کیونکہ ایک انسان جتنا خوددار ہو گا۔ اتنا ہی اس کی فطرت میں استغنا ہو گا۔ اتنا ہی وہ لوگوں سے بے نیاز ہو گا۔ اور اتنا ہی وہ کیریکٹر کے لحاظ سے بلند ہو گا ؛

لیکن اگر "خودی" کا فلسفہ، انسانوں کے آپس میں میل جول کے علاوہ، انسانوں کو خدا سے بھی بے نیاز کر دے۔ یا

٭ تجھی سے (اے خدا) ہم مدد مانگتے ہیں۔ (سورۃ ۱ فاتحہ۔ آیت ۴)

Marfat.com

اُسے خدا سے نبرد آزما ہونے پر اُکساتے۔ تو پھر ظاہر ہے۔ کہ یہ بے معنی سی بات ہے!

یہاں اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ ایک انسان کے ادراک کا اُس کے تخیّل کے ساتھ کیسا گہرا تعلق ہے۔ یعنی جب اُس کا خدا کے متعلق تخیّل درست ہوتا ہے۔ پھر تو وہ دنیا کو غیب تک کی خبروں سے آگاہ کرتا ہے۔ لیکن جب تخیّل صحیح نہیں ہوتا۔ تو پھر وہ بالکل بے خبر اور معذور ہو جاتا ہے!

مثلاً جب شاعر اقبال کا خدا کے متعلق اعتقاد یہ ہوتا ہے

گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست! شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!

کیونکہ

ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!

تب تو وہ ہمیں غیب کی اس قسم کی خبریں دیتے ہیں۔ کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا!

یہ اس لئے کہ ہماری دنیا میں "نور کا اتمام" ابھی باقی ہے۔ لہٰذا وہ ہر مسلمان کو نہایت مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا!
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

اور دنیا کو متنبہ کرتے ہیں۔ کہ کوئی فلسفی ہو، یا سائنسدان، امیر ہو یا وزیر، کوئی کسی زعم میں نہ رہے۔ کیونکہ

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے!

لیکن جب انہی اقبال کو اپنی "خودی" پر اتنا زعم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ (فلسفیانہ رنگ میں) خدا سے نبرد آزما ہونے پر اُتر آتے ہیں۔ اور یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کہ جب اُن کے سامنے دو سے زائد راستے کھلے ہوں۔ تو "خدا خود ان کے بارہ میں نہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ نہ چُن سکتا ہے۔" تو پھر اُن سے وہ ادراک جو اُن کو غیب تک کی خبروں سے اطلاع دیتا ہے۔ ایسا غائب ہوتا ہے۔ کہ جس "تہذیب" نے "اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کرنی تھی۔ اُسی کی "چمک" سے وہ خود تمام مرعوب ہو جاتے ہیں۔ کہ اُس کی "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" کو ہی وہ "عبادت" جاننے لگ جاتے ہیں!

Marfat.com

اسی طرح جب عشقِ رسولؐ میں اُن کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ وہ سُنّت کی پیروی کے بارہ میں "ہر رہگذر پہ نقشِ کفِ پائے یار دیکھ" کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر تو وہ "محمدؐ سے وفا" کرنے میں اتنی جان پاتے ہیں۔ کہ اُن کی نظر[1] میں یہ جہان کوئی چیز ہی نہیں رہتا۔ چونکہ وہ "لوح و قلم" کی مالک ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ فلسفہ کی اُلجھنوں میں اُلجھ کر اس "عشق" سے سرِ مو بھی انحراف کرتے ہیں۔ تو نادانستہ طور پر وہ "ذمِ ناگزیر" کو "عبادت" کا رُتبہ دے دیتے ہیں!

لہٰذا جو لوگ نفسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے اس "مدوجزر" میں (مختلف ذہنیتوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں) بہت سے سبق ہیں!

اِس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ علامہ اقبال کے مداحوں نے "اقبال اکیڈمی" بھی قائم کر رکھی ہے۔ اور "بزمِ اقبال" بھی۔ لیکن میرے علم میں ابھی تک کوئی ادارہ یا شخص نہیں آیا۔ جس نے شاعر اقبال اور ڈاکٹر اقبال میں کوئی فرق محسوس کیا ہو!! جیسا کہ پچھلے اوراق سے واضح ہو گیا ہو گا۔ علامہ اقبال کی ان دو حیثیتوں میں بعض مقامات پر نمایاں فرق ہے! لیکن دُنیا نے ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا۔ کہ شاعر اقبال اپنی شاعری میں اگر عام طور پر "ثریا" کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو ڈاکٹر اقبال کے بعض اقوال کی بُنیاد اس قدر ٹیڑھی ہے۔ کہ "تا ثریا می رود دیوار کج" والا معاملہ پیش آتا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول وہ ہے۔ جو کہ صفحہ ۸۸ والے انگریزی کے اقتباس کے آخری حصہ میں درج ہے!

اب اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے وقت صرف ڈاکٹر اقبال کو ہی اپناتے ہیں۔ لیکن شاعر اقبال کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ اور اگر دیتے بھی ہیں۔ تو محض "دماغی عیاشی" کی حد تک! مثلاً جہاں تک کہ ایک انسان کی ایمانی قوت کا تعلق ہے۔ حضرتِ اقبال نے اُسے ایک شعر میں قلمبند کر دیا ہے۔ یعنی ؎

ہو اگر آج براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

گویا اِس شعر میں حضرتِ اقبال نے نہ صرف "براہیمی ایمان" کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ نشاندہی بھی کر دی ہے۔ کہ اِس قسم کا ایمان رکھنے والے کی نشانی یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کے لئے "نمرود کی آگ" پھر "گلزار" کا

---

[1] ؎ کی محمدؐ سے وفا تُونے تو ہم تیرے ہیں!
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

Marfat.com

حکم رکھتی ہے!

اب انگریزی تعلیم یافتہ حضرات، بجائے اس کے کہ اس فلسفہ کو سمجھنے یا اپنانے کی کوشش کرتے۔ کہ "براہیمی ایمان" بھی کوئی شے ہے۔ (جس میں ایسی قوت ہے۔ کہ وہ آگ کو گلستاں میں منتقل کر سکتا ہے)۔ وہ اس بات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ کہ کسی عمارت میں آگ لگنے پر، آگ کے انجن کو کس طرح پھرتی سے استعمال میں لایا جائے۔ لیکن بہ لگن کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے "براہیمی ایمان" والے لوگ بھی پیدا کرنے ہیں۔ اس طرف بالکل توجہ نہیں؛ اور نہ صرف توجہ نہیں۔ بلکہ اس قسم کے رُجحان سے روکنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے!

مثال کے طور پر ایک گذشتہ "اقبال ڈے" پر (یعنی اپریل ۱۹۵۸ء میں) اقبال کے اپنے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال صاحب نے فرمایا۔ کہ "ہمیں اس رُجحان کو اب خیر باد کہ دینا چاہئے۔ کہ کسی مردِ کامل کا ظہور ہوگا۔ اور وہ پھر ہماری ڈوبتی کشتی کو پار لگائے گا!" گویا "براہیمی ایمان" کے دن کبھی کے بیت چکے! اس وقت دُنیا "پیکرِ محسوس" کی دُنیا ہے۔ اور یہی "پیکر" اب ہمارا اوڑھنا اور بچھونا ہونا چاہیئے!

اس سلسلہ میں لُطف کی بات یہ ہے۔ کہ جب لوگوں کو محض "دماغی عیاشی" مطلوب ہوتی ہے۔ پھر تو وہ اقبال کے شعر پڑھتے جاتے ہیں۔ اور سر دُھنتے جاتے ہیں۔ (کیونکہ اُن کے شعر ہی ایسے ہیں۔ کہ ایک سلیم الفطرت انسان اُن کی داد دئے بغیر رہ نہیں سکتا)۔ چنانچہ "مشاعرہ" کی فضا میں جب کائنات کی تسخیر کے لئے دل چٹکیاں لیتا ہے۔ پھر تو سب کی زبان پر یہ ہوتا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں!

لیکن جب "مشاعرہ" کی فضا کا نشہ دُور ہو جاتا ہے۔ اور انسان اپنے اصلی ہوش و حواس میں آتا ہے۔ تو پھر (جیسا کہ پہلے اشارۃً کہا جا چکا ہے)۔ "محمدؐ کی نماز" کے علاوہ "ذرّات کا تجزیہ" بھی عبادت بن جاتا ہے!

چنانچہ مسٹر غلام احمد پرویز جو علامہ اقبال کے حقیقی مریدوں میں سے ہیں۔ (اور جو شاعر اور ڈاکٹر اقبال میں تمیز نہیں کر سکے)۔ وہ اس کا عملی ثبوت اس طرح دیتے ہیں۔ کہ چونکہ "ذرّات کا تجزیہ" اصلی "عبادت" ہے۔ لہٰذا حقیقی مومن بھی وہی ہے۔ جو سچا سائنسدان ہو؛ (اور اسی منطق کی رُو سے کسی موٹر یا ہوائی جہاز کا مُوجد گویا "ولی" ہوا!)[1]

---

[1] مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ "قرآن کی رُو سے علماء کون ہیں؟" یہ نظریہ وہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی؛ دیکھو فصل "انگریزی دان" علماء!

Marfat.com

تخیّل کی اِس قسم کی افتاد کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ اب ہماری نظر میں حقیقی مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" نہیں بلکہ "مادہ کی معرفت" ہے۔ اور یہ سمجھا یہ جا رہا ہے۔ کہ "مادہ کی معرفت" میں ہی "خدا کی معرفت" مضمر ہے!

اِس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آہستہ آہستہ، خدا کا قرآنی تصوّر جب ذہنوں سے محو ہوا۔ تو "عشقِ الٰہی" کی جگہ فلسفہ نے یہ کہہ کر لی۔ کہ یہ بات انسان کی "خودی" کے خلاف ہے۔ کہ وہ اپنے سوا کسی اور ذات کو یہ اختیار دے۔ کہ وہ اُس کے ذاتی معاملات میں "کچھ محسوس کر سکے۔ یا فیصلہ دے سکے۔ یا جُن سکے" ؛ لہٰذا اس دُنیا میں سب کچھ انسان خود کرتا ہے ؛ اور اِس سب کچھ خود کرنے کا ثبوت سائنس نے مُہیا کر دیا! غرض اس طرح "فلسفہ" "سائنس" کے سامنے سربسجود ہو گیا! چنانچہ :-

سر سیّد کا ہر معجزہ کی تاویل کرنا!

علامہ مشرقی کا تذکرہ!

پروفیسر غلام جیلانی برق کا "دو قرآن"!

ڈاکٹر اقبال کا "ذرات کے تجزیہ کو" عبادت "سمجھنا! اور

مسٹر غلام احمد پرویز کی منطق کی رُو سے ہر "مُوحد" کا "ولی" ثابت ہونا!

سب سے اِس نئے "سجدہ" کی مختلف "تسبیحیں" ہیں!

اِس قسم کے ردّیہ کی تہ میں صرف اتنی سی بات ہے۔ کہ ہم نے دُنیا کی تاریخ پر طائرانہ نظر نہیں رکھی ؛ اگر ہم اس قسم کی نظر رکھتے۔ تو فوراً معلوم ہو جاتا۔ کہ جب بھی انسان خدا سے دُور ہو جاتا ہے۔ تو وہ زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں تو ضرور ایسی مہارتِ تامہ حاصل کر لیتا ہے۔ کہ وہ اپنے "کسبِ کمال" کی وجہ سے "عزیزِ جہاں" ہو جاتے! لیکن اس تمام نسانہ میں دیکھنے والی بات صرف یہ ہوتی ہے۔ کہ اس قسم کی ترقی میں "خدا" کی جگہ کہاں ہے ؟ اگر اُس میں "خدا" کی جگہ ایک "ضابطہ" یا محض "خانہ پُری" کی حد تک ہو۔ تو فوراً سمجھ لیجئے۔ کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے ؛ کیونکہ دُنیا کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ "حسن" کو کچھ لُطف ہی اس بات میں آتا ہے۔ کہ جب ایک انسان "غیر خدا" کی سیڑھی لگا کر ایک خاص منزل تک پہنچ جائے۔ اور اُس پر پھر وہ زُعم کرنے لگ جائے۔ کہ اُس نے ترقی کی شاہراہ ڈھونڈ لی ہے۔ تو چُپکے سے اُس سیڑھی کو کھینچ لیا جائے۔ تاکہ آدمی محض بھونچکا سا ہو کر رہ جائے!

اِس سلسلہ میں دُنیا کی تاریخ میں دو واقعات ایسے ہیں۔ جو موجودہ زمانہ کے لئے نہایت سبق آموز ہو سکتے ہیں:- پہلا واقعہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا ہے۔ اُس وقت سحر کا زور تھا۔ لیکن جب حضرت موسیٰؑ کے اژدہا نے فرعون کے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا۔ تو وہی ساحر مُنہ کے بل گر کے "هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"[1] کہنے پر مجبور ہو گئے!

---

[1] سورۃ ۱۱۲ الاخلاص۔ آیت ۱ (یعنی وہ اللہ ایک ہے)

Marfat.com

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کو اپنی حکمت پر بہت ناز تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے۔ کہ قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ[1]
کے سامنے کوئی طب ایک سیکنڈ کے لئے بھی دم نہ مار سکتی تھی!

بالکل یہی حالت موجودہ زمانے کی ہے :۔ اس وقت ہر شخص کو سب سے زیادہ ناز سائنس کی ایجادات پر ہے!
اور "صنّاع" کا اس میں "کیک" صرف اتنا ہے۔ کہ دُنیا ذاتِ حقیقی سے رُوگرداں ہوکر انہی ایجادات کو زندگی کا مقصدِ وحید
قرار دے :۔ چنانچہ "معرفتِ الٰہی" کے سبق کو چھوڑ کر اس وقت دُنیا کے بہترین دماغوں نے سائنس کے نِت نئے تجربات
کو ہی صحیح "عبادت" قرار دیا!

خیالات کی اس انتاد کو برقرار رکھنے کے لئے یہ لازمی تھا۔ کہ معجزوں کی نہ صرف تاویل کی جائے۔ بلکہ اُن کو "شعبدہ بازی"
کے مترادف سمجھا جائے! اور خدارسیدہ ہستیوں کو اوّل تو مانا ہی نہ جائے۔ لیکن اگر اس سے مفر نہ ہو۔ تو کم از کم اُن
کو ایسا اپاہج بنا کے رکھ دیا جائے۔ کہ اُن کا ہونا یا نہ ہونا برابر معلوم ہو!

چنانچہ (جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے)۔ سر سیّد نے اگر معجزوں کی تاویل کی۔ اور ڈاکٹر اقبال نے سائنس کے
تجربات کو "عبادت" قرار دیا۔ تو مسٹر غلام احمد پرویز نے ایجادات کے موجدوں کو حقیقی علما ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور مولانا
ابوالاعلیٰ مودودی نے "خدارسیدہ" ہستیوں کو "اپاہج" بنا کے سانس لیا![2]

اب داد دیجئے اُس "صنّاع" کی۔ جس نے "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" کو "سچے نگوں کی ریزہ کاری" اُن مونہوں سے
کہلوایا۔ جو دُنیا کو اس بات کا درس دیتے ہیں۔ کہ اس کائنات میں ایک "عدوِ مبین" بھی ہے۔ جس نے یہ قسم کھائی ہے۔ کہ
وہ ہر "زِشت رُو" کو اس طرح "مزیّن" کر کے دکھائے گا۔ کہ وہ "خوبرُو" معلوم ہو! اور اس کے دھوکے میں "عوام"
نہیں "خواص" آئیں گے!

چنانچہ اس "صنّاع" نے کیا صرف یہ کہ یہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ کہ معمولی پٹرول سے اگر:۔

موٹر چلے گی!

تو

ہوائی جہاز اُڑے گا!!

اور جب تک ان کی مشین اور تیل وغیرہ اپنے اپنے اندازے کے مطابق درست ہیں۔ تب تک دُنیا کی کوئی
طاقت ایک کو چلنے سے اور دوسرے کو اُڑنے سے روک نہیں سکتی!

---

[1] دیکھو سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۴۹ (یعنی اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا):۔

[2] اس اجمال کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی:۔ خاص کر دیکھو فصل "علماء کا گروہ" اور فصل "انگریزی دان علما"!

لیکن دُنیا کو کیا معلوم؟ کہ اسی "صناع" کے اُوپر ایک اور "طاقت" ہے۔ جس کا ایک "محبوب مشغلہ" یہ ہے۔ کہ جب اوّل الذکر اپنا "گنبد" پورا کرے۔ تو اُس "سیڑھی" کو جس پر کہ "صناع" کے زُعم کا تمام انحصار ہے۔ اُس کو چپکے سے ہٹالے۔ اور اپنے اصُول کو ثابت کر دے۔ کہ:-

لَا تَسْخَرُكَ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ [1]

چنانچہ جب "عدوِ مُبین" کے اِس زمانہ کے "گنبد" کو خاتم النبیینؐ کے سامنے پیش کیا گیا[2]۔ تو حضورؐ نے اِس تمام خرافات کا اسلام کی طرف سے جواب یہ دیا۔ کہ ایک طرف تو یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ والی آیت[3] (سورۃ ۵۵ الرحمٰن آیت ۳۳) سے اِس زمانہ کی دُنیا کو چیلنج دلوا دیا۔ اور دوسری طرف اپنے امتیوں کو فرما دیا:-

"کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" [4]

بدعت کسے کہتے ہیں؟

مندرجہ بالا قرآنی آیت کی پوری تشریح چونکہ پہلے گزر چکی ہے[5]۔ لہذا یہاں مذکورہ بالا حدیث کی تفسیر کی ہی ضرورت ہے:-

سوال یہ ہے کہ "بدعت" کسے کہتے ہیں؟

"بدعت" دراصل "نعمت" کا اُلٹ ہے! پچھلے اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن میں "نعمت" سے مُراد "معجزات"[6] ہیں۔ جو اولیائے کرام کے حق میں "کرامات" کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور اِنہی سے کائنات

---

[1] اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا!

[2] یعنی شیطان نے جب یہ محسوس کیا۔ کہ صرف جھوٹ۔ فریب۔ دغا بازی بُت پرستی ہی انسان کو بے راہرو کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ اِن خرافات کو زمانہ خود ہی آہستہ آہستہ بیہودہ باتیں سمجھنے لگ جائے گا۔ لہذا انسان کو خدا سے دُور رکھنے کے لئے ایک ایسی ترکیب کی ضرورت ہے۔ کہ دُنیا اُسی میں کھوئی رہے تو اُس کو کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے مقابلہ میں "مادی تسخیر" کا ڈھونگ رچانے کی سُوجھی! چنانچہ جب یہ پروگرام حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو حضورؐ نے اس کا "توڑ" کیا سوچا؟ اس سوال کے جواب کے لئے اب متن دیکھیں:-

[3] مندرجہ بالا قرآنی آیت میں حکمت یہ ہے۔ کہ چونکہ مقصدِ حیات "خدا رسیدگی" ہے اور اس منزل پر پہنچ کر ایک انسان کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ مسخر ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے سامنے "مادی تسخیر" "بازیچۂ اطفال" بن کر رہ جاتی ہے۔ لہذا حضورؐ نے قرآنی چیلنج سے تو اپنے جاں نثاروں کی ڈھارس بندھا دی۔ کہ خدا کا دامن چھوڑ کر دنیا کدھر جا سکتی ہے؟ اور مندرجہ بالا حدیث سے یہ بات واضح کر دی۔ کہ ہمارا رُخ کدھر ہونا چاہیے:-

[4] ہر ایک بدعت گمراہی ہے۔

[5] دیکھو صفحہ ۵۹

[6] دیکھو صفحہ ۶۵ - ۶۸

Marfat.com

کے ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" منتج ہوتی ہے :: اس ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" کا ثبوت یہ ہے - کہ اس دنیا کی تخلیق چونکہ نورِ مصطفویؐ سے ہوئی ہے - اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ تسبیح میں مشغول ہے - لہٰذا جب تک اِن ذرّات سے خدا کی خوشنودی والا کام لیا جاتا ہے - وہ سلامتی سے کام کرتے جاتے ہیں - لیکن جونہی اُن سے خدا کی خوشنودی کے خلاف کام لیا جاتا ہے وہ "مہلت" کی میعاد تک تو خاموش رہتے ہیں - لیکن جونہی "مُہلت" ختم ہوتی ہے - وہ "باغی" ہو جاتے ہیں - اور "بغاوت" کر دیتے ہیں! حضرت نوحؑ کا طوفان ذرّات کی "بغاوت" کی بہترین مثال ہے! اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کی قوم کے ساتھ بحرِ قلزم میں سے گزرنا چاہا - تو وہ "ذرّات" بخوشی "علیحدہ علیحدہ" ہو گئے - اور حضرت موسیٰؑ اور اُن کے ساتھی بخیر و خوبی اُن میں سے گزر گئے - لیکن جونہی فرعون اور اُس کی فوج دریا میں گھسی - تو "ذرّات" نے پھر "بغاوت" کی - اور فرعون اور اُس کے ساتھیوں کو ایک لمحہ میں تہس نہس کر دیا! گویا اس سے ثابت ہوتا ہے - کہ اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ "باشعور" ہے! اور وہ صرف یا "حُسن" کا تابع ہے - یا حُسن کے چاہنے والوں" کا! تمام پیغمبروں کے "معجزات" اور اولیائے کرام کی "کرامات" صرف اسی فلسفہ کا نتیجہ ہیں!

چنانچہ جب انسان کے "عدو" "مبین" نے قدرت کے اس "آہنی اصول" سے خلاصی پانی چاہی - تو استدعا کی - کہ ذرّات کے "بغاوت" کرنے والے قانونِ قدرت کو "التوا" میں ڈال دیا جائے - چنانچہ "مشین کے زمانہ" کی مدت کے لئے یہ قانون "التوا" میں ہے - اور یہی فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ[1] کی صحیح تفسیر ہے!

اب اس "التوا" کے دوران انسان کے "عدو" "مبین" نے جب تقدیر کے "رُوحانی تسخیر" والے نوشتہ کو مٹانا چاہا - تو اُس نے دُنیا کو کائنات کی "مادی تسخیر" کا چکمہ دیا - اور سبق یہ پڑھایا - کہ موجودہ سائنس کی ایجادات ہی خدا کی اصلی "نعمتیں" ہیں - لیکن جس طرح پہلے واضح کیا جا چکا ہے - قرآن کے نزدیک اس زمانہ کی ایجادات (مثلاً بجلی، موٹر، ہوائی جہاز، وغیرہ - وغیرہ) "نعمتیں" نہیں ہیں - چونکہ جن نعمتوں کے "اِتمام" کا ذکر قرآن کے اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ[2] کے الفاظ میں آیا ہے - وہ "رُوحانی نعمتیں" ہیں - جن کی تشریح گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے[3] - لہٰذا یہاں اُنہیں دُہرانے کی ضرورت نہیں -

اب چونکہ سُنّت اللہ یہ بھی ہے - کہ جب کوئی معقول شخص انسان کے "عدو" مبین" کے چکمہ میں آئے تو وہ بالآخر "منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد" کہنے پر مجبور ہو جائے - لہٰذا یہ لازمی ہے - کہ کائنات کی موجودہ "مادی تسخیر" کے ماہرین کا بھی

---

[1] سورۃ ٨٥ البروج - آیت ١٦

[2] سورۃ ٥ المائدہ - آیت ٣

[3] دیکھو صفحات ٦٥ تا ٦٨

Marfat.com

وہی حشر ہو۔ جو حضرت موسیٰؑ کے ساحروں کا ہوا تھا! لہٰذا موجودہ "مشین کے زمانہ" کی مہلت گزرنے کے بعد جب "طائرانِ حرم" کا ظہور ہوا۔ تو اُن کیلئے ہوا بالکل اُسی طرح مسخر ہو گی۔ جس طرح کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لئے مسخر تھی! ان حالات میں دُنیا کو نہ ریل کی ضرورت ہو گی اور نہ ہوائی جہاز کی! لہٰذا اُس وقت پھر انسان کے "عدد" "مبین" کے موجودہ "گنبد" کا موزوں ترین جواب یہی ہو گا۔ کہ ریل چلتی چلتی تھم جائے! اور ہوائی جہاز اُڑتا اُڑتا ہوا میں معلق ہو جائے! اور دُنیا کی کوئی طاقت نہ ایک کو ہلا سکے۔ اور نہ دوسرے کو ہلا سکے۔ تاکہ جن لوگوں کی نظریں موجودہ "مادی تسخیر" سے خیرہ ہو چکی ہیں۔ وہ بھی "منہ کے بل گر کے ھُوَ اللہُ اَحَد" کہنے کے لئے مجبور ہو جائیں! اسی لئے انسان کے "عدد" "مبین" کے موجودہ زمانہ کے "گنبد" کو (جس کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ دُنیا کے لوگ "زندگی بے بندگی، شرمندگی" کے راز کو بالکل نہ پا سکیں) اسلام نے "بدعت" کے صرف ایک لفظ سے تعبیر کیا ہے!

اب ہماری بدقسمتی اس بات میں رہی۔ کہ ہم چونکہ "سخن شناس" نہیں تھے۔ لہٰذا ہم میں سے اُن لوگوں نے جو نماز کے وقت ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے۔ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کا مطلب یہ لیا۔ کہ جو ناف کے اوپر ہاتھ باندھے، وہ بدعتی! اور جو ناف کے اُوپر ہاتھ باندھتے تھے۔ اُنہوں نے اِن الفاظ کا مطلب یہ سمجھا۔ کہ جو ناف کے نیچے ہاتھ باندھے۔ وہ بدعتی! اس کے آگے نہ اُن کی نظر نہ پہنچ! اور جن لوگوں کے نزدیک سائنس کے نت نئے "تجربات" ہی "عبادت" تھے۔ اُنہوں نے مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کو "دقیانوسی خیالات" قرار دیا! اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مُردوں کو "قُم بِاِذنِ اللہ"[1] کہہ کر زندہ کرنے والا انسان میو ہسپتال کی چار دیواری میں گھر کر رہ گیا!

لیکن ہم کوتاہ بینوں نے یہ نہ سمجھا۔ کہ نبیؐ کے الفاظ ہمیشہ پتھر پر لکیر ہوتے ہیں! تمام دُنیا تہ و بالا ہو سکتی ہے۔ لیکن نبیؐ کے الفاظ میں سرِ مُو بھی فرق نہیں آ سکتا! چنانچہ جب زمانہ گردش کرتے کرتے نقطہ "ع" پر پہنچے گا۔ (دیکھو صفحہ ۵۸) ۔ اور دنیا جہان کی تمام مشینیں چلتی چلتی رُک جائیں گی۔ تو یہ سب کچھ "کُلُّ بِدعَۃٍ ضَلَالَۃٌ"[2] کے الفاظ کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہو گی!

لہٰذا اِس وقت ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اسلام کی تعلیمات کی تحقیق کر کے اُس صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو ازل سے "لوحِ محفوظ" پر کندہ ہے!

اس وقت کے سطح بین علماء یا مسٹر پرویز جیسے لوگوں کی جو توضیحات ہیں۔ وہ اسلام کے ۲۰ویں یا ۳۰ویں فرقے کی ہیں۔

---

[1] دیکھو سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۴۹ (یعنی اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا)!

[2] ہر ایک بدعت گمراہی ہے!

بانیٔ اسلام کے نزدیک اِن کی کوئی وقعت نہیں ۔ ہمیں اُس توضیح کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کے پہلے فرقہ کی تھی۔[1] اَور جو چودہ سو سال سے بدستور قائم ہے۔ اَور وہ توضیح یہ ہے۔ کہ ایک انسان مرنے سے پہلے پہلے "خدا کی معرفت" حاصل کرے۔ اَور اُس کے نتیجہ کے طور پر کائنات کے ذرّہ ذرّہ کی "رُوحانی تسخیر" کرے ۔ زمانہ کی ہوا کے تھپیڑے اِس توضیح کو بھی لگے۔ لیکن وہ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جُوں کی تُوں قائم رہی!

اِس توضیح کے پیروؤں کو پہلے یہ حکم ملا۔ کہ جس شمع نے تیئس[2] برس تک دُنیا میں اُجالا کیا ہے۔ اُس پر وہ پچاس سال[2] اَور پروانہ وار نثار ہوں۔ چنانچہ وہ اُسی حکم کے مطابق اپنے آپ کو قربان کرتے رہے!

پھر حکم ہُوا۔ کہ وہ پیچھے ہو جائیں ۔ چنانچہ "ملوکیت" آگے ہو گئی۔ اَور وہ پیچھے ہٹ گئے! جس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں اگر پہلے وہ "سرکاری" طور پر موجود تھے۔ تو پھر "غیر سرکاری" طور پر" رونقِ محفل" رہے!

پھر حکم ہُوا۔ کہ وہ اپنے آپ کو اِس طرح غائب کریں۔ کہ جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھے! چنانچہ موجودہ حالت ایسی ہی ہے۔ کہ وہ رُوپوش ہیں!

یہ سب کچھ اِس لئے ہُوا۔ کہ "عدو" "مبین" کو اپنے "کِبر" میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہ ہو۔ اَور اُس کو ہر وقت اَور ہر حال میں پوری آزادی ہو!

لہٰذا اِس وقت ہمارا اصلی امتحان ہے! لیکن ہم نے اِس وقت گُل یہ کھلایا۔ کہ جس نے خود اپنی زبان سے کہا تھا۔ کہ "تہذیبِ حاضر" "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے۔ اُسی نے زبان بدل کر (یعنی انگریزی میں) یہ کہا۔ کہ یہ "ریزہ کاری" ہی "عبادت" ہے!

ہم نے یہیں بس نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ موجودہ ایجادات کے بانی مبانی دراصل مُسلمان ہی ہیں[3] ۔ مجھے اِس سے انکار نہیں۔ کہ ہمارا یہ دعویٰ بالکل درست ہی ہو۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے۔ کہ

---

[1] حضورؐ کی بعثت کا زمانہ

[2] یعنی کربلا کے سانحۂ عظیم تک!

[3] اِس سلسلہ میں مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔ ۱۹۶۹ء میں ابو علی حسن ابن الحسن ابن الہیثم کی ہزار سالہ یاد منائی گئی ۔ اُس وقت اِس ملک کے تمام اخباروں میں اِس بات کا بہت چرچا تھا۔ کہ ابن الہیثم کی قسم کے مسلمان ہی دراصل موجودہ سائنس کے بانی مبانی ہیں ۔ اسی لئے ایک مقرر نے ایک جلسہ میں مغربی اقوام کو بہت بُرا بھلا کہا۔ کہ اُنہوں نے ابن الہیثم جیسے سائنسدانوں کی کامیابیوں پر ہمیشہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ اِس کے برعکس "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء میں لفٹننٹ کرنل کے ۔ اے ۔ رشید صاحب نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں اُنہوں نے لکھا ہے ۔ کہ بعض ایجادات مثلاً بارود یا کاغذ کی صنعت وغیرہ جن کی بابت بھی ہم یہ دعویٰ کر رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹ پر)

وہ مسلمان جن کو ہم "موجد" ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا وہ خدارسیدہ تھے؟ اگر نہیں تو پھر اسلام "عطارد" کو تو کبھی خاطر میں لاتا ہی نہیں۔ وہ صرف "طبیبوں" کا قائل ہے۔ اور ان "طبیبوں" کو وہ "علماء" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جو کانبیاءِ بنی اسرائیل ہوتے ہیں!

لیکن اس وقت چونکہ اس قسم کے علماء (یعنی "خدارسیدہ" بزرگ) روپوش ہیں۔ اور مشیّت ایزدی میں یہ تھا۔ کہ ایک خاص وقت تک موجودہ "مادی تسخیر" دنیا میں جاری و ساری ہو۔ لہٰذا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے)۔ اس وقت یہ "بدعت" (یعنی موجودہ "مادی تسخیر") "ذمِ ناگزیر" (یعنی (necessary evil ہے۔ "عبادت" نہیں!

لہٰذا موجودہ "مادی تسخیر" کو اگر عوام "عبادت" کہتے۔ اُن سے تو اس قسم کی بات پھب سکتی تھی۔ کہ اُن کا پسِ منظر عام طور پر مذہبی نہیں۔ لیکن جن کو "زباندانی" اور "سخن شناسی" کا دعویٰ ہو۔ وہ بھی حقیقت سے دُور رہیں۔ یہ تعجب خیز نہیں۔ تو اور کیا ہے؟

میں جب یہود کے علماء کے متعلق سُنا کرتا تھا۔ کہ وہ توریت کے معنوں کو بدل دیتے تھے۔ تو میری سمجھ میں نہ آتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸ کا)

ہیں۔ کہ ان کے موجد بھی مسلمان ہی تھے۔ دراصل ان ایجادات کے موجد چین کے باشندے یا یونانی تھے: مسلمانوں نے ان سے سیکھا۔ اور اس کے بعد مغربی اقوام نے انہی چیزوں کو مسلمانوں سے سیکھ کر موجودہ ترقی کی راہیں کھولیں:

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم مغربی اقوام کی موجودہ ایجادات سے مرعوب ہو کر ہی موجودہ سائنس کو اسلام کی روح سمجھ رہے ہیں: اگر ہماری نظر میں کچھ بھی گہرائی ہوتی۔ تو ہم یہ سمجھ لیتے۔ کہ قرآن نے "علم" کے لفظ کو "روحانی علم" کے معنوں میں استعمال کیا ہے ہر قسم کے علم کیلئے نہیں! اسلام کے نزدیک انسان کی معراج "خدارسیدگی" ہے مادی چیزوں کی ایجادات نہیں!

اسی لئے قرآن کریم کی تنزیل کی اصلی غایت "ہدایت" ہے۔ اور ہدایت بھی صرف متقین کے لئے ہے۔ یعنی جن کا کم از کم نہ صرف خدا پر ایمان بالغیب ہو۔ بلکہ اُس کے آگے جھکنے میں وہ فخر محسوس کرتے ہوں۔ اور رب العزت نے جو دولت اُن کو دی ہے۔ اُس میں سے وہ بخوشی فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہوں: جب اس قسم کے لوگ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ تو پھر یہ صحیفہ اُن کو آئن سٹن یا مارکونی نہیں بناتا۔ بلکہ "ابراہیم و موسیٰ" اور "سلیمان و عیسیٰ" بناتا ہے!

اس سلسلہ میں مولانا ماہر القادری کے خیالات بہت قیمتی ہیں جن کا اظہار اُنہوں نے "صحیفہ ہدایت" کے تحت "سیارہ ڈائجسٹ" "قرآن نمبر" جلد اوّل صفحات ۲۶۳ سنہ ۱۹۶۸ء میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"قرآن میں جہاں کہیں چاند ستاروں اور افلاک کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا درست نہیں۔ کہ قرآن علمِ ہیئت پر کوئی مقالہ پیش کر رہا ہے: اسی طرح ہوا اور بارش کے ذکر کو علم موسمیات سے پیوند جوڑنا۔ زمین کے بیان کو علم طبقات الارض سے نسبت دینا۔ ہریالی کھیتی پھول پتوں اور درختوں کی تفصیل کو فنِ باغبانی اور فنِ زراعت کا ضمیمہ سمجھنا۔ علم قرآنی میں غلط اندیشی کی دلیل ہے: جو لوگ قرآن کی ہمہ گیری اور جامعیت دنیا کے سامنے پیش کرنے کی نیت سے سائنسی علوم سے قرآن قدیم کو مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قرآن کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے"!

Marfat.com

تھا۔ کہ الفاظ کے معنی کس طرح بدلے جا سکتے ہیں؟ لیکن اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ رہی ہے۔ کہ "عدوٌ مبین" میں اتنی طاقت ہے۔ کہ وہ ذہنیتوں کی ساخت کو بدل دے۔ اور انسان کو کسی چیز کو اُس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے ہی نہ دے!

مختلف ذہنیتیں کس طرح بنتی ہیں؟

آیئے۔ اب ہم مختصر طور پر یہ دیکھیں۔ کہ مختلف ذہنیتیں بنتی کس طرح ہیں؟

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن کے الفاظ "وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ" (سورۃ ۳۲ السجدہ۔ آیت ۹) پر غور کرنے کی ضرورت ہے:۔ یعنی اللہ جل شانہٗ نے انسان کے اندر اپنی رُوح میں سے کچھ پھُونکا! اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان کے اندر (خواہ مُسلم ہو یا غیر مُسلم) "مِن رُّوحِهٖ" ہے:۔ البتہ قدرت نے اِس "مِن رُّوحِهٖ" کو ہر انسان کے اندر کچھ اِس نہج سے رکھا ہے۔ کہ:

اگر وہ جھُوٹ بولتا ہے۔ تو وہ "مِن رُّوحِهٖ" مکدر ہو جاتی ہے!
اگر وہ سچ بولتا ہے۔ تو وہ "مِن رُّوحِهٖ" روشن ہو جاتی ہے!
اگر وہ خدا کو مانتا ہے۔ تو وہ "مِن رُّوحِهٖ" منوّر ہو جاتی ہے!

اور اگر وہ خدا کے ساتھ خاتم النبیین کی سنت پر بھی عمل کرے۔ تو اُس "مِن رُّوحِهٖ" کو خدا کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ اور بالآخر ایسا انسان "خدا رسیدہ" ہو جاتا ہے!

اب جب ایک انسان سچ بولتا ہے۔ اور صداقت و دیانت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خواہ وہ خدا کو نہ بھی مانے۔ (جیسا کہ اِس وقت مغربی ممالک کے انسان کا عام طور پر حال ہے) ۔ تو اُس کی "مِن رُّوحِهٖ" عقل و فہم کے لحاظ سے تو نہایت تابناک ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کا ذہن صرف "مادی" معاملات میں ہی ترقی کرتا ہے۔ (چونکہ خدا کی ہستی کو تو اُس نے کبھی کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہوتی)۔ لہٰذا وہ موٹر اور ہوائی جہاز کا تو مُوجد ہو سکتا ہے۔ لیکن "نُور" کی طرف سے کورے کا کورا ہی رہتا ہے!

یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل چونکہ مغربی ممالک کے لوگ کیریکٹر کے لحاظ سے ہم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ لہٰذا وہ "بیل گاڑی" سے تو خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ گئے۔ لیکن اُن میں جس بات کا نقص رہ گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ ے

بابر بعیش کوش کہ عالم دو بارہ نیست!

کی طرف تو مائل ہوئے۔ لیکن ے

زندگی، بے بندگی، شرمندگی!

کا راز نہ سمجھ سکے!

Marfat.com

یہاں یہ کہنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اگر ایک شخص صداقت و دیانت کی زندگی کے ساتھ صرف خدا کو مانتا ہے۔ (لیکن تبلیغ کے نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا خاتم النبیین پر ایمان نہیں ہوتا)۔ تو وہ "حق" کا عاشق تو ہو سکتا ہے۔ چونکہ ؎

نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانہ سے!

لیکن اُس کا عشق ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہ اِس لئے کہ وہ "آغازِ محبت" تو کر سکتا ہے۔ لیکن محبوب کے ہاں اُس کا "آنا جانا"[1] نہیں ہو سکتا! یہ حالت ایسی ہے۔ جیسے کہ کسی کے دل پر کسی حسین چہرے کے تبسم سے بجلی تو گر جائے لیکن اُس کو وصال مُیسّر نہ ہو!

لیکن خاتم النبیین کی سنّت میں رازہی صرف یہ ہے۔ کہ اُس پر پیروی کرنے سے ایک انسان کو وہ مقام نصیب ہوتا ہے۔ جس کے لئے دُنیا اِس وقت ترس رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ قطرہ ہوتا ہے۔ لیکن دریا میں مل کر دریا ہو جاتا ہے[2] چنانچہ موجودہ "مشین کے زمانہ" کی مُہلت ختم ہونے کے بعد (دیکھو صفحہ ۵۸) قدرت کا منشا یہ ہے۔ کہ وہ دُنیا کو یہ دکھائے۔ کہ اَلْیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اور أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي[3] کی تفسیر کیا ہے؟ اسی لئے قدرت نے اُس "حسین" کو جو قرآن کے اِن الفاظ کے نازل ہونے سے پہلے اِس دُنیا میں موجود تھا۔ (یعنی حضرت علیٰ) ۔ اُس کو آسمان پر پہنچا دیا۔ تاکہ جب وہ "نزول" کے بعد "طائرانِ حرم" کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ تو وہ خود شہادت دے کہ جس "حسن" کی تاب حضرت موسیٰ نہ لا سکے۔ عشق کے سردار اعظم کے امتیوں کا اُس کی بارگاہ میں کس شان کے ساتھ "آنا جانا" ہے!

اب بجائے اِس کے کہ ہم اس فلسفہ کو سمجھتے ہم میں سے ایک گروہ نے تو حضرت علیٰ کو ہی کشمیر میں دفن کر دیا[4]۔ اور دوسرے نے "خدا کی معرفت" کی بجائے "ذرات کی معرفت" کو ہی انسانی مقصدِ حیات تصور کرنا شروع کر دیا!

اِس سلسلہ میں ہماری لاعلمی اس وجہ سے ہے۔ کہ ہم میں سے اکثر محض "سطحی علم" کے حامل ہیں۔ جو اپنی "صرف و نحو"

---

[1] یہ الفاظ جگر کے اِس مصرعہ سے لئے گئے ہیں ؎

آغازِ محبت ہے آنا ہے نہ جانا ہے!

[2] اِس سے یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اُس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اِس دنیا میں جتنے بھی ارواح آتے ہیں۔ اُن کی شخصیت قائم رہتی ہے۔ تبھی تو ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ جزا و سزا ملے گی۔ یہاں دریا میں مل کر دریا ہونے سے مراد یہ ہے۔ اُس کے لدنی علم میں بیحد وُسعت ہوتی ہے!

[3] سورۃ ۵ المائدہ آیت ۳ (یعنی میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت بھی تمام کر دی)۔

[4] مرزائیوں کا مذہب یہی کہتا ہے!

Marfat.com

کے باوجود بے خبر ہیں! اور جن لوگوں کو دُنیا جہان کی خبریں "بجلیاں" دیتی ہیں۔ وہ بھی بے خبر ہیں!!

حضرت عیسیٰؑ کا نزُول اور شاعرِ اقبالؔ کی اِس دُنیا میں آنے کی غرض و غایت!

اِس کی ایک مثال حضرت عیسیٰؑ کا نزُول ہے! سوال صرف یہ ہے۔ کہ آپ کے نزُول کی اطلاع سب سے پہلے کس کو ہوگی؟ کیا سب سے اوّل اِس کی اطلاع عرب و عجم کے کسی وزیر یا سُلطان کو ہوگی؟ اِن میں سے کوئی بھی اِس اطلاع کا اہل نہیں ہے! اس کی سب سے پہلے اطلاع اُن "خدا رسیدہ" بزرگوں کو ہوگی! جو ؎

"آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے"!

اُنھوں نے بار بار آنے کی آرزُو ظاہر کی۔ لیکن "وعدۂ فردا"[۱] لے کر لَوٹ جاتے رہے۔ اور رُوپوش ہوتے رہے! یہ اُن کے "ضبطِ نفس" کا ثبوت ہے!

اب یہ "حسن" کا کام ہے۔ کہ وہ اُن "رہروانِ محبّت" کو (بقول اقبال) اپنے "رُخِ زیبا" سے ڈھونڈے۔ اور اُن کو ایک دفعہ پھر "رونقِ محفل" کرے! اور میرے نزدیک اقبالؔ کی دُنیا میں آنے کی غرض و غایت ہی یہ تھی۔ کہ وہ "بُلبل" بن کر (وہ "بُلبل"، جو ہمہ تن "محوِ ترنّم" ہو۔ اور جس کے سینے میں ہر دم "نغموں کا تلاطم" ہو!) انسانیت کو جتادے کہ وقت آگیا ہے۔ کہ وہ راز جس کو "طائرانِ حرم" تقریباً چودہ صدیوں سے اپنے سینوں میں سموئے بیٹھے رہے ہیں۔ وہ آشکار ہو۔ اور اِس شان سے آشکار ہو کہ "عام دیدارِ یار" ہو! اور ہر کوئی "بادہ خوار" ہو!!

چنانچہ اِسی لئے حضرتِ اقبالؔ کے قلب پر اِن الہامی الفاظ کا نزُول ہوا ؎

گذر گیا ہے وہ دَورِ ساقی کہ چھُپ کے پیتے تھے پینے والے!
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا!

یہ اِس لئے کہ اِس دُنیا میں "نُور کا اِتمام" ابھی باقی ہے!

بحث کا لُبِّ لُباب

غرض اِس تمام بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے۔ کہ حقیقی اسلام کے

---

[۱] ؎ آئے عُشّاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر
(اقبال)

Marfat.com

عقائد اٹل ہیں ؛ جب ایک انسان کا عقیدہ خدا اور اُس کے رسولؐ کے بارہ میں درست ہوتا ہے۔ پھر تو وہ دنیا کے اہم مسائل کے بارہ میں صحیح نتائج پر پہنچتا ہے۔ اور اُس کے خیالات مختلف قرآنی آیات یا احادیث کے ایک قسم کے ترجمے ہوتے ہیں؛ لیکن جب وہ 'درست تخیل' سے سرِمُو بھی انحراف کرتا ہے۔ تو پھر وہ اپنا ادراک ہی کھو بیٹھتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں وہ جو کچھ کہتا ہے۔ وہ قرآن و حدیث کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ اُلٹا اُن سے ٹکر کھاتا ہے۔ اور ایسا کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے!

اندریں حالات اِس وقت سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ہم خدا اور اُس کے رسولؐ کے احکام کے بارہ میں صحیح مفہوم کا سُراغ لگائیں۔ اور اِن صفحات کا مقصد صرف یہی ہے! چنانچہ اِن صفحات میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ انسان کا حقیقی مقصدِ حیات خدا کی معرفت یا خدارسیدگی ہے۔ اور جو انسان اِس نعمت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ انسانی کمال کی رُو سے اُس کو قرآن "مسلم" کے لفظ سے یاد کرتا ہے ؛ اور اُس کے بعد یہ بتایا گیا ہے۔ کہ جس طرح پہلے وقتوں میں کبھی "زمانۂ حجر" تھا۔ اور پھر "زمانۂ حدید" آیا۔ اسی طرح موجودہ "مشین کے زمانہ" کی بھی ایک مُہلت ہے۔ جب یہ مُہلت ختم ہو گئی۔ (اور اس کے اختتام کے آثار سُرعت سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں)۔ تو اُس وقت دُنیا میں ایک دفعہ پھر "خلافتِ الٰہیہ" قائم ہوگی۔ جس کے تمام اراکین "مسلم" (یعنی خدارسیدہ) ہوں گے۔ اور اس سلسلہ میں پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اِن ہستیوں کی آئندہ کارکردگی کا ایک ہلکا سا خاکہ کیا ہے؟

اب پیشتر اس کے کہ ہم مخلِ ہستی کے آنے والے دَور کو کچھ اور بے نقاب کریں۔ یہ لازمی ہے۔ کہ ہم پہلے اپنے موجودہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں!

(نوٹ)

گذشتہ صفحات میں جس خاص نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کے نزدیک ' ہر ذی روح انسان کو' زندگی میں دو مراحل طے کرنے ہیں :۔

(۱) خدا کو ماننا۔ اور

(۲) خدا تک پہنچنا!

جب تک ایک انسان پہلی منزل پر رہتا ہے۔ تب تک اُس کی مثال ایک 'عطار' کی سی ہے۔ لیکن جب وہ پہلی منزل طے کرنے کے بعد دوسری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ "طبیب" کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے ؛ ایک "عطار" اور "طبیب" میں فرق ظاہر ہی ہے ؛ لیکن مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو "اطبا" کو کچھ "اپاہج" سا بنا کر رکھ دینا ہے۔ اس گروہ کی غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے؟ آئندہ باب میں سب سے پہلے اسی نکتہ پر بحث کی گئی ہے ؛

Marfat.com

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصوّرات

(اقبالؔ)

Marfat.com

باب چہارم

موجودہ حالات کا جائزہ

مسلمانوں میں ناطق گروہ

اِس وقت پاکستان میں دو گروہ ہیں۔ جو ناطق ہیں: ایک علماء کا گروہ اور دوسرا انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا:

علماء کا گروہ

پہلے علمائے کے گروہ کو لیجئے: اس گروہ کے سب حضرات ایک بات پر بالکل متفق ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلام نام ہے خدا اور اُس کے آخری رسولؐ پر ایمان لانے کا اور اعمالِ صالح کرنے کا:

اور اعمالِ صالح سے مراد صرف وہ اعمال ہیں۔ جو عین سُنّتِ نبوی کے مطابق ہوں:

اب جہاں تک خدا پر ایمان کا تعلق ہے۔ عام طور پر سب علماء توحید کے تخیّل کے بارہ میں آپس میں متفق ہیں۔ لیکن جہاں تک انبیاءؑ علیہم السلام پر ایمان یا اولیائے کرام کے بارہ میں عقیدہ کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں علمائے کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جن کا مسلک یہ ہے۔ کہ نہ صرف انبیاءؑ علیہم السلام بلکہ اولیائے کرام کو بھی اپنے اپنے درجہ کے مطابق علمِ غیب ہوتا ہے۔ اور وہ صاحبِ کشف و کرامات ہوتے ہیں: لیکن دوسرے گروہ کا نہایت مختصر الفاظ میں اعتقاد یہ ہے:۔

"انبیاءؑ علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں۔ لہٰذا اولیائے کرام کے متعلق اِس قسم کا گمان کرنا ہی وہم ہے"!

صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اِس مسلک کے علمائے کے نزدیک ایک انسان اِس دُنیاوی زندگی میں کسی قسم کی رُوحانی ترقی کرنے کا اہل ہی نہیں!

ذیل میں مَیں اب دو قسم کے اقتباسات درج کرتا ہوں۔ ایک وہ جس سے اُن علماء کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ جو ایک انسان میں کسی قسم کی رُوحانی طاقت کے قائل نہیں۔ اور دوسرے وہ اقتباسات جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان رُوحانی ترقی کرنے سے کن درجات پر پہنچتا ہے:

پہلے روحانی ترقی کے خلاف والے نظریہ کو لیجئے: مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اپنی کتاب "تفہیمات" (حصہ دوم) میں انبیاءؑ علیہم السلام اور خدا رسیدہ لوگوں کی قوت و قدرت کے مسئلہ کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"دوسری چیز جس کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ نبی کی قوت و قدرت کا مسئلہ ہے۔ جہل و نادانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا۔ تو طبعاً اُس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی

Marfat.com

پیدا ہو گیا۔ کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ خدا کے کارخانہ میں اُن کو کچھ خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جزا و سزا میں اُن کو دخل ہوتا ہے۔ غیب و شہادت سب کچھ اُن پر روشن ہوتا ہے۔ قسمتوں کے فیصلے اُن کی مرضی و رائے سے اُلٹتے بدلتے رہتے ہیں۔ نفع و ضرر پر اُن کو اقتدار ہوتا ہے۔ خیر و شر کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں اُن کے تابع ہوتی ہیں۔ اور وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتے ہیں"؛ وغیرہ وغیرہ ؛

گویا مولانا مودودی صاحب کے نزدیک اس قسم کے تمام خیالات یا عقائد محض جہالت کا نتیجہ ہیں!

اس نظریئے کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم کو لفظِ "متقی" کا مفہوم تو پوری طرح معلوم ہے لیکن **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** کے راز سے ہم آشنا نہیں؛

آیئے ہم پہلے یہ دیکھیں۔ کہ "متقی" کسے کہتے ہیں؟ اور پھر اس پر غور کریں کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** کے الفاظ استعمال کر کے قرآن نے کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟

قرآن کے نزدیک ایک متقی شخص کی تعریف یہ ہے :۔

(۱) اُس کا ندا پر ایمان بالغیب ہوتا ہے (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳)

(۲) وہ نماز کا پابند ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ آیت ۳)

(۳) اللہ نے جو اُسے رزق دیا ہوا ہے۔ وہ اُس میں سے اللہ کے راستہ میں بخوشی خرچ کرتا ہے؛ (ایضاً۔ آیت ۳)

(۴) قرآن اور تمام پہلی کتابوں پر اُس کا ایمان ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ آیت ۴)

(۵) روزِ آخرت پر اُس کا یقین ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ آیت ۴)

(۶) ملائکہ اور تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۷۷)

(۷) اپنے رشتہ داروں۔ یتیموں۔ مسکینوں۔ مسافروں اور سائیلوں وغیرہ کی مدد کرتا ہے۔ (ایضاً)

(۸) زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ (ایضاً)

(۹) اپنے عہد کو پورا کرتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۰) مُصیبت۔ سختی اور جہاد کے وقت صبر کرتا ہے۔ (ایضاً)

(۱۱) صوم کا پابند ہوتا ہے۔ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۸۳)

وغیرہ وغیرہ ؛

Very. Importan—

Marfat.com

قرآن اب یہ کہتا ہے۔ کہ وہ اس قسم کے متقیوں کو ہدایت دیتا ہے: یہاں سوال یہ ہے۔ کہ اس قسم کے لوگ تو پہلے سے ہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اُن کو ہدایت دینے کے کیا معنی؟

جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن کا مفہوم یہاں یہ ہے۔ کہ وہ ایسے نیک لوگوں کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ گویا وہ اُن کو "خدا رسیدہ" کرتا ہے۔ ولی اور عارف بناتا ہے!

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ خدا رسیدگی اور عرفان کے سلسلہ میں انسان نے حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک کیا ترقی کی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انسان کی روحانی "ارتقا" کی روئداد کیا ہے؟

اِس سلسلہ میں صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کافی ہے:

(۱) حضرت ابراہیمؑ نے مُردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰؑ نے مُردوں کو خود زندہ کیا!

(۲) حضرت موسیٰؑ خدا کا صرف ایک جلوہ دیکھ کر بیہوش ہو گئے۔ لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "قابَ قوسَین" تک نوبت پہنچی! یہ انسان کی "ارتقا" کی دو روشن مثالیں ہیں:

اب "کائنات کی تسخیر" کو لیجئے: حضورؐ نے (اور باتوں کے علاوہ) چاند کو شق کیا اور سورج کو آگے پیچھے کیا!

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ حضورؐ کے اُمتیوں نے "کائنات کی تسخیر" کے سلسلہ میں کہاں تک ترقی کی؟ یہاں بھی صرف دو مثالیں کافی ہیں:

حضرت عمرؓ کا قصہ مشہور ہے: اُنہوں نے ایک فوج کو کسی دُور دراز مقام پر کسی مہم پر بھیجا: اُس فوج کے کمانڈر کا نام ساریہ تھا: اُس نے تمام انتظامات تو درست کر لئے۔ لیکن ایک پہاڑی کی پچھلی جانب کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ کیا: حضرت عمرؓ اُس وقت مسجدِ نبوی میں خطبہ فرما رہے تھے۔ اُنہوں نے جب اس صورتِ حال کو دیکھا تو آواز دی "یَاسَارِیَۃَ الْجَبَل"! یعنی اے سَارِیَہ! پہاڑی کی طرف توجہ کرو! چنانچہ جب فوج کے کمانڈر نے خلیفۃ المومنین کی آواز سُنی۔ تو اُس نے پہاڑی کی طرف بھی پورا انتظام کر لیا۔ اور آخر کار جس مہم پر بھیجے گئے تھے۔ وہ سر کر لی!

اِس مثال سے آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ قرآن جب "متقیوں" کو ہدایت دیتا ہے۔ تو اُن کے حجاب کس طرح اُٹھ جاتے ہیں! اور باوجود اس بات کے کہ اُس زمانہ میں کوئی وائرلیس موجود نہیں تھا۔ جو اُن کو کسی قسم کی خبر پہنچاتا۔ وہ دُور دراز مقاموں کی حالت کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟

اسی طرح ایک قصہ حضرت معین الدین چشتیؒ کی بابت مشہور ہے: ایک رات آپ جو یوں ... کہ ایک جماعت کے پاس سے گزرے۔ جو آگ کی پرستش کر رہے تھے: آپ نے اُن سے پوچھا کہ وہ آگ کی پُوجا کیوں کرتے ہیں؟

Marfat.com

اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ اُن کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ آگ سب چیزوں کو جلاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اُس کی اس دُنیا میں پرستش کریں گے۔ اگلے جہان میں یہ آگ اُن پر اثر نہیں کرے گی :- لہٰذا اُنہوں نے حضرت معین الدین چشتیؒ کو بھی دعوت دی۔ کہ وہ بھی اُس کی پرستش کریں۔ تاکہ وہ اگلی دُنیا میں اِس کی اذیّت سے محفوظ رہیں! حضرت نے فرمایا کہ ہمیں آگ نہ اس دُنیا میں جلاتی ہے۔ اور نہ اگلی دُنیا میں جلائے گی :- لوگوں نے پوچھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟ آپ نے اپنی جُوتی اُن کو دی۔ اور فرمایا۔ کہ وہ اُسے آگ میں پھینک دیں۔ اور پھر دیکھیں۔ کہ وہ اُس کو جلاتی ہے یا نہیں :- چنانچہ جب آپ کی جُوتی آگ میں پھینکی گئی۔ تو وہ بالکل نہ جلی۔ بالکل جُوں کی تُوں سلامت رہی! اِس کرامت کو دیکھ کر اُس جماعت کے تمام مجُوسی اُسی وقت اسلام لے آئے!

اب ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر اِس بات کا اندازہ لگائیں۔ کہ کیا حضرت عمرؓ پر غیب و شہادت روشن تھا یا نہیںلے؟ اور اسی طرح حضرت معین الدین چشتیؒ کے لئے کائنات کی تمام قوتیں تابع تھیں یا نہیں؟ اور اُنہوں نے پھر اِس کے نتیجہ کے طور پر بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کیا یا نہیں؟

اس بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عام طور پر ہمارا علم "اِتقا" تک محدُود ہے۔ اور انسان نے حضرت آدمؑ سے لے کر اِس وقت تک جو "رُوحانی ترقّی" کی ہے۔ ہم اُس سے بالکل بے خبر ہیں۔ لہٰذا ہم قرآن کے الفاظ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے راز کو سمجھ نہیں سکے :-

آئیے! اب ہم دیکھیں۔ کہ جو لوگ اِس راز سے آشنا ہیں۔ وہ زیرِ بحث مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

فتح الرّبانی (جو کہ شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی تصنیف ہے) کے ترجمہ میں ذیل کا نظریہ درج ہے :-

"ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی ہمّت اور قلبِ مُبارک سے اولیاء اللہ کے دلوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ وہی اُن کو خوشبو دار اور معطّر فرماتے ہیں۔ اور آپ ہی اُن کے باطنوں کو صفائی اور زینت بخشتے ہیں۔ آپ ہی اُن کے لئے قُربِ الٰہی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ حضُور ہی باطنوں اور دلوں کے، اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں :- جب تم ذاتِ الٰہی کی طرف ایک قدم بڑھو۔ تو جناب نہایت خوش ہوتے ہیں" :- وغیرہ وغیرہ :-

اِسی طرح اولیائے کرام کے بارہ میں اِسی کتاب میں یہ عبارت درج ہے :-

"ایمان والے عارفِ کامل کی دو آنکھیں ظاہر اور باطن میں ہیں :- ظاہری آنکھوں سے وہ زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے، اور باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا کی ہیں اُن کو دیکھتا ہے :- پھر اُس کے قلب سے حجاب اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو بلا تشبیہ اور بغیر کیفیت کے مشاہدہ کرتا ہے..... جو شخص اِس مقام پر پہنچا۔ وہ زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے :- وہ اسرار کا دروازہ ہے۔ اور اُسی کے

لے "غیب" کے مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھیں فصل "رسولِ پاکؐ کی غیب دانی" (باب ششم)

Marfat.com

پاس دلوں کے خزانوں کی چابیاں ہیں ۔ جو حق تعالیٰ کے خزانے ہیں ۔ یہ چیز مخلوق کی عقل سے باہر ہے ۔
جو کچھ اُس میں ظاہر ہوتا ہے ۔ وہ اُس کے پہاڑ سے ایک ذرہ ۔ اور اُس کے سمندر سے ایک قطرہ ہے ۔ اور
اُس کے آفتاب سے ایک چراغ ہے ...... جس شخص کا دل صحیح ہو ۔ اس کا دل رب کو دیکھتا ہے ۔
اُس کے اور آسمان کے درمیان سے حجاب اُٹھ جاتے ہیں ۔ اور اسرار صدیقوں کے سینوں میں رب العالمین
کے اسرار کے انوار کے ساتھ مبہر کرتے ہیں ۔ یہ سینے روشنی والے ہوتے ہیں ...... جن انسان
اور فرشتے، غرض سب طرح کی مخلوقات اُن کی خدمت کے واسطے کمربستہ رہتی ہے ۔ ....
بست وکن واللہ تعالیٰ نے اُن کے سپرد کر رکھا ہے ۔ اُنہی کی برکت سے بارش اُترتی اور زمین اُگاتی ہے ۔
تمام مخلوق اُن کی رعیت ہے" ۔ وغیرہ ۔ وغیرہ ۔

اب یہاں یہ نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ مولانا مودودی صاحب اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے نظریات
میں اتنا تضاد کیوں ہے ؟

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے ۔ کہ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں ۔ ایک میں قانون دیا ہوا ہے ۔ دوسری میں اُس قانون سے
کی استثناء ہوتی ہے ۔ جو علماء انسان میں کسی قسم کی روحانی قوت کے قائل نہیں ۔ اُن کی قرآنِ پاک کی قانون والی آیات
پر تو نظر ہوتی ہے ۔ لیکن دوسری آیات پر نہیں ہوتی !

مثلاً قانون یہ ہے وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] اور تمام قرآن اِس قانون سے بھرا پڑا ہے ۔ یعنی
کوئی پیغمبر یا ولی کیوں نہ ہو ۔ اُس پر یہی قانون جاری و ساری ہے ۔ اور کسی نبی یا خدا رسیدہ انسان کا اس کے بغیر ایمان
ہو ہی نہیں سکتا ۔ کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہی ہے ۔

لیکن وہی خدا جس نے مندرجہ بالا آیت نازل فرمائی ۔ اس کی استثنا میں یُوں بھی فرماتا ہے :-

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ[2]

اب اس استثنا سے پہلی آیت پر بقلم خط تنسیخ نہیں کھچ جاتا ۔ یعنی پہلی آیت قائم رہتی ہے ۔ کہ غیب کا علم صرف
خدا کو ہی ہے ۔ لیکن مشیت ایزدی یہ بھی ہے ۔ کہ خدا اپنے علم الغیب (یعنی علم بالذات) کو جسے چاہے ۔ انعام کے
طور پر عطا فرمائے ۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کو جس حد تک علم غیب ہوتا رہا ہے ۔ وہ اس
استثنا کی بنا پر ہی ہوتا رہا ہے !

یہی بات لفظِ شفیع میں بھی پائی جاتی ہے !

---

[1] اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب ۔ (سورۃ ۱۱ ہود ۔ آیت ۱۲۳)

[2] اور وہ نہیں پاتے اُس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے (سورۃ ۲ البقرۃ ۔ آیت ۲۵۵)

Marfat.com

قانون یہی ہے : مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ[1]

لیکن اس کی استثنا بھی "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ"[2] کے الفاظ میں موجود ہے!

چونکہ موجودہ بحث میں ہمارا زیادہ تر تعلق علمِ غیب سے ہے۔ لہٰذا ہمیں آیت الکرسی کے الفاظ "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ"[3] پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

سب سے پہلے اس آیت میں لفظ "عِلْمِهٖ" (یعنی خدا کے علم) کو لیجئے: یہ ظاہر ہے کہ خدا کے علم کی نہ حد ہے۔ اور نہ انتہا: لہٰذا اس علم سے مراد تمام خدائی علم ہے۔ جس میں رُوح کا علم۔ معرفت کا علم۔ لدُنّی علم اور غیب کا علم شامل ہیں:

اب یہاں پہلا سوال یہ ہے کہ اس رُوح۔ معرفت۔ لدُنّی اور غیب کے علم میں انسانوں کو کتنا حصہ ملتا ہے؟ اس کی مقدار "بِشَیْءٍ" کے الفاظ میں بتائی گئی ہے۔ جن کی تشریح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یوں فرماتے ہیں۔ کہ اگر خدا کے علم کو پہاڑ سے تشبیہ دی جائے۔ تو انسان کو اُس میں سے ایک ذرّہ کا علم ہوتا ہے: اگر آفتاب سے تشبیہ دی جائے۔ تو انسان کا علم چراغ کے برابر ہوتا ہے: اور اگر سمندر سے دی جائے۔ تو انسان کے علم کی مقدار ایک قطرہ کے برابر ہوتی ہے! لیکن انسان کے لئے یہ ایک ذرّہ۔ چراغ یا قطرہ بھی اتنی وسعت رکھتا ہے۔ کہ دُنیا و مافیہا کا تمام علم اُس میں سما جاتا ہے:

اس کی وجہ قرآنی الفاظ "وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"[4] میں مضمر ہے: ہم نے اس سلسلہ میں جس نکتہ پر کما حقہٗ غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے خدا کے علم کی وسعت کو زمین اور آسمان کی وسعت جتنا سمجھا۔ اور پھر خیال یہ کیا۔ کہ اگر خدا کسی کو دُنیا اور مافیہا کی خبروں سے مطلع کر دے۔ تو پھر ہمیں گویا خدا جتنا علم ہو گیا! ہمارے خیال کی یہ اُفتاد ہی غلط ہے: مندرجہ بالا قرآنی الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا۔ کہ جس طرح ہمارے رہائش کے مقام (یعنی محل یا بنگلہ) کی وُسعت بہت بڑی ہوتی ہے۔ لیکن ہم جس کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ اُس کی وسعت، رہائشی مکان کی وُسعت سے سینکڑوں درجہ کم ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح زمین اور آسمانوں کی تمام وسعت خدا تعالیٰ کی صرف

---

[1] اُس کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی اور نہ سفارشی (سورۃ ۳۲ السجدۃ۔ آیت ۴):

[2] وہ کون ہے جو اُس کے ہاں سفارش کرے بغیر اُس کے حکم کے (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۵۵)

[3] یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں سے عوام الناس کچھ احاطہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اُن کے جن کو خدا چاہے: (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۵۵):

[4] اُس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین (سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲۵۵)

Marfat.com

کرسی میں سمائی ہوئی ہے! اندریں حالات خدا تعالیٰ کی اپنی وسعت کا حد و شمار ہی نہیں ہو سکتا: چنانچہ ہماری غلط فہمی اب اس امر میں رہی۔ جب ہم نے یہ سمجھا۔ کہ خدا کی ذات سَبْعَ سَمٰوٰت وَالْاَرْض تک محدود ہے:
دراصل خدا کے نزدیک دنیا و مافیہا ایک ذرّہ کے برابر ہے۔ اور اس کی اپنی ذات لامحدود! لہٰذا اگر خدا کسی کو "دنیا ومافیہا" کا علم بھی دے دے۔ تو اس نے اپنے بے انتہا علم میں سے گویا ایک ذرّہ کا علم دیا۔ لیکن ایک انسان کے لئے وہی ذرّہ جتنا علم اتنی وسعت رکھتا ہے۔ کہ دنیا و مافیہا کا تمام علم اس میں سما جاتا ہے!

اب دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ یہ خدائی علم کن لوگوں کو ملتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے "اِلَّا بِمَا شَآءَ" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی کوئی تخصیص نہیں۔ گویا خدا جس کو چاہے اُسے اپنا علم عطا فرماتا ہے:

لیکن گذشتہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک یہ علم زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کو ہی نصیب ہوا: لیکن چونکہ نبیوں کا سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب یہ علم صرف اولیائے کرام کے لئے ہی وقف ہے! لیکن اگر اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تو یہاں نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ"[1] کے الفاظ پھر کن لوگوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان الفاظ کا اطلاق "خدا رسیدہ" انسانوں کے سوا اور کسی کے لئے ثابت ہو ہی نہیں سکتا! یہ وہ ہستیاں ہیں جن کو اسلامی اصطلاح میں اولیائے کرام کہا جاتا ہے۔ اور جن کو رسولِ پاک نے نہ صرف "عُلَمَآءُ اُمَّتِی" کے الفاظ سے یاد فرمایا۔ بلکہ آپ نے ان کو "کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْل" کا رتبہ بھی عطا فرمایا: اسی لئے رب العزت نے ان کو "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"[2] کا سرٹیفکیٹ مرحمت فرمایا ہے: یہی بزرگ درحقیقت ناموسِ رسول کی لاج رکھنے والے ہیں۔ اور یہ تعجب کا مقام نہیں۔ اگر تمام اسلامی دنیا ان کو اب "آلِ محمدؐ" کے نام سے شب و روز درود بھیجتی ہے!

اس سلسلہ میں ایک اور بات جو سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جو لدنی علم انبیاء علیہم السلام کو ملا ہے۔ وہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے الفاظ نازل ہونے سے پہلے ملا ہے لیکن محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حقیقی جاں نثاروں یعنی اولیائے کرام کو، جو اب تک علم ملا ہے۔ یا آئندہ ملے گا۔ وہ "تکمیل شدہ" دین کا علم ہے۔ یعنی وہ علم جس میں نعمت کا اتمام ہو چکا ہے!

---

[1] سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲۵۵

[2] تم بہتر ہو ان سب اُمتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں: (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۱۰)

Marfat.com

اب اگر ہم انبیاء علیہم السلام ۔ صحابہ عظام رضؓ ۔ اور اولیائے کرامؒ کے علم کا ایک شکل کی صورت میں نقشہ کھینچیں ۔ تو صورتِ حالات کچھ اس طرح کی ہوگی :۔

(مندرجہ ذیل شکل کا مطالعہ نقطہ الف سے کریں ۔ پھر نقطہ ب پر آئیں ۔ اور اس کے بعد نقطہ ج اور د پر :۔ یہ گویا اسلام کی ابجد ہے !)

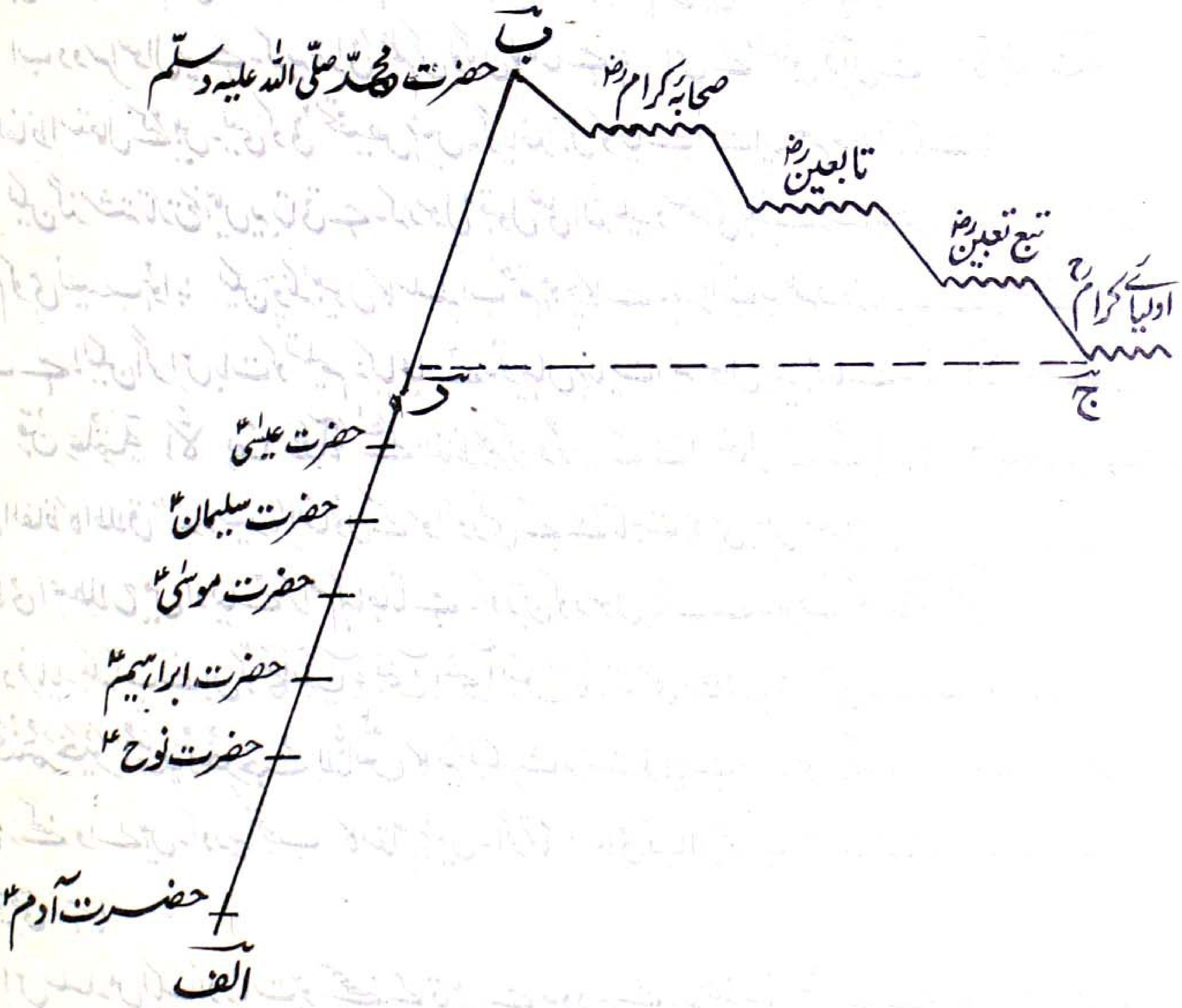

اس شکل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے ۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر رسول پاکؐ تک جو لدُنی علم انبیاء علیہم السلام کو ملا ہے ۔ وہ "تدریجی ارتقا" کی صورت میں ملا ہے :۔ یعنی اگر حضرت آدمؑ کا علم "بنیاد" کی حیثیت رکھتا ہے ۔ تو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم "معراج" کی حیثیت ! جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۔ یہ اس وجہ سے ہے ۔ کہ رسولِ پاکؐ کو جو علم ملا ۔ وہ "تکمیل شدہ" دین کا علم ملا ۔ یعنی وہ علم جس میں نعمت کا اتمام ہو چکا ہے ۔ اور یہ اتمام "خدا کے دیدار" کی نعمت میں مضمر ہے ! اسی لئے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے ۔ کہ مرتبہ "خلّت" حضرت ابراہیمؑ کو ملا ۔ "کلام" حضرت موسیٰؑ کو ۔ اور "دیدارِ خدا" محمد صلعم کو ! اسی وجہ سے حضورؐ کے حقیقی امتیوں (یعنی اولیائے کرام) کو جو قربِ خداوندی نصیب ہوتا ہے ۔ وہ دوسری امتوں کے پیغمبروں کے لئے بھی ممکن نہیں ۔ جب تک کہ وہ حضورؐ پر

Marfat.com

ایمان نہ لائیں۔ اور حضورؐ کی سُنّت پر عمل پیرا نہ ہوں! اسی بنا پر اگر آپ ایک اُفقی خط نقطہ ج سے کھینچیں۔ تو وہ خط آ اور ب کو نقطہ د پر کاٹے گا؛ گویا اولیائے کرام کا مرتبہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے بھی اُونچا ہے!

یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ (نزول کے بعد) جب حضورؐ کے اُمتیوں میں سے ایک "مردِ کامل" (یعنی حضرت امام مہدیؑ) کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ اور اس بیعت کے بعد جب نماز کا وقت آئے گا۔ تو امام مہدی حضرت عیسیٰ کو فرمائیں گے۔ "قَدِّمْ"۔ (یعنی آپ آگے بڑھ کر نماز کرائیں۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ امام مہدیؑ کو یہ کہہ کر امامت کے لئے آگے کر دیں گے۔ کہ "اَنْتَ اِمَامُهُم" (یعنی آپ ہی اس وقت عالمِ انسانیت کے امام ہیں)!

یہاں اگر صرف ایک نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ تو تمام مسئلہ مُکمّل طور پر حل ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم سب کا ایمان ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ نزول کے بعد حضورؐ کی شریعت کی پیروی کریں گے۔ یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے۔ جب وہ اولوالعزم پیغمبر اس بات پر پُورے طور پر مطمئن ہوں گے۔ کہ جو رُوحانی ترقی اُنہوں نے اپنی شریعت پر عمل پیرا ہو کر کی ہے۔ رسولِ پاکؐ کی شریعت پر عمل کرنے والے اولیائے کرام اُن سے بہتر مراتب حاصل کر چکے ہیں! اور اس ترقی کا راز صرف اس امر میں مضمر ہے۔ کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چُکا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ تک تمام پیغمبروں کو جو علم ملا۔ وہ "اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ"[1] کے الفاظ نازل ہونے سے پہلے کا علم ہے۔ لیکن حضورؐ کو اور حضورؐ کی شریعت پر عمل کرنے والوں کو جو علم ملا ہے۔ وہ "تکمیل شُدہ" دین کا علم ملا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق صرف "دیدارِ الٰہی" کا ہے! بس یہی ایک بات حضرت عیسیٰؑ کو حضورؐ کی شریعت کی پیروی کرنے پر مجبُور کرے گی! لہٰذا جن علماء کا مسلک یہ ہے۔ کہ جہاں تک خدا رسیدہ بزرگوں کا تعلق ہے نہ اُن کو نفع و ضرر پر اقتدار ہوتا ہے۔ نہ اُن پر غیب و شہادت روشن ہوتا ہے۔ اور نہ وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا حضرت عیسیٰؑ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور یہ کس طرح توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ پر حضرت عیسیٰؑ بیعت کر سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس مسلک کے علماء کے اس قسم کے اعتقاد میں زیادہ تر محض الفاظ کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ جو تعمق کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے؛ یہ ایک معمولی مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے؛ مثلاً اگر ہم یہ کہیں۔ کہ فلاں ولی کی ایک نظر نے فلاں کُنبہ والوں کے دلوں کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کیا۔ تو ان حضرات کا کہنا یہ ہوتا ہے۔ کہ ہدایت ہمیشہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ کسی شخص میں یہ طاقت نہیں۔ کہ وہ کسی کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کر سکے! اس سلسلہ میں جس نکتہ پر کما حقّہٗ غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ دُنیا "دارالاسباب" ہے۔ لہٰذا گو یہاں ایک انسان کو ہدایت صرف خدا کی طرف سے ہی ملتی ہے۔ لیکن اس ہدایت کا ذریعہ خدا خود بندوں کو ہی بناتا ہے!

---

[1] سورة ۵ المائدہ۔ آیت ۳

مثلاً جب ہم کسی حکیم کی دوا سے شفایاب ہوتے ہیں۔ تو گو حقیقت یہی ہے۔ کہ شفایابی شافیٔ مطلق کے کرم کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم کہتے یہی ہیں۔ کہ ہماری فلاں مرض کو فلاں طبیب کے علاج سے آرام ہُوا! اس قسم کے قول سے کوئی شرک سرزد نہیں ہوتا:۔ چنانچہ اولیائے کرام کو اگر کسی کی ظلمت وضلالت کو دُور کرنے پر اقتدار ہوتا ہے۔ تو وہ بالکل اُسی حد تک ہوتا ہے۔ جس حد تک کہ کسی طبیب کو کسی کی مرض کی شفا پر اقتدار ہوتا ہے:۔ لہٰذا جس طرح یہ کہنا شرک نہیں۔ کہ ہماری فلاں مرض کو فلاں طبیب کے علاج سے آرام ہوا۔ اُسی طرح یہ کہنا بھی شرک نہیں ہوسکتا۔ کہ فلاں بزرگ کی نظر نے فلاں کنبہ کے افراد کی ظُلمت وضلالت کو دُور کیا!

اس کی تصدیق مندرجہ ذیل مثال سے بھی ہوگی:۔ قرآن شاہد ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کا ایک معجزہ یہ تھا۔ کہ اُنہوں نے خدا کے حکم سے کوڑھیوں کو اچھا کیا:۔ اب اگر ہم اُن کا دوسرا معجزہ بیان کرتے وقت "خدا کے حکم سے" کے الفاظ حذف کر دیں۔ اور صرف یہ کہیں۔ کہ "آپ نے مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں"۔ اور ان الفاظ پر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ چونکہ نبی کو "نفع وضرر پر اقتدار نہیں"۔ لہٰذا دوسرا معجزہ بیان کرتے وقت بھی "خدا کے حکم سے" کے الفاظ ضرور دُہرانے چاہئیں۔ تو یہ اعتراض وزنی نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم جب بھی یہ کہتے ہیں۔ کہ "حضرت عیسیٰؑ نے مُردوں کو زندہ کیا"۔ تو اُس وقت یہ امر تسلیم شدہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ تمام معجزے خدا کے حکم سے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گویا "خدا کے حکم سے" کے الفاظ دُہرانے یا ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں:۔

اگر یہ درست ہے تو پھر جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰؑ نے کوڑھیوں کو اچھا کیا۔ یا مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں۔ تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا۔ کہ آپ نے ان لاچار لوگوں کو فائدہ پہنچایا:۔ اب کسی کا یہ کہنا کہ "نبی کو نفع پر اقتدار نہیں" محض لفظوں کا ہیر پھیر بن کر رہ جاتا ہے!

اسی طرح اگر ہم ہند و پاکستان کے خطہ پر نظر ڈالیں۔ تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ کہ ابتدا میں اگرچہ درۂ خیبر کی طرف سے محض چند صد یا چند ہزار مسلمان ہی ہندوستان میں آئے تھے۔ لیکن اس وقت اس برِ صغیر میں جو اُنتیس تیس کروڑ مسلمان نظر آتے ہیں۔ تو یہ کس کی فیضِ نظر کا نتیجہ ہیں؟ گویا اتنی بڑی کایا کس نے پلٹی؟ اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تمام کارنامہ صرف حضرت ہجویریؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہم کی فیضانِ نظر کا نتیجہ ہے:۔ انہی بزرگ ہستیوں نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی ظُلمت وضلالت کو دُور کیا۔ اور اُنہوں نے ہی غیر مسلموں کو اسلام جیسی نعمت سے مالا مال کیا! اب کیا یہ بے انصافی نہیں۔ کہ بجائے اس کے کہ ہم ان برگزیدہ ہستیوں کے کارناموں کو سنہری حروف میں لکھیں۔ ہم ان کی کاوشوں اور کوششوں کو ان الفاظ سے یاد کریں۔ کہ "نہ ان کو نفع وضرر پر اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ اور نہ وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت وضلالت کو دُور کرسکتے ہیں"؟ اور یہ صرف اس بنا پر کہ اسلام شخصیت پرستی کا قائل نہیں:۔

Marfat.com

لیکن کیا اس قسم کی احسان ناشناسی "مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ"[1] کے تحت میں نہیں آتی ؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم قرآن کے لفظ "تزکیہ" سے ناآشنا ہیں : رب العزت نے اپنے حبیبؐ پر اپنے "دیدار کی نعمت" کے بعد جو سب سے بڑا احسان کیا۔ وہ یہ ہے کہ وہ نظر عطا کی۔ جس سے انسان خدا کی طرف مائل ہوں : اس نظر میں وہ کشش ہوتی ہے۔ وہ مقناطیسی قوت ہوتی ہے۔ کہ جس پر وہ پڑ جائے۔ اُسے معاً گھائل کر دیتی ہے۔ اور اُس کی ظلمت وضلالت کو دُور کر دیتی ہے۔ لیکن یہ نظر پڑتی "مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ" کے اُصول کے تحت ہی ہے : یعنی جب یہ مشیّتِ ایزدی ہو جائے۔ کہ فلاں شخص کو ہدایت نصیب ہو۔ تو اُس کے حالات کو پھر سازگار بنا دیا جاتا ہے!

اِس سلسلہ میں حضرت عمرؓ اور اُن کی ہمشیرہ کی مثال بہترین ہے : پچھلے اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ انسانیت کے "رقیب" کو کھُلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے۔ انسانوں پر دام بچھائے : بالکل اُسی طرح انبیاء علیہم السلام کو بھی یہ اجازت ہوتی ہے۔ کہ وہ وقت وقت کے حالات کے مُطابق اپنے "منصوبے" پیش کرتے رہیں : چنانچہ اسلام کے دَورِ اولین میں خدا کے حبیبؐ نے جب یہ خواہش ظاہر کی۔ کہ آپؐ کو یا عمرؓ نصیب ہو۔ یا ابوجہل۔ تو مشیّتِ ایزدی نے حضرت عمرؓ کو پسند کیا۔ کہ "جوہر قابل" اُنہیں میں تھا! چنانچہ صورتِ حالات نے یہ رُخ اختیار نہیں کیا۔ کہ وہ یکدم سامنے آجائیں اور اسلام لے آئیں : بلکہ پہلے کسی کی فیض نظر نے آپ کی ہمشیرہ کو مستفیض فرمایا! جب وہ گھائل ہو چکیں۔ تو بہن نے بھائی کو آگ لگائی! بس پھر کیا تھا۔ ایک پروانہ گھر کی چار دیواری کے اندر جل رہا تھا۔ تو دوسرا شمعؐ کا طواف کرتا جاتا تھا۔ اور پوچھتا جاتا تھا ؎

اے شمعؐ! تجھے کرتا ہے پروانہؓ پیار کیوں ؟
یہ جانؓ بیقرار ہے تجھؐ پر نثار کیوں ؟

اس قسم کی نظر شمعؐ کو کب ملی ؟ اور کیوں ملی ؟ شمعؐ کو یہ نظر اُس وقت ملی۔ جب "حسن" نے اپنی تجلیات کو اپنے "ناز" سے کچھ عرصہ کے لئے معرض التوا میں ڈال دیا تھا : اِس التوا سے "عشق" اِس قدر بیتاب ہُوا کہ "حسن" کو قسم کھانی پڑی :۔

وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۙ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ۝[2]

اور اِس قسم کے بعد قیامت تک کے لئے تسلی کر دی :۔

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ۝[3]

اور پھر تسلی کے بعد یہ خوشخبری دی :۔

---

[1] جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا :

[2] دن کی قسم اور رات کی جب یہ وہ ڈالے کہ تمہیں تمہارے رب نے نہیں چھوڑا اور نہ مکروہ جانا (سورۃ ۹۳ الضحیٰ آیات ۱ تا ۳)

[3] تمہارا مستقبل ماضی سے ہمیشہ بہتر ہوگا (ایضاً۔ آیت ۴)

Marfat.com

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى[1]

اور پھر عطا کیا کیا؟ وہ چشمِ فیض رساں جس نے تمام صحابۂ کرام کو "درخشندہ ستارے" بنایا!

اور اسی چشمِ فیض رس نے جب چند چیدہ چیدہ ہستیوں کو ہندوستان کی طرف بھیجا۔ تو مؤخر الذکر نے اس ملک میں کئی کروڑ انسانوں کی ظلمت و ضلالت کو دُور کر کے اسلام کے نُور سے منوّر کیا!

ہم نے "تزکیہ" کے لفظ کا صرف یہ مطلب سمجھا۔ کہ وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دِلوں پر اخلاقِ حسنہ کی خوبیاں نقش کی جائیں۔ اور بُرے طور طریقوں سے منع کیا جائے: یہ "تزکیہ" نہیں ہے۔ بلکہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے: "تزکیہ" کا صحیح مطلب یہ ہے۔ کہ کسی کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کیا جائے۔ اور اُس کے دل کو نُور سے منوّر کیا جائے۔ اور یہ صرف کسی فیض رس انسان کی نظر ہی کر سکتی ہے![2]

اِس سلسلہ میں ہم نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اولیائے کرامؒ (انبیاء علیہم السلام کو ایک لمحہ کے لئے علیحدہ رہنے دیجئے۔ کہ وہ تو معصوم ہوتے ہیں) کی زندگیوں کے اصول کو صحیح طور پر نہیں سمجھا: کیا اِس قسم کی برگزیدہ ہستیاں کبھی بھی یہ کہتی ہیں۔ کہ جب وہ لوگوں کی ظُلمت و ضلالت کو دُور کرتے ہیں۔ اور یا جو کشف و کرامات اُن سے ظہور میں آتی ہیں۔ اُن کے بانی وہ خود ہیں؟ اُن کی زندگی کا اصول تو قرآن کی اِس آیت میں مضمر ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ

(سورۃ ۴ النسآ آیت ۹)

(یعنی اے انسان! جو کچھ تجھے بھلائی پیش آتی ہے۔ وہ خدا کی جانب سے ہے۔ اور جو بُرائی پیش آتی ہے۔ وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے!)

اِنسان چونکہ خطا سے خالی نہیں۔ لہٰذا اولیائے کرام سے جو لغزش ہوتی ہے۔ اُس کا تدارک تو وہ توبہ وغیرہ سے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو اُنہیں بھلائی پیش آتی ہے۔ وہ اُسے "مِنَ اللّٰہ" کہتے ہیں! اب "مِنَ اللّٰہ" خواہ ۔

معرفت کا علم ہو۔ غیب کا علم ہو۔ رُوح کا علم ہو یا لدنّی علم ہو!

کشف ہو یا کرامت ہو!

یا پروں کے بغیر طاقتِ پرواز ہو!

یہ سب کچھ خدا کی دین ہے! ان باتوں سے وہ خدا نہیں بن جاتے۔ البتہ وہ خدا کے نائب اور خلیفہ ضرور بنتے ہیں! یعنی وہ رب نہیں ہوتے۔ لیکن رب نما ضرور ہوتے ہیں! خالی نہیں ہوتے۔ پُر ہوتے ہیں!

---

[1] اور بیشک قریب ہے۔ کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا۔ کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ (سورۃ ۹۳ الضحیٰ آیت ۵)

[2] مزید تشریح کے لئے دیکھیں صفحہ ۲۱۹

محض بھرے ہوئے نہیں ہوتے۔ چھلکتے ہیں! بے عمل کو دھکیلتے ہیں! مکدّر کو مصفّٰی کرتے ہیں! خالی کو بھرتے ہیں! بدمعاشوں کو ایک دفعہ نگاہ کرکے صراطِ مستقیم پر لاتے ہیں! اور پھر منازل طے کراتے ہیں! اور ولی اللہ بناتے ہیں![1] اور جس طرح پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ سب کچھ مَنْ یَّھْدِ ہِ اللّٰہُ[2] کے اصول کے تحت ہی ہوتا ہے!

اب اگر دُنیا اولیاء اللہ سے فیض حاصل کرکے اُن کو اپنا ممد و معاون سمجھے۔ تو اس میں قباحت کیا ہے؟ اگر کسی طبیب سے شفا حاصل کرنا شرک نہیں تو ایک بزرگ سے نفع حاصل کرنا "مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کیوں ہوجاتا ہے؟ یہ "بِاِذْنِ اللّٰہِ" کیوں نہیں رہتا؟

اولیائے کرام اگر "عزیز جہاں" ہوتے ہیں۔ تو خدا کے سامنے اپنی عجز و انکساری کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہی اُن کا "کسب کمال" ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے بھی لکھا جاچکا ہے۔ ایک ولی کے بارے میں خدا خود فرماتا ہے۔ کہ مَیں اُس کے کان ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ سُنتا ہے! میں اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے! وغیرہ۔ وغیرہ ؛

اب جو لوگ اس کیفیت کے قائل نہیں ہیں اُن کی حالت اس لحاظ سے کس قدر ناقابلِ فہم ہے۔ کہ ایک شخص "طب" کا علم حاصل کرکے "طبیب" تو بن سکے۔ لیکن ایک پیغمبر یا ولی "معرفت" کا علم حاصل کرنے کے باوجود زیادہ سے زیادہ صرف صالح یا متقی ہی ہوسکے۔ اس سے اُوپر جانا اُس کے بس کا روگ ہی نہ ہو!

ایک "طبیب" تو دنیا جہان کو نفع پہنچا سکے۔ لیکن ایک پیغمبر یا ولی کسی کو نفع پہنچانے سے قاصر ہی رہے! اس نکتہ پر پہنچ کر ہم پھر دھوکا کھاتے ہیں! یعنی کسی سے فیض پانے کو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے خلاف متصوّر کرتے ہیں! ہم یہ بالکل بھول جاتے ہیں۔ کہ یہ دُنیا "دارالاسباب" ہے؛ یعنی خدا بذاتِ خود یہاں آکر کچھ نہیں کرتا۔ اپنی مخلوق سے ہی سب کچھ کرواتا ہے!

مزدُور کو رزق، کارخانہ کے مالک سے دلواتا ہے۔ حالانکہ رازق خود ہے!

مریض کو شفا، طبیب کی بنائی ہوئی دوا سے دلواتا ہے۔ حالانکہ شافی خود ہے!

شاگرد استاد سے علم حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ استاذ الاساتذہ خدا خود ہے!

---

[1] یہ الفاظ مولوی محمد عمر صاحب اچھروی کی کتاب "مقیاس حقیقت" (صفحہ ۱۳۸) سے لئے گئے ہیں؛

[2] جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔

Marfat.com

بالکل اسی طرح دُنیا کے لوگ رُوح کا علم، پیغمبروں اور اولیاؤں سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ "ھادی" خدا خود ہے!

اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ خدا نے دُنیا کو "دارالاسباب" بنایا ہے!

اب یہ کیا مصیبت ہے؟ کہ کارخانہ کے مالک کو تو مزدوروں کی روزی کا "سبب" سمجھ لیا جائے!

طبیبوں کو، مریضوں کی شفا کا "مؤجب" سمجھ لیا جائے!

اُستاد، شاگردوں کے "فیض رساں" سمجھ لئے جائیں!

سمندر میں جہاز چلانے والوں کو جہاز کا "کپتان" تسلیم کر لیا جائے!

ایک ملک کے بادشاہ (یا پریذیڈنٹ) کو ایک بڑی سے بڑی مملکت پر پورا اختیار اور اقتدار حاصل ہو!

لیکن جب پیغمبروں کی باری آئے۔ تو نہ اِن بیچاروں میں کوئی غیر معمولی طاقت ہو۔ اور نہ نفع و ضرر پر اُن کو کسی قسم کا اقتدار ہو!

اور باوجود اس بات کے کہ اُن میں سے کوئی اُس مقام تک بھی ہو آئے۔ جہاں جبریل کے پر جل جائیں۔ نہ غیب و شہادت اُس پر روشن ہو۔ اور نہ وُہ کسی کی ظُلمت و ظلالت کو دُور کر سکے!

ایسے حالات میں ایک انسان سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ کہ ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست!

اور جب پیغمبروں کی یہ حالت ہو۔ تو پھر اولیائے کرام بیچارے تو کس گنتی میں آ سکتے ہیں؟

اِسی سلسلہ میں "سیارہ ڈائجسٹ"۔ لاہور (قرآن نمبر۔ جلد سوم۔ اپریل ۱۹۷۰ء) میں مولانا ابوالاعلیٰ مودُودی صاحب کا ایک مضمون زیرِ عنوان "داعیِ قرآن، قرآن کی نظر میں" شائع ہوا ہے:۔ (اُس میں بھی مولانا کا وہ اقتباس موجود ہے۔ جو اِس فصل کے شروع میں درج کیا گیا ہے۔) جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی بابت زور صرف اسی بات پر دیا گیا ہے۔ کہ تمام پیغمبر محض بشر ہوتے ہیں:۔ لیکن اِس بات کے باوجود اُس اقتباس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے۔ کہ خدا کے پیغام پر عمل کر کے پیغمبر خود اور اُن کے پیرو بھی "خدا رسیدہ" ہو سکتے ہیں! لیکن "خدا رسیدہ" ہو کر اُن میں کیا خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کا تو مطلقاً کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اگر ذکر ہے۔ تو صرف اِس بات کا کہ جہل و نادانی پھر عام طور پر "خدا رسیدگی" کو "خدائی کا ہم معنی" بنا لیتی ہے!

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "خدا رسیدگی" کو "خدائی کا ہم معنی" بنانا تو یقیناً غلط ہے۔ لیکن خدا رسیدگی کسے کہتے ہیں؟ یا اِس رُتبہ پر پہنچ کر ایک انسان میں کیا خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں؟ اس کے متعلق "سیارہ ڈائجسٹ"

Marfat.com

کے تینوں قرآن نمبروں میں (جن کے صفحات پندرہ سو سے بھی اوپر ہیں)۔ ایک لفظ بھی موجود نہیں! اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ مولانا اور اُن کے ہمنواؤں کی نظر صرف "اِتقا" تک محدود ہے۔ یعنی قرآن پر عمل کر کے لوگ "متقی" بن سکتے ہیں۔ اِس سے آگے نہ اُن کی نظر ہے۔ نہ پہنچ!

اسی لئے وہ مندرجہ بالا مضمون میں اپنے نظریئے کے ثبوت میں قرآن کی اِس قسم کی آیات درج کرتے ہیں :۔

"اُنہوں (کفار) نے کہا۔ کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک تم ہمارے لئے زمین میں سے ایک چشمہ نہ نکال دو .... یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ ....

اے محمدؐ! اُن سے کہو پاک ہے میرا رب۔ کیا میں ایک پیغمبر انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" (سورۃ ۱۷، بنی اسرائیل۔ آیات ۹۰۔۹۳) :۔

اِن آیات سے مولانا نے ثابت یہ کیا ہے۔ کہ چونکہ جن باتوں کا کفار نے ذکر کیا ہے۔ وہ حضورؐ کے اپنے بس کی بات نہیں۔ لہذا وہ بشر ہی ہیں۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں!

مولانا نے یہاں جس نکتہ پر غور نہیں فرمایا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اِس آیت سے قرآن کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے۔ کہ پیغمبروں سے اس قسم کی باتیں از خود سرزد نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ اِس قسم کی باتوں کو ایمان لانے کے لئے شرط مقرر کرنا بالکل لغو بات ہے!

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جائے۔ اور اُس سے یہ کہے۔ کہ وہ اسکے علاج کیلئے تب تیار ہوگا۔ جب وہ پہلے اُسے اپنی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری دکھائے۔ تو کیا کوئی ڈاکٹر ایسے مریض کی بات بھی سننے کیلئے تیار ہوگا؟ اس قسم کی بات ڈاکٹر کی توہین کے مترادف ہے :۔ مندرجہ بالا آیات میں قرآن کو بھی صرف یہی جتانا مقصود ہے!

اسکا ثبوت اِس سے ملتا ہے۔ کہ ایک غزوہ کے موقع پر جب پانی کی بہت قلت تھی۔ تو صحابہ کرام نے حضورؐ سے اس بارہ میں شکایت کی: آپ نے فرمایا۔ کہ جس کے پاس تھوڑا سا پانی ہے۔ وہ لے آئے :۔ ایک شخص پانی کا ایک پیالہ لے آیا: آپ نے اس پیالہ میں اپنی انگلیاں ڈال دیں۔ اور پانی کا چشمہ جاری ہوگیا جس سے تمام صحابہ کرام نے اپنی تمام ضروریات پوری کرلیں!

اسی طرح مندرجہ بالا آیت میں ایک اور نشانی جو پیغمبری کے ثبوت کے سلسلہ میں مانگی گئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضورؐ آسمان پر چڑھ جائیں :۔ کیا معراج کے موقع پر حضورؐ آسمان پر نہیں چڑھے تھے؟

اس سے ثابت ہوا۔ کہ مندرجہ بالا قرآن کی آیات کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ حضورؐ از خود چشمہ جاری نہیں کر سکتے تھے۔ یا آسمان پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ بلکہ اِس قسم کی باتوں کو ایمان لانے کی شرط مقرر کرنا گستاخی کے مترادف ہے!

جس طرح اوپر کہا گیا ہے۔ اگر ہم قرآن کے الفاظ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کے راز سے آشنا ہوتے۔ تو ہم نہ صرف پیغمبروں بلکہ "خدا رسیدہ" ہستیوں کی قوت و قدرت کے معاملہ میں بھی اِس طرح ٹھوکریں نہ کھاتے!

اس تمام گمراہی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ چونکہ ایک انسان کی ذہنیت کا اعتقادات سے گہرا تعلق ہے۔ لہذا انہی عقائد کی بنا پر ذہنیت مندرجہ ذیل تین درجوں میں بٹ جاتی ہے :۔

Marfat.com

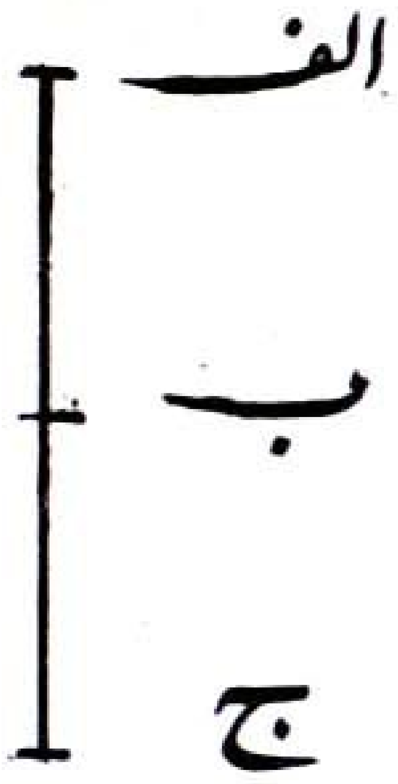

یعنی جس انسان کا اعتقاد خدا اور اُس کے پیغمبروں اور اولیاؤں کے متعلق درست نہیں ہوتا۔ اُسکی ذہنیت ج درجہ پر ہوتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے انسان کا اِدراک درست نہیں رہتا۔ لہذا وہ معاملات کو اُن کی اصلی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اور غلط نتائج اخذ کرتا ہے ؛

لیکن جس کی ذہنیت ب درجہ پر ہوتی ہے۔ یعنی جس کے اعتقادات درست ہوتے ہیں۔ وہ معاملات کو اُن کے اصلی خد و خال میں دیکھتا ہے۔ اور صحیح نتائج اخذ کرتا ہے ؛

اور جس کی ذہنیت اپنے ایمان و عمل کی درستی کی وجہ سے الف درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ گویا معراج پر پہنچ گیا۔ لہذا وہ خدارسیدہ ہو جاتا ہے ؛

لہذا اگر یہ دیکھنا ہو کہ اسلام کے موجودہ بہتّر یا تہتّر فرقوں میں سے صحیح ترین فرقہ کون سا ہے۔ تو یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ کس مسلک کے لوگ زیادہ تر خدارسیدہ ہوئے ہیں ؟

اسلام میں غلط مسالک کی ترویج

اب یہاں جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو علماء، انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کی کسی رُوحانی طاقت کے قائل نہیں۔ اُن کا یہ اعتقاد یا رویّہ اِس وقت تک کن نتائج کا ذمّہ دار ہے ؟ گویا اِس قسم کے اعتقاد سے کِس کِس مسلک کے لوگوں کا اسلام میں ظہور ہُوا ہے ؟

اِس نظریئے کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ نکلا۔ کہ چونکہ زیرِ بحث علماء کے گروہ نے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کے راز[1] کو بالکل نہ سمجھا۔ لہذا اِس مسلک کے علماء نے لوگوں کو محض نیک ہونے اور آخرت میں نجات حاصل کرنے پر زور دیا۔ اور اِس بات پر غور نہ کیا۔ کہ محض خدا کو مان لینا۔ عبادت کرنا یا سچ بولنا، نہایت ابتدائی دَور کی باتیں ہیں۔ گویا حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے بھی پہلے کی باتیں ہیں۔ جب دُنیا "سکول" میں تعلیم پانے والے درجہ میں تھی ؛

اب اِس وقت "سکول" میں تعلیم پانے کا زمانہ نہیں ہے ؛ یہ "کالج" میں تعلیم پانے کا زمانہ ہے !

جب دُنیا "سکول" والے درجہ میں تھی۔ تو اُس وقت وہ زیادہ سے زیادہ خدا کو مان سکتی تھی۔ اور نیک ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ کوئی "رُوحانی قوت" حاصل نہیں کر سکتی تھی ؛

زیرِ بحث علماء نے بھی صرف یہی کیا ؛ چنانچہ اِس مسلک کے علماء کی تقریروں اور تحریروں میں ایک

---

[1] اس کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۱ اور ۱۰۶ تا ۱۲۰

انسان کی کسی رُوحانی طاقت یا کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کا ذکر تک نہیں آتا؟ لہٰذا عوام نے اِس نظریئے سے مطلب یہ اخذ کیا۔ کہ ایک انسان کی رُوحانی ترقی اُس کو زیادہ سے زیادہ "عطار" ہی بنا سکتی ہے۔ "طبیب" بننا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں!

انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ

اِس مسلک کا نتیجہ یہ بھی نکلا۔ کہ جن انگریزی تعلیمیافتہ مسلمان حضرات کا پس منظر مذہبی نہیں ہے۔ اُنہوں نے اِسلام کا مطلب یہ لیا۔ کہ ایک انسان جمہوریت۔ آزادی۔ مساوات۔ بُردباری اور سماجی انصاف کے اصولوں کے مُطابق زندگی گزار سے۔ اور سائنس کے علم کو اسلام کی رُوح سمجھے!

گویا جب مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" یا "خدارسیدگی" نہ رہا۔ اور مطمحِ نظر صرف یہ ہوگیا۔ کہ ہر شخص نیکی کی زندگی گزارے۔ اُخروی نجات حاصل کرے۔ اور اِس دُنیا میں پوری مادی ترقی کو اپنائے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ "رُوحانیت" جو اسلام کی اصلی رُوح ہے۔ وہ بالکل غائب ہوگئی۔ یہاں تک کہ "معجزات" محض کہانیاں سمجھے جانے لگے!

اِس قسم کی ذہنیت پھر اِس بات کی ذمّہ دار ہوئی۔ کہ "مرزائیوں" کے نزدیک نہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اور نہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے؛ گویا وہ علماء جنہوں نے قرآن کے الفاظ پر غور کر کے حقیقت بین اور نکتہ داں ثابت ہونا تھا۔ وہ محض سطح بین اور "عربی دان" ہو کر رہ گئے!

اور پھر آخر کار جب عام مسلمانوں کے ذہن سے "رُوحانی ترقی" بالکل محو ہوگئی۔ اور صرف "مادی ترقی" ہی باقی رہ گئی۔ تو جہاں تک انگریزی دان طبقہ کا تعلق ہے۔ اُن کے نزدیک سائنس کے ذریعہ مادی ترقی کو پورے طور پر اپنانا ہی "حقیقی اسلام" ہوگیا! نہ صرف یہ بلکہ اُنہوں نے قرآن کے الفاظ کو عجیب قسم کے معنی پہنانے شروع کر دیئے؛ (اِس کی تفصیل آگے آئے گی)۔[1]

اسلام میں تین قسم کے علماء!

اب اِس تمام بے رہروی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اِس وقت اِسلام میں علماء بھی تین قسم کے ہیں:-

(۱) "حقیقی" علماء:

---

[1] اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل مثال کافی ہے:- لاہور کے رسالہ "سیارہ ڈائجسٹ" نے دسمبر ۱۹۶۹ء میں ایک "قرآن نمبر" تین جلدوں میں شائع کیا ہے جو ۱۵۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے:- ان تینوں جلدوں میں بیسیوں مضمون ہیں۔ جن میں اس قسم کے عنوانات بھی شامل ہیں:

قرآن کا پیغام۔ قرآن کا مقصد۔ قرآن کیا چاہتا ہے؟ قرآن نے انسانیت کو کیا دیا؟ قرآن کا انسان مطلوب وغیرہ وغیرہ:-

ان سب مضامین میں "متقی" کے لفظ کا مفہوم تو واضح سے واضح تر الفاظ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْن کے قرآنی الفاظ میں جو راز ہے۔ اُس کی طرف اشارہ تک موجود نہیں ہے! یہی ہماری کم فہمی کی دلیل ہے!

Marfat.com

(۲) "عربی دان" علماء! اور

(۳) "انگریزی دان" علماء!

"حقیقی" علماء

"حقیقی" علماء کے نزدیک دُنیا کے لوگ جس حد تک رُوحانی ترقی کر سکتے ہیں، اُس کی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہیں۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے۔ کہ چونکہ انسان کا اصلی مقصدِ حیات محض "خدا اور رسول کو ماننا اور نیک ہونا" نہیں ہے۔ بلکہ "خدا کی معرفت" ہے۔ لہٰذا یہ ہستیاں ہر شخص کو بانگِ دہل فرماتی ہیں:-

"تجھے کچھ حاصل نہیں۔ جب تک تُو اللہ کا دیدار حاصل نہ کرے"۔ یہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اقوال میں سے ایک قول ہے!

"عربی دان" علماء!

اس کے برعکس "عربی دان" علماء کا عقیدہ بھی ہم اُوپر پڑھ آئے ہیں۔ یعنی یہ کہ "جہل و نادانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا۔ تو طبعاً اُس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہو گیا کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں اُن کے تابع ہوتی ہیں" وغیرہ۔ وغیرہ:

اب اس عقیدہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ (جس طرح پہلے بھی کہا گیا ہے) ان علماء کے نزدیک ایک شخص رُوحانی طور پر زیادہ سے زیادہ "عطّار" ہی ہو سکتا ہے۔ "طبیب" بننا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں!

"انگریزی دان" علماء!

اب "انگریزی دان" علماء کی رام کہانی سُنئے! یہ دراصل قرآن کے بیسویں صدی کے "نئے" مفسرین ہیں۔ اس وقت ان میں مسٹر غلام احمد پرویز سرِفہرست آتے ہیں۔ اُنہوں نے قرآن کے الفاظ "وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"[1] کے معنی یہ کئے ہیں۔ کہ حقیقی مومن وہی مسلمان سائنسدان ہیں جو اپنی لیبوریٹریوں میں اپنے مشاہدات، تجربات اور سائنٹیفک تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[2] (یعنی اے رب تُو نے اس دُنیا کو یونہی فضول نہیں بنایا)[3]:

گویا ان کے نزدیک محض دل و جان سے یہ کہہ اُٹھنا کہ اے اللہ تُو نے اس دُنیا میں کوئی چیز بھی بغیر حکمت کے نہیں بنائی، کافی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کا جو یہ دعویٰ ہے۔ کہ کائنات کی کوئی شے بھی عبث و بیکار نہیں ہے۔ اس نظریے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حقیقی مومن وہ سائنسدان ہیں جو کائنات کی ہر شے کے متعلق پیہم تجربات کر کے عملاً ثابت کرتے ہیں۔ کہ وہ فلاں فلاں فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح ایک ایک چیز کا مشاہدہ کر کے

---

[1] آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۹۱)

[2] سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۹۱ [3] مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ جس میں اُنہوں نے "قرآن کی رُو سے علماء کون ہیں؟" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ یہ الفاظ وہیں سے لئے گئے ہیں:

Marfat.com

اُس کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں :

گویا قرآن نے جو "فکر" پر زور دیا ہے۔ وہ قرآن کی اس "نئی" تفسیر کے مُطابق یہی ہے۔ کہ کائنات کے اسرار پر ہر آن غور و تدبر کیا جائے :- یہاں تک کہ قرآن نے جہاں خدا کے "ذِکر" پر زور دیا ہے۔ وہ بھی اس "تفسیر" کے مُطابق یہ ہے۔ کہ قانونِ خداوندی کو ہر دم سامنے رکھا جائے۔ اور پھر اس طرح مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے جُوں جُوں حقیقت کا انکشاف ہوتا جائے۔ وہی "لقاءِ رب" یعنی رب سے ملنا اور رب سے ملاقات ہے۔ اور یہ انکشافات ہی خدا کے بے نقاب ہو کر سامنے آنے کے مترادف ہیں!

گویا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے مندرجہ بالا قول میں اللہ کے دیدار کا جو شوق دلایا ہے۔ پرویز صاحب نے رب العزت کی تجلیات کو سائنس کی لیبارٹری میں منتقل کر دیا! بالفاظِ دیگر جو نعمت آج تک دنیا غاروں اور مسجدوں میں ڈھونڈتی رہی۔ اُس کا راز آخر کار سائنس کی لیبارٹری میں منکشف ہُوا!

صرف یہی نہیں۔ بلکہ اُن کا ارشاد یہ بھی ہے۔ کہ جو لوگ حاضر و موجود پر مطمئن اور میسرہ (یعنی جو کسی محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر و قانع رہتے ہیں۔ اُنہوں نے گویا "رات اور دن کی گردش اور کائنات کی آفرینش میں جو خدا کی آیات ہیں۔ اُن پر غور ہی نہیں کیا!"

اس نظریے کی تائید میں پھر یُوں "گوہر افشانی" کی جاتی ہے :-

"حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہبِ سیال (liquid gold) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ وہاں کے باشندے حاضر و موجود پر مطمئن تھے۔ اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم رہے۔ نتیجہ اُس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا: [قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ سورۃ ۱۶ النحل۔ آیت ۱۱۲) یعنی اللہ نے اُن کو بھوک اور بدامنی کا لباس پہنا دیا]"

اب اس منطق کی رُو سے کیا ہم یہ کہنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ کہ چونکہ حضورِ اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ بھی حاضر و موجود پر مطمئن رہے۔ کیونکہ وہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا کرتے تھے۔ لہٰذا وہ بھی (خاکم بدہن) تمام عمر خدا کا عذاب ہی جھیلتے رہے؟

اسی طرح قرآن کے ایک اور "نئے" مفسر میاں عبدالرشید صاحب بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "اسلام اور تعمیرِ شخصیت" میں یُوں رقمطراز ہیں :-

"علمِ آفاق (موجودہ سائنس) اور علم النفس (یعنی رُوحانیت) علم کے دو رُخ ہیں۔ اور ایک کے بغیر

Marfat.com

دوسرے کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور معرفت حقیقت کے لئے اِن دونو حصّوں کا پہلو بہ پہلو مطالعہ ضروری ہے"۔ .... چونکہ "جب تک آفاق اور انفس دونو کا علم نہ ہو۔ انسان نیابتِ الٰہی کا پورا حق ادا نہیں کرسکتا"۔ (صفحہ ۹۷)۔

اب اِس "تفسیر" کی رُو سے یہ نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسول پاکؐ، صحابہ کرامؓ اور گذشتہ پیغمبروں کو موجودہ سائنس کا کتنا علم تھا؟ اور اُنہوں نے اِس علم کے بغیر نیابتِ الٰہی کا حق کس طرح ادا کیا؟

اِس سلسلہ میں معاملہ پر جس پہلو سے غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر تبع تابعین تک (اور یہ عرصہ چھ سات ہزار سال سے کم کیا ہوگا؟) انسانیت نے جو مادی ترقی کی ہے۔ وہ بیل گاڑی یا چرخے وغیرہ تک ہی محدود رہی ہے۔ گذشتہ دو تین سو سال میں دُنیا نے جو مٹی کے چراغ سے بجلی تک ترقی کی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ تبع تابعین تک دُنیا میں محض جہلا ہی بستے تھے۔ بلکہ اِس کی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ گذشتہ زمانوں میں دُنیا نے جتنی رُوحانی ترقی کی ہے۔ اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے۔ انسانیت نے بیل گاڑی یا چرخے سے آگے جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی!

اِس کی وجہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے واضح ہو جائے گی:

بہت مدت کا ذکر ہے۔ ایک مولوی صاحب نے جمعہ کے وعظ میں ایک دفعہ فرمایا۔ کہ رسولِ پاکؐ کے زمانہ میں دو صحابہ کرام ایسے تھے۔ جن کو حضورؐ کے پاس آنے کے لئے صرف سہ پہر کو ہی وقت ملتا تھا۔ چنانچہ وہ عصر کے قریب آتے۔ اور عشا کے بعد واپس جاتے: اُس وقت چونکہ اندھیرا ہوتا تھا۔ اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکلتیں۔ جن کی روشنی میں وہ اپنے گاؤں کو چلے جاتے[1]: اِس مثال سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ[2] کی تفسیر ملتی ہے۔ یعنی اگر انسانوں کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکل سکتی ہیں۔ تو اُن کو بجلی کے پاور ہاؤس بنانے کی ضرورت کیوں اور کس طرح محسوس ہو سکتی ہے؟

اِسی طرح حضرت داتا گنج بخش کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن وہ اپنے مرشد کے ساتھ دمشق سے بیت الجن کو جارہے تھے۔ کہ راستہ میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ جس سے وہ تو تر بتر ہوگئے۔ اور اُن کے جوتے کیچڑ سے بھر گئے۔ لیکن اُنہوں نے دیکھا۔ کہ اُن کے مرشد بالکل خشک جارہے ہیں۔ جیسے بارش ہوئی ہی نہیں! جب حضرت داتا صاحب نے اِس صورتِ حال پر تعجب کا اظہار فرمایا۔ تو اُن کے مرشد صاحب نے فرمایا۔ کہ جب سے اُنہوں نے اللہ تعالیٰ پر پورا توکل کیا ہے۔ اور اپنے دل میں سے حرص کو نکال دیا ہے' رب العزت نے اُنہیں کیچڑ سے محفوظ کردیا ہے! اِس مثال سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ جب انسانیت اِس قسم کی ترقی کرسکتی ہے۔ تو اُس کو "برساتی بوٹ" ایجاد کرنے کی

---

[1] بخاری شریف میں ہے۔ کہ ان صحابہ کے عصا سے شعاعیں نکلتی تھیں!

[2] بیشک ہم نے انسان کو بہترین اسلوب پر بنایا ہے: (سورۃ ۹۵ التین۔ آیت ۴):

Marfat.com

ضرورت کس طرح محسوس ہو سکتی ہے؟

اِن مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ ہم گذشتہ زمانوں کو جو Dark Ages[1] کے نام سے پکارتے ہیں۔ تو یہ ہماری کوتاہ فہمی کی دلیل ہے ؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمیں "تصویر کے دوسرے رُخ" کا علم ہی نہیں ہے۔ اور قرآن بار بار جو کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہم نے اُس طرف توجہ ہی نہیں دی!

اب اِس مسئلہ (یعنی سائنس کے علم کے بغیر ایک انسان نیابتِ الٰہی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا) کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیں ؛ حضورؐ کی زندگی، تمام دُنیا کے انسانوں کے واسطے، ہر پہلو سے، قیامت تک کے لئے 'اُسوۂ حسنہ' مانی جاتی ہے ؛ اب سوال یہ ہے۔ کہ جہاں تک دین و دُنیا میں ہر قسم کی رہنمائی، مثلاً اخلاق کی پاکیزگی یا مصیبتوں کے وقت تحمل و استقلال کا تعلق ہے۔ حضورؐ کی زندگی تمام شعبوں میں دُنیا کے لئے واقعی اسوۂ حسنہ کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن اِس زمانہ کی ایجادات کے سلسلہ میں حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے اپنی تمام زندگی میں نہ کوئی مادی چیز ایجاد کی۔ اور نہ کسی مادی چیز کی کبھی ترغیب ہی دی ؛ یہ اس لئے نہیں تھا۔ کہ اُس وقت دُنیا کے لوگوں کی عقل پختہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ اِس لئے تھا۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضورؐ کے زمانہ تک انسانیت، اپنا مقصدِ حیات صرف "خدا کی معرفت" کو ہی سمجھتی رہی۔ لہٰذا اُس نے مادی ترقی کو کبھی قابلِ اعتنا سمجھا ہی نہیں ؛ اور اِس قسم کا رویّہ بالکل درست بھی تھا۔ چونکہ گذشتہ زمانوں میں انسانیت نے جو رُوحانی ترقی کی ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے موجودہ مادی ترقی محض بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے!

مثال کے طور پر حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا مسخر تھی۔ اب اِس قسم کی تسخیر کے سامنے ہوائی یا خلائی جہازوں کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟[2]

---

[1] جہالت کے زمانے

[2] اِس کے برعکس جن لوگوں کے ذہن میں اُس رُوحانی ترقی کا بالکل احساس نہیں۔ جو انسانیت نے حضرت آدمؑ سے لے کر تبع تابعین تک کی ہے۔ بلکہ اُن کی نظریں موجودہ بجلی کی چمک سے "خیرہ" ہو چکی ہیں۔ وہ یوں استدلال کرتے ہیں۔ کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے دُنیا کی عقل ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی۔ اِسی لئے لوگ ہر مہیب یا کسی بڑی چیز کو دیکھ کر اس سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اور اُسے پُوجنے لگ جاتے تھے ؛ مثلاً آگ کی ہیبت کو دیکھ کر لوگ آتش پرست ہو گئے۔ اور سورج کی روشنی سے مرعوب ہو کر وہ اُس کی پُوجا کرنے لگے۔ لیکن حضورؐ نے وحی کی تعلیم سے دُنیا کو بتایا۔ کہ پرستش کے لائق صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے ؛ دُنیا کی تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں۔ اور انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ لہٰذا قرآن انسان کو حکم دیتا ہے۔ کہ وہ دُنیا کی چیزوں پر تفکر کر کے اُن کو مسخر کرے ؛ اِسی لئے اُن کے نزدیک موجودہ سائنس کے حقیقی موجد دراصل مسلمان ہی ہیں۔ لیکن "مُلّا" نے چونکہ اِس حقیقت کو نہ سمجھا۔ وہ تو اپنے حجرہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہا۔ لیکن مغربی قوموں نے مسلمانوں سے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

Marfat.com

اس وقت جو صورتِ حالات ہے۔ اُس کی حقیقت ایک مثال سے واضح ہو جائے گی ۔ جن لوگوں نے ڈرامے دیکھے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں۔ کہ ان میں عام طور پر ایک سبق آموز کہانی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد "مذاقیہ" comic پلاٹ بھی آجاتے ہیں ۔ یہ محض تفننِ طبع کے لئے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح یہ دُنیا بھی ایک ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامہ کی اصلی کہانی صرف "خدا کی معرفت" والی کہانی ہے۔ جس کی تفصیل گذشتہ اوراق میں ایک حد تک گذر چکی ہے ۔ موجودہ "مشین کا زمانہ" ڈرامہ کا "مذاقیہ" (comic) حصّہ ہے ۔ یہ دراصل دُنیا کے لئے ''intelligence test'' ہے۔ یعنی اس سے لوگوں کی بصیرت کا امتحان لیا گیا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ بصیرت سے عاری ہیں۔ وہ "منفی طاقت" کے چکمے میں آگئے۔ اور اُنہوں نے ڈرامہ کے "مذاقیہ" (comic) حصّہ کو ہی ڈرامہ کی "اصلی کہانی" سمجھ لیا !

یہ کیوں سمجھ لیا ؟ اور کس طرح سمجھ لیا ؟ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ سے ملے گا ۔

پانچ چھ سال کا ذکر ہے۔ "اسلام اور تعمیرِ شخصیت" کے مصنف (جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) لاہور کے ایک رسالہ "حیاتِ جاوداں" کے مدیر تھے۔ اُن دنوں انہوں نے موجودہ صدی کی "چاند کی مہموں" کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں ۔

باب دوم میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں۔ کہ قرآن کی سورۃ ۵۵ الرحمٰن (آیت ۳۵) میں اللہ تعالیٰ نے اوپر کی خلائی فضا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵ کا)

سائنس کو سیکھ کر موجودہ ترقی کر لی۔ اور مسلمان اپنی لاعلمی کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر بیٹھے رہے ۔

اس مکتبِ فکر کے لوگ پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس وقت تک دُنیا نے جو مادی ترقی کی ہے۔ وہ تو ابھی بالکل تمہید ہے۔ یہ قدرت کو ہی معلوم ہے۔ کہ انسان نے چاند پر چھلانگیں لگانے کے بعد ابھی کتنی ترقی کے مراحل طے کرنے ہیں ۔

اس قسم کے لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ جہاں تک رُوحانی ارتقا کا تعلق ہے۔ یہ حضورؐ کی ذات میں اپنے معراج کو پہنچ چکی ہوئی ہے۔ "قَابَ قَوْسَیْنِ" اس کا ثبوت ہے ۔ صحابہ کرام حضورؐ کی پیروی کر کے "درخشندہ ستارے" بنے ۔ اب دنیا کے لوگوں نے انہی کی پیروی کر کے "عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْل" کے مرتبہ پر پہنچنا ہے ۔ مادی ترقی نہ اسلام کا مقصود ہے اور نہ منزل ! اس کا ثبوت "اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" ہے ۔ گویا رُوحانی ارتقا کے نتیجہ کے طور پر انسانیت کو جو "دیدارِ الٰہی" کی نعمت ملنی تھی حضورؐ کی ذات میں اس کا اتمام ہو چکا ہے۔ البتہ انسانیت میں اس کا اتمام ابھی باقی ہے۔ قرآن کے الفاظ "وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ" اسی فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں۔ کہ انسان کی ارتقا نے اپنی تکمیل کو ابھی پہنچنا ہے۔ انہوں نے گویا "ختمِ نبوت" کے فلسفہ کو ہی نہیں سمجھا !

میں ایک ہولناک آگ کے شعلوں[1] اور دھوؤں کا ذکر کرکے دُنیا کے لوگوں کو چیلنج کیا ہے۔ کہ اگر کسی میں ہمت ہے۔ تو وہ اُن میں سے گذر کر دیکھ لے۔ اور ساتھ ہی تنبیہہ بھی کر دی ہے۔ کہ ان شعلوں سے دُنیا دار لوگ بچ نہیں سکتے۔ ہاں "اِلَّا بِسُلْطٰنٍ"[2] یعنی ان شعلوں سے وہی بچ سکتے ہیں جنہوں نے یا تو خدا کی "منظوری" حاصل کی ہوگی۔ یا جن میں "براہیمی ایمان" ہوگا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کے بزرگ صرف اولیائے کرام ہی ہو سکتے ہیں[3]۔

لیکن "حیاتِ جاوداں" کے شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں میاں عبدالرشید صاحب (مدیر) یُوں رقمطراز ہوئے:-

"اب کوئی دن کی بات ہے۔ کہ انسان کو ایسی "سُلطٰن" (قوت) حاصل ہو جائے گی۔ جس کے ذریعہ وہ خلا کی سرحدیں عبُور کرکے چاند پر اُترے گا۔"

باب دوم میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں لفظ "سُلطٰن" سے مُراد اپنی قوت نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی "منظوری" ہے۔ جو صرف "خدا رسیدہ" ہستیوں کو ہی مل سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس سلسلہ میں مدیر موصوف نے اس نکتہ کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ کہ قرآن کی "سُلطٰن" والی آیت کے مطابق سوال چاند پر اُترنے کا نہیں ہے۔ بلکہ مسئلہ اُن کائناتی اقلیموں کے عبُور کرنے کا ہے۔ جہاں آگ کے شعلے اور دھوئیں ہیں۔ جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کے سائنس دانوں نے دُوربینوں کے ذریعہ تو اُن شعلوں کو دیکھ لیا ہے[4]۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ آج کل کے ہوائی خلاباز ان شعلوں کے مقام سے ابھی بہت دور ہیں!

اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ کیا موجودہ سائنس کی قوت یا آئندہ کوئی اور طاقت اُن اقلیموں کو عبُور کر سکتی ہے۔ جو حضرت عیسیٰؑ نے آسمان پر پہنچنے کے وقت یا حضورؐ نے معراج کی آمد و رفت کے موقع پر عبُور کیں؟ قرآن اس کا جواب نہ صرف نفی میں دیتا ہے۔ بلکہ دُنیا کے لوگوں کو چیلنج کرتا ہے۔ کہ اگر کوئی ان حدود کو عبُور کر سکتا ہے۔ تو آگے میدان میں آئے۔ اور ساتھ ہی تنبیہہ بھی کر دی ہے۔ کہ رب العزت کی "منظوری" کے بغیر کسی کے لئے ان حدود کو عبُور کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر کسی نے اس کی جرأت کی۔ تو آگ کے شعلے اُس کو جلا کر راکھ کر دیں گے!

---

[1] سورۃ ۵۵ الرحمٰن۔ آیت ۳۵۔

[2] ایضاً۔ آیت ۳۳۔

[3] دیکھیں صفحہ ۵۹ تا ۶۱

[4] دیکھیں صفحہ ۶۰

Marfat.com

اس بحث سے یہ واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ بیسویں صدی کے "نئے" مفسرین قرآنی الفاظ کو کیسے اُوٹ پٹانگ معنی پہنا رہے ہیں؟ ان حضرات کی مثال بالکل ہندوؤں کی سی ہے۔ جنہوں نے جب ہوائی جہاز ایجاد ہوا۔ تو اخباروں میں شور مچا دیا۔ کہ اُن کی مذہبی کتابوں میں بھی "اُڑن کھٹولوں" کا ذکر ہے! کوئی اُن سے پوچھتا۔ کہ اگر ذکر ہے۔ تو ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے بتایا ہوتا! یہی حالت ہمارے قرآن کے "نئے" مفسرین کی ہے۔ جب سے "مشین کا زمانہ" شروع ہوا ہے۔ اب انہیں بھی "ذکر و فکر" کے معنی سائنس کی لیبارٹری میں "حقیقتوں کے انکشافات" اور "سلطٰن" کی معنی "ایٹمی قوت" کے معلوم ہوتے ہیں! آج کل کے "انگریزی دان" علماء کی قرآن سے استدلال کرنے کی قدرت و قوت کی یہ روشن مثالیں ہیں!

اس سلسلہ میں پروفیسر غلام جیلانی برق صاحب کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:۔ وہ دونو رُخوں کے قائل ہیں۔ چنانچہ جب اُن کی نظر موجودہ زمانہ کی چمک سے خیرہ ہوتی ہے۔ پھر تو وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"تمام قرآن مطالعۂ کائنات کی ترغیب سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام اور سائنس میں تصادم نہیں ہو سکتا۔ اسلام محسوسات کو نہ فریب نظر سمجھتا ہے۔ اور نہ ذلیل و حقیر۔ ان دونوں جہانوں کو رشتۂ وحدت میں پرونا اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو قرار دینا اسلام کا عظیم کارنامہ ہے:" ("من کی دنیا"۔ ص ۔ ۱۸۲):

لیکن اس کے برعکس جب وہ اپنی قرآن فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ تو پھر یُوں گوہر افشانی فرماتے ہیں:۔

"قرآن کے ہاں لیل و نہار، ابر و باد، الوان و السنہ، وغیرہ آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ جن پر غور کرنا عبادت ہے۔ اس سے حیرت و تحسین کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ دل حمدِ صانع کے ترانے گانے لگتا ہے۔ صانع کا تصور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اور اتنا راسخ ہو جاتا ہے۔ کہ بالآخر رُوح کی ایک صنعت بن جاتی ہے": ("الیضاً"۔ ص ۔ ۱۸۲):

"اللہ مجسّم رحمت ہے۔ اور اُس کی مقدس ہستی سے رحمت کے دھارے یوں رواں رہتے ہیں۔ جیسے ہمالہ کے دامن سے چشمے: انسان فطرتاً مسرت و رحمت کے اِس سرچشمۂ اول سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ اسی محبت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ حمد و ثنا کے گیت گاتا ہے۔ اُس کی دہلیز پر سرِ نیاز جھکاتا ہے۔ روتا اور گڑگڑاتا ہے خلوت میں اُس کے تصور سے باتیں کرتا ہے۔ سکوتِ شب میں اپنی تمام طاقتوں کو سمیٹ کر اُس پر یُوں دھیان جماتا ہے۔ کہ اُسے وحدت و ہم آہنگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اور بالآخر ایک حقیقت

Marfat.com

بن کر سامنے آجاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عاشق کا ہاتھ محبوب کا ہاتھ بن جاتا ہے....
.....جہاں تقدیریں اُس کے اشارۂ ابرو کے مطابق تشکیل پاتی ہیں......
رب العرش سے اسی قُرب کا نام عشق ہے"........ عشق وہ طاقت ہے جس سے مورِ ہم مرتبۂ جم اور خاک ہمدوشِ ثریا ہوتی ہے"........ دل میں عشق کی جوت لگانے کا طریقہ ایک ہی ہے کہ اپنے آپ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف آؤ...... اور تمام اصنامِ ہوس توڑ ڈالو۔ نیابتِ الٰہی کی مسند حاصل کرنے کا راستہ یہی ہے" (ایضاً۔ ص ۱۷۴-۱۷۵)

جب اس قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پھر انسان کو کس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذکر بھی برق صاحب کی زبان سے ہی سنیئے:

"جب ہُدہُد نے حضرت سلیمانؑ کو بتایا کہ سبا (یمن) میں ایک ملکہ (بلقیس) بڑے ٹھاٹھ سے رہتی ہے۔ تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ میں اُس کا تخت یہاں منگوانا چاہتا ہوں۔ اس کے جواب میں ایک آدمی جس کے پاس ہماری خاص کتاب کا خاص علم تھا کہنے لگا۔ میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے حاضر کر دوں گا۔ اور جب وہ تخت سامنے آگیا۔ تو سلیمانؑ نے کہا۔ مجھ پر میرے رب کی یہ خاص نوازش ہے"

"یہ ہے علمِ خاص کی طاقت۔ کہ ہزاروں میل دور کی چیز ایک لمحے میں سامنے آگئی۔ یہی تو وہ علم تھا۔ جس کے بل پر سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا۔ جس کی مدد سے وہ پرندوں کی زبان سمجھتے تھے۔ اور جنات پر بھی حکومت چلاتے تھے" (ایضاً۔ ص ۹۴)

"یہ علم کسی زمینی کتاب میں موجود نہیں۔ نہ درسگاہوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے دھارے رُوح سے پھوٹتے ہیں" (ایضاً۔ ص ۹۴)

اب یہاں سوال صرف یہ ہے۔ کہ اگر اس دنیا میں ایک علم ایسا بھی ہے۔ جس کے بل پر حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا۔ تو پھر اس علم کے سامنے موجودہ ہوائی جہازوں کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جاتی ہے؟
بالمثال کے طور پر اگر آج کسی "آنکھ کے ہسپتال" کے دروازہ پر کوئی "عیسیٰ" بیٹھا ہو۔ تو کیا کوئی شخص آنکھ کا اپریشن کرانے کے لئے اس ہسپتال کے اندر جائے گا؟
صرف یہی ایک نکتہ ہے۔ جس کی طرف قرآن کے ان "نئے" "مفسرین" نے ابھی تک مطلقاً کوئی توجہ ہی نہیں دی!

سُنّت کا فلسفہ

اس تمام گمراہی کی تہ میں یہ بات ہے۔ کہ اس وقت نہ صرف ہماری نظروں سے حقیقی مقصدِ حیات اوجھل ہے۔ بلکہ سُنّت کی پیروی کے فلسفہ کو بھی ہم نے بالکل نہیں سمجھا! سُنّت کی پیروی محض ایک عمل صالح ہی نہیں ہے۔ بلکہ خدارسیدگی (جو کہ انسانی زندگی کا اصلی مقصد ہے) کا تمام راز سُنّت اور صرف سُنّت کی پیروی میں ہی مضمر ہے!

سُنّت کی اہمیت کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

کچھ عرصہ ہوا پاکستان کے ایک جیّد عالم صاحب[1] کو ایک دوسرے ملک کے عالم صاحب کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ پاکستانی عالم صاحب نے دیکھا دوسرے عالم صاحب بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہے ہیں۔ جس پر انہوں نے تعجّب کا اظہار کیا: اس حیرت پر دوسرے ملک کے عالم صاحب نے فرمایا۔ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ دایاں ہاتھ بھی خداتعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔ اور بایاں ہاتھ بھی اُسی کا دیا ہوا ہے!

پاکستانی عالم صاحب کے استعجاب کے اظہار میں نہ صرف اسلام کی تمام تعلیم سمٹ کر آجاتی ہے۔ بلکہ سُنّت کے فلسفہ کا راز بھی اس میں پوری طرح مضمر ہے! اس نکتہ کی تشریح کے سلسلہ میں انسانی مقصدِ حیات ایک دفعہ پھر پوری شدّت کے ساتھ سامنے آتا ہے:

سوال صرف یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی زندگی کا مقصد "دنیوی ترقی" ہے۔ تو پھر صرف بائیں ہاتھ سے ہی نہیں بائیں پاؤں سے بھی کوئی کھانے کا انتظام کرلے تو اس میں قباحت کیا ہے[2]؟

اور اگر مقصدِ حیات "نیک عملی" ہے۔ تو پھر یہ تو ضروری ہے۔ کہ ایک انسان ہر وقت سچ بولے۔ لیکن بائیں ہاتھ سے کھانے سے اُس کی نیکی میں کس طرح فرق آسکتا ہے؟

اسی طرح اگر مقصدِ حیات صرف "خدا کو ماننا" ہے۔ تو ایک انسان کا بایاں ہاتھ بھی واقعی ویسا ہی خدا کی نعمت ہے۔ جیسا کہ اُس کا دایاں ہاتھ!

لیکن اگر مقصدِ حیات صرف "خدا کو ماننا" اور "نیک عملی" نہیں۔ بلکہ "خدا تک پہنچنا" یا "خدارسیدگی" ہے۔ تو پھر دائیں ہاتھ سے کھانے کے بغیر ایک انسان کے لئے کوئی چارہ ہی نہیں۔ کیونکہ سُنّت اور صرف سُنّت کی پیروی ہی ایک انسان کو "خدارسیدہ" کرسکتی ہے: سُنّت پر عمل کرنے کے بغیر ایک انسان کو "خدا کی معرفت" حاصل

---

[1] یہ حضرت مولانا سیّد احمد سعید کاظمی صاحب ہیں۔ جو اس وقت جامعہ اسلامیہ۔ بہاولپور میں شیخ الحدیث ہیں:

[2] یعنی ایک ایسی مشین ایجاد کرلی جاتے جس کے ایک بٹن کو پاؤں کے ساتھ دبانے سے لُقمہ مُنہ کے قریب آجاتے۔ اور ہاتھ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

Marfat.com

نہیں ہوسکتی !

اب ہماری کوتاہ بینی صرف اس بات میں مضمر ہے۔ کہ ہم نے مقصدِ حیات "خدارسیدگی" کو نہ سمجھا۔ بلکہ یا اپنے سامنے "خدا اور رسول پر ایمان" کو رکھا۔ یا "نیکی اور نجات" کو ؛ گویا اسلام کے "اوّل" قدم کو ہی "آخری" قدم بھی سمجھ لیا گیا ؛ اور جن لوگوں کی نظریں موجودہ زمانہ کی چمک سے خیرہ ہو چکی ہیں۔ اُنہوں نے کائنات کی "مادی تسخیر" کو ہی مقصدِ حیات تصوّر کر لیا ؛ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے۔ کہ روزِ آفرینش سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب (انسان) کے لئے کائنات کی "رُوحانی تسخیر" مقدر کی ہے ؛ اور یہی ایک نکتہ ہے۔ جو بیسویں صدی کے "نئے" مفسرین بالکل سمجھ نہیں سکے۔ اور اس کا نتیجہ اب یہ ہے۔ کہ وہ قرآن کی آیات کی اُوٹ پٹانگ "تفسیریں" کر رہے ہیں !

یہاں جس بات کے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ وہ یہ ہے کہ جسِ شعور" (یعنی دماغ) کو خیر و شر یا نیک و بد کی تمیز ہی نہیں[1]۔ اُس کی کامیابیاں کس حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں ؟ یہ ایک باریکی ہے۔ جو ہمارے "نئے" مفسرین بھانپ نہیں سکے ! اُن کی سمجھ میں یہ بات تب ہی آئے گی۔ جب زمانہ اپنا اگلا "موڑ" مڑے گا۔ اور اُس قسم کا سانحۂ عظیم رونما ہوگا۔ جس قسم کے حادثات یہ دنیا ہر ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے بعد اپنی بے رہروی اور سطح بینی کی پاداش میں دیکھنے کی عادی ہے۔ اور جس کی بابت گذشتہ باب میں اشارہ کیا جا چکا ہے ؛

قرآن کے "نئے" مفسرین کی پریشانی !

اب یہاں طُرفہ تماشا یہ ہے۔ کہ جن "مفسرین" نے "ذرات کی معرفت" کو بھی "عبادت" کا رُتبہ دیا ہے وہ اب اس بات کے بھی شاکی ہیں۔ کہ :-

(۱) "تمام معاشرہ اس وقت مادیت کی زد میں گھر چکا ہے۔ اور

(۲) عورتیں بناؤ سنگار کر کے بڑی بے حجابی سے سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں[2] !"

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں باب چہارم، فصل "انسانی شعور" ؛

[2] "حیاتِ جاوداں" کے نمبر ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں ایک صاحب نے "طلبہ اور معاشرے کی خرابیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں اُنہوں نے دونو مندرجہ بالا خرابیوں کی شکایت کی ہے۔ اور جن کی ذمہ داری اُنہوں نے مذہبی رہنماؤں کے سر تھوپی ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اِن مذہبی ملاؤں نے اسلام کی سادہ اور سہل تعلیم کو اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر متذکرہ بالا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ؛ رسالہ کے ادارہ نے اعلان کیا۔ کہ یہ موضوع برائے بحث ہے۔ اور جُملہ قارئین کو اظہارِ خیالات کی دعوت دی ہے ! اِس رسالہ کے مدیر وہی صاحب ہیں۔ جنہوں نے یہ "فتویٰ" دیا ہے۔ کہ جب تک سائنس کا علم نہ ہو۔ انسان نیابتِ الٰہی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا ! (دیکھو صفحہ ۱۲۴) بدقسمتی سے مندرجہ بالا شمارہ کے شائع ہونے کے تھوڑے عرصہ کے بعد اِس رسالہ کی اشاعت ہی بند ہو گئی۔ لہٰذا اظہارِ خیالات کا موجودہ موقعہ غنیمت سمجھا جا رہا ہے !

Marfat.com

قرآن کے یہ "نئے" مفسرین جس بات کو سمجھ نہیں سکے۔ وہ یہ ہے کہ اوپر کی دونوں شکایات، علامات مرض ہیں۔ مرض نہیں ہیں:۔ مثلاً مرض "معاشرہ کا مادیت میں گھرنا" نہیں ہے۔ حقیقی مرض "ذرّات کے تجزیہ" کو "عبادت" سمجھنا[1] ہے۔ کیونکہ اس "عبادت" کے لئے نہ کسی ایمان کی ضرورت ہے۔ نہ کسی تقویٰ و پرہیزگاری کی:۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ جب کسی معاشرہ میں "ذرّات کے تجزیہ" کو ہی "عبادت" سمجھا جائے گا۔ تو پھر اگر اس "عبادت" کا پھل "معاشرہ کے مادیت میں گھرنے" کی صورت میں نمودار ہو تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟

بالکل اسی طرح عورتوں کی "بے حجابی" بھی مرض نہیں ہے۔ بلکہ مرض کی علامت ہے:۔ حقیقی مرض یہ ہے۔ کہ چونکہ ان "نئے" مفسرین نے "ذرّات کی معرفت" کو "عبادت" کا درجہ دیا۔ اور اس "عبادت" کے لئے کسی قسم کے "حجاب" کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا عورتوں کے لئے "نقاب" اب بے معنی اور لغو چیز ہے!

گویا جب ان نئے "مفسرین" نے "مکہ" کو جانے والی سڑک کو چھوڑ کر "لندن" کو جانے والی سڑک کو "شاہراہ" بنا لیا۔ اور اب جب اس "شاہراہ" پر چلنے کا نتیجہ اپنے پورے جوبن پر ظہور میں آرہا ہے۔ تو اب یہ حضرات گھبرا رہے ہیں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ گویا قرآن کے یہ "نئے" مفسرین اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے۔ کہ جب ہم نے مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" کی بجائے "ذرّات کی معرفت" قرار دیا۔ اور یہ مقصد کسی "عمامہ" یا "نقاب" کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے۔ تو اب نہ مردوں کو "ڈاڑھی" کی ضرورت ہے۔ اور نہ عورتوں کو "نقاب" کی! ان حالات میں اگر عورتیں "بڑی بے حجابی سے سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں"۔ تو اس میں بھی اب تعجب کی کون سی بات ہے؟ چونکہ "ذرّات کی معرفت" حاصل کرنے کے لئے نہ کسی حجاب کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی نقاب کی!

غرض اگر ہم موجودہ معاشرہ کی تمام خرابیوں کو واقعی دُور کرنا چاہتے ہیں۔ تو قرآن کے ان "نئے" مفسرین کو اپنے وہ تمام "فتوے" واپس لینے ہوں گے۔ جن میں اُنہوں نے اسلام کی اقدار کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اگر یہ حضرات ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تو پھر معاشرہ کی مادہ پرستی پر طعن زنی کرنا یا عورتوں کی بے حجابی پر ناک بھوں چڑھانا۔ گڑ کھانا اور گلگلوں سے پرہیز والا معاملہ ہے!

اسی لئے قربِ قیامت کی ایک نشانی یہ ہے۔ کہ "صحیح علم اُٹھ جائے گا۔ لوگ جاہلوں کو اپنا امام اور پیشرو بنائیں گے":۔ یہ پیشین گوئی "انگریزی دان" علماء پر کس قدر صحیح طور پر چسپاں ہوتی ہے!

موجودہ ضلالت کہنہ میں صرف یہ امر ہے۔ کہ چونکہ آج کل کا انسان مادی علوم سے اپنے دماغ کی پوری

---

[1] اس کی تشریح کے لئے صفحات ۷۰ تا ۸۰ دیکھیں۔

Marfat.com

طرح نشوونما کرنے کے باوجود آپ خود "حجاب" میں ہی رہتا ہے۔ لہٰذا اس وقت انسان کے "عدو مبین" نے اُس کو کائنات کی "مادی تسخیر" کا چکمہ دیا۔ تاکہ موجودہ ایجادات سے اُس کی نظریں اتنی "خیرہ" ہو جائیں کہ وہ "ذرّات کی معرفت" کو ہی "خدا کی معرفت" قرار دے!

دجّال سے کیا مُراد ہے؟

غرض موجودہ سائنس کا یہ "فریب" ہی وہ "دجّال" ہے جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے: "دجّال" کے لفظی معنی جھوٹا اور فریب دینے والے کے ہیں۔ اور موجودہ سائنس کا "فریب" یہ ہے۔ کہ اس سے ایک چنگا بھلا انسان "ذرّات کی معرفت" کو ہی "خدا کی معرفت" کے مترادف سمجھنے لگ جاتا ہے!

یہاں یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ "دجّال" کے ظہور کے متعلق جو الفاظ حدیث میں آتے ہیں۔ د ص استعاروں کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں: مثلاً "وہ ایک جانور ہوگا یا یہود قوم کا ایک مرد جس کی ایک آنکھ [illegible] بالکل نہیں ہوگی"! "دجّال" سے یہاں مُراد ریل کا انجن ہو سکتا ہے!

اِس قسم کے استعارے کائنات کی "مادی تسخیر" پر خوب چسپاں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:۔

(۱) "دجّال بہت تیزی سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچے گا۔ جیسے بادل۔ جسے ہوا اُڑاتی ہو": یہ اس وقت ریل اور ہوائی جہاز کے ذریعہ ہو رہا ہے!

(۲) "وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا": اس وقت دُنیا جس حد تک کائنات کی "مادی تسخیر" کر رہی ہے اُسی حد تک وہ سمجھتی ہے۔ کہ اُس نے قدرت کو فتح کر لیا ہے۔ یہی اُس کا خدائی کا دعویٰ ہے!

(۳) "دجّال کے ساتھ ایک باغ اور ایک آگ ہوگی۔ جن کا نام وہ جنّت اور دوزخ رکھے گا: مگر وہ جو دیکھنے میں جنّت ہوگی۔ وہ حقیقتاً "آگ ہوگی"۔ اور جو جہنم دکھائی دے گی۔ ذ مقام راحت ہوگا!" اس وقت کی کائنات کی "مادی تسخیر" باغ اور جنّت ہے۔ اس کو کام میں نہ لایئے۔ تو دُنیا آگ اور جہنم معلوم ہوتی ہے! اس وقت کے بجلی کے پنکھے یا برفانی کمرے (air-conditioned rooms) اس کی بہترین مثال ہیں!

(۴) "دجّال بادل کو حکم دے گا۔ وہ برسنے لگے گا!" مصنوعی بادل بنانے کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے!

Marfat.com

(۵) جو دجال کو نہ مانیں گے۔ اُن کے پاس سے چلا جائے گا۔ اُن پر قحط ہو جائے گا۔ تہیدست رہ جائیں گے"۔ آج دُنیا "مصنوعی کھاد" کو نہ استعمال کرے تو پیداوار کم ہو جائے گی۔ اِس طرح دُنیا واقعی تہیدست رہ جائے گی!

یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آج کل ایک ہی چیز کو آدھی دُنیا اچھا کہتی ہے۔ اور آدھی دُنیا بُرا:۔ اسی طرح ایک ہی انسان کے بارہ میں آدھی دنیا اُس کی تعریف کرتی ہے۔ لیکن آدھی دُنیا اُس کی بدتعریفی کرتی ہے: اب ایک انسان کرے تو کیا کرے؟ پھر اس کا فیصلہ کون کرے۔ کہ صحیح کون ہے؟ اور غلط کون ہے؟ بالفاظِ دیگر انسان میں وہ کون سی قوت ہے۔ جس سے وہ واقعی صحیح نتائج اخذ کر سکتا ہے؟

اِن تمام سوالوں کی تہ میں "انسانی شعُور" کا مسئلہ ہے۔ اِس لئے یہ نہایت لازمی ہے۔ کہ ہم اِس شعُور کی بابت معلومات حاصل کریں۔ کہ وہ کب صحیح راستہ پر لگاتا ہے۔ اور کب غلط راستہ پر؟ اور پھر کس طرح؟ اور کیوں لگاتا ہے؟

اگلے صفحات میں انہی اُمور کے بارہ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے:

انسانی شعُور

مغرب نے جس حد تک مادی علوم میں ترقی کی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے۔ کہ "نفسیّاتی علم" کے بارہ میں تمام مغربی اقوام کی معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ اِسی لئے اِن صفحات میں اِس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے:

جہاں تک انسانی شعُور کا تعلق ہے۔ ربّ العزت نے انسان کے جسم میں دو اعضا پیدا کئے ہیں۔ جو اُس کی عام سمجھ بُوجھ اور اِدراک کا منبع ہیں۔ اُن میں سے ایک دماغ ہے۔ اور دوسرا دِل یا قلب: انسانی دماغ میں صرف مادی شعُور ہے۔ اور قلب میں صرف رُوحانی شعُور:

اِس وقت دُنیا مادی شعُور یا دماغ کی خصوصیات سے تو واقف ہے۔ لیکن رُوحانی شعُور یا قلب کی خصوصیات سے عام طور پر آشنا نہیں: مثال کے طور پر مغرب کے نزدیک انسان کا قلب محض ایک "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ اور بس!

مغربی دُنیا نے جس نکتہ کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔ وہ یہ ہے۔ کہ قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ایک ضمیر ودیعت کی گئی ہے۔ جو خیر و شر میں تمیز کرتی ہے۔ اس کا مقام انسان کا قلب ہے۔ دماغ نہیں:

چنانچہ اس وقت ہماری دُنیا میں جتنی بھی بے راہروی ہے۔ وہ اِسی بنیادی لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ اِس لئے یہ نہایت لازمی ہے۔ کہ ہم انسانی شعُور کے منبعوں یعنی دل و دماغ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں:

Marfat.com

انسانی شعور کے دراصل تین درجے ہیں :-

(۱) اس کا پہلا درجہ عام "سمجھ بوجھ" (common sense) ہے : یہ انسان کے دماغ میں ہوتی ہے : اس سے ایک بچہ پیدا ہونے کے تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی اپنے گرد و نواح کی چیزوں کو پہچاننے لگ جاتا ہے۔ اسی سے وہ چلنا پھرنا اور باتیں کرنی سیکھتا ہے۔ اور پھر اسی سے وہ الف۔ ب۔ ج اور ۱۔ ۲۔ ۳ پڑھنا سیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایم۔ اے وغیرہ پاس کر لیتا ہے :

غرض ایک شخص جتنا موجودہ دنیوی علوم کے ذریعہ اپنے دماغ کی نشوونما (یعنی brain development) کر کے اپنی "سمجھ بوجھ" کو ترقی دیتا ہے۔ اتنی ہی یہ "سمجھ بوجھ" "عقل" میں تبدیل ہوتی جاتی ہے : اسی "عقل" (brain development) سے ایک انسان میں "لیاقت" یا "قابلیت" پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی "عقل" سے آج کل کا انسان مٹی کے چراغ سے بجلی تک پہنچ گیا ہے : گویا "عقل" "انسانی" "سمجھ بوجھ" کی معراج ہے!

(۲) انسانی شعور کا دوسرا بہتر درجہ "بصیرت" (intelligence) ہے : اس سے انسان کی فطانت۔ روشن ضمیری یا فراست مراد ہے : یہ انسان کے دل یا قلب میں ہوتی ہے : "بصیرت" دراصل کسی آدمی کی قابلیت کا نام نہیں۔ کہ وہ کس خوش اسلوبی سے کسی سے خط و کتابت کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ انسان کا باطنی جوہر ہے۔ جس سے اس کا ادراک درست ہوتا ہے : اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ (جس طرح اشارۃً اوپر کہا جا چکا ہے) ہر انسان کے دل کے اندر ایک ضمیر ہے۔ جو نیکی و بدی میں تمیز کرتی ہے : پھر جو انسان ان دونوں میں سے نیکی کو اپناتا ہے اور اسطرح اپنے دل کی نشوونما (heart development) کرتا ہے۔ اتنا ہی وہ صاحبِ بصیرت (intelligent) ہوتا ہے : اس "بصیرت" سے ایک انسان نہ صرف ہر معاملہ کے حسن و قبح کو پرکھ سکتا ہے۔ بلکہ سب قسم کے حالات کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ سکتا ہے۔ اور پھر ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے پر قادر ہوتا ہے! یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت صرف ضمیر میں ہی ہے۔ جو انسان کے دل میں ہے۔ انسانی دماغ میں نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت بالکل نہیں :

(۳) انسانی شعور کا تیسرا بہترین درجہ "دانائی" (wisdom) ہے : اس کا تعلق خدا

Marfat.com

پر ایمان لانے سے ہے ۔ ایک انسان جتنا خدا پر پختہ ایمان رکھتا ہے ۔ اتنا ہی وہ " دانا " ہوتا ہے ۔ " دانائی " کی معراج " خدا کی معرفت " یا " خدا رسیدگی " ہے ۔ اس " دانائی " کا تعلق بھی انسان کے دل سے ہے ۔ دماغ سے نہیں !

اب ہم پہلے (۱) " عقل " (brain development) اور (۲) " بصیرت " (heart development) کی بابت معلومات حاصل کریں گے ۔ اور پھر " دانائی " کا جائزہ لیں گے ۔

انسان کی " عقل " چونکہ دماغ میں ہے ۔ اور " بصیرت " دل میں ۔ لہذا ہمیں پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ کہ انسان کا دل کن باتوں سے نشوونما پاتا ہے ۔ اور دماغ کن سے ؟

اب پیشتر اس کے کہ ہم ان نکات پر غور کریں ۔ سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے ۔ کہ علم کی دراصل دو قسمیں ہیں :-

(الف) وہ علم جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے ۔

اور

(ب) وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا ۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں ۔

اب پہلے علم کی شق " الف " کو لیجئے ۔ (یعنی وہ علم جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے) ۔ یہ ظاہر ہے ۔ کہ ایک انسان جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے ۔ (خواہ وہ بالکل ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو) ۔ اُس کو اس بات کا خودبخود پتہ چلتا جاتا ہے ۔ کہ اُسے سچ بولنا چاہیئے ۔ جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے ۔ دیانتدار ہونا چاہیئے ۔ بددیانتی نہیں کرنی چاہیئے ۔ وغیرہ ۔ وغیرہ ۔ یہ علم (جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے) ۔ ہر شخص کی ضمیر میں مضمر ہوتا ہے ۔ اور اس ضمیر کا مقام انسان کا دل ہے ۔ دماغ نہیں ۔

چنانچہ ایک شخص جتنا سچ بولتا ہے ۔ اتنا ہی وہ نیک ہوتا جاتا ہے ۔ اور یہ نیک ہونا ہی اُسے " صاحب بصیرت " (intelligent) بناتا ہے ۔ لیکن اس کے برعکس جتنا ایک شخص جھوٹ بولتا ہے ۔ اتنا ہی وہ بد ہوتا جاتا ہے ۔ اور اُس کا یہ بد ہونا ہی اُسے کم فہم (unintelligent) بناتا ہے ۔

اب یہ نیکی و بدی میں تمیز چونکہ انسان کی ضمیر میں ہے ۔ اور ضمیر انسان کے دل میں ہے ۔ لہذا نیکی سے انسان کے دل کی صحیح نشوونما ہوتی ہے ۔ لیکن بدی سے یہ نشوونما رک جاتی ہے ۔ اسی لئے ایک انسان کی " بصیرت " (intelligence) کا تمام دارومدار اُس کی نیکی پر منحصر ہے ۔ لیکن نیکی (virtue) کا " بصیرت " (intelligence) کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ راز ابھی افشاں ہوگا ۔

اب علم کی شق ب کو لیجئے :۔ (یعنی وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں) :۔ مثلاً ایک انسان کو حُروفِ تہجی (الف۔ ب۔ ج) یا ہندسوں (۱-۲-۳) کی بابت مطلقاً کوئی علم ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا (جو ان علوم کو جانتا ہو) اُسے سکھائے نہیں :۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے پڑھنے سے ایک انسان کا دماغ ہی نشوونما پاتا ہے۔ اور جس حد تک ایک انسان کا دماغ نشوونما پاتا ہے۔ اُسی حد تک (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اُس کی عام "سمجھ بوجھ" "عقل" میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ "عقل" ہی کا کرشمہ ہے۔ کہ آج کل کی دُنیا بیل گاڑی سے خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ گئی ہے!

اب ہمیں دماغی نشوونما یعنی "عقل" (یا بالفاظ دیگر brain development) اور دل کی نشوونما یعنی "بصیرت" (heart development) میں جو فرق ہے۔ اُس کو سمجھنا چاہیئے :۔ یہ فرق مندرجہ ذیل مثال سے بخوبی واضح ہو جائے گا :۔

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک شخص ایسا بم ایجاد کرتا ہے۔ کہ اگر اُسے ہوائی جہاز سے کسی شہر پر پھینکا جائے۔ تو وہ تمام بستی کو ایک لمحہ میں نیست و نابود کر دے :۔ یہ ایجاد اُس عقل کا نتیجہ ہے۔ جو مُوجد نے موجودہ زمانہ کے علوم کو پڑھ کر حاصل کی :۔

اب ایک دوسرا شخص لے لیجئے :۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اِس قسم کا کام ہوائی جہازران (یعنی pilot) کے لئے بہت خطرناک ہے۔ چونکہ جب دُشمن کو پتہ چل گیا۔ کہ ہوائی جہاز سے اِس قسم کے بم پھینکے جاتے ہیں۔ تو پیشتر اس کے کہ اُس سے کوئی بم پھینکا جائے۔ دشمن اُس ہوائی جہاز کو ہی اپنا نشانہ بنائے گا: تاکہ کوئی بم پھینکا ہی نہ جا سکے :۔ لہٰذا دوسرا شخص ایک ایسی مشین ایجاد کرتا ہے۔ کہ اُس کے ایک بٹن کو دبانے سے ہوائی جہاز خود بخود اُڑے۔ اور خود بخود ہی بم کو ایک سوچے سمجھے مقام پر پھینک دے :۔ یہ ایجاد پہلی ایجاد سے بدرجہا بہتر ہے :۔ لیکن یہ بھی اُسی دماغی نشوونما یعنی "عقل" کا نتیجہ ہے۔ جو موجودہ علوم کو پڑھ کر حاصل کی گئی ہے :۔

اب ایک تیسرا شخص لے لیجئے :۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ایک بم کے گرانے سے ایک بستی کی بستی کو ایک لمحہ میں نیست و نابود کر دینا کون سی مردانگی یا بہادری ہے؟ انسانی ہمدردی یہ چاہتی ہے۔ کہ دُنیا ان ظالمانہ حرکات سے احتراز کرے :۔

اِس قسم کی بات کہنا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ اِس شخص میں "بصیرت" (intelligence) ہے! یہ جوہر ریاضی کے مشکل سوال حل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ نیک کرداری سے حاصل ہوتا ہے :۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو دماغ اِس حد تک ترقی کر چکا ہے۔ کہ وہ اِس قسم کے زہریلے بموں کو ایجاد

Marfat.com

کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جو ایک بستی کی بستی کو چند لمحوں میں نیست و نابود کر دیں۔ وہ اِس بات کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔ کہ کسی شہر کی تمام آبادی کو برباد کرنا ایک سخت اخلاقی جُرم ہے؟

اِس کی وجہ یہ ہے۔ (اور مغرب اِس راز سے ابھی تک بالکل آشنا نہیں) کہ دماغ میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔ یہ اہلیت صرف انسان کی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام انسان کا دل ہے ؛ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ دماغ کی نشو و نما سے ایک انسان حساب کے سوال تو درست طور پر حل کر سکتا ہے۔ یا ایک بم کا مُوجد بھی بن سکتا ہے۔ لیکن آیا ایک شخص کو ظالم ہونا چاہئیے یا رحمدل۔ دماغ اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ چونکہ یہ دماغ کا فعل ہی نہیں۔ یہ خصوصیت صرف انسان کے دل میں ہے ؛ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ انسانی دماغ ایک مشین کی طرح ہے۔ اِس میں نہ کسی قسم کی حِسّ ہے۔ نہ جذبہ۔ نہ لگاؤ ہے۔ نہ ہمدردی۔ نہ محبّت ہے نہ عشق!

اب یہ نظریّہ کہ دماغ میں کسی قسم کا حِسّی جذبہ نہیں' اس کا ثبوت اِس سے ملتا ہے۔ کہ جب ہم کوئی غم یا خوشی کی خبر سُنتے ہیں۔ تو مغموم ہمیشہ دل ہی ہوتا ہے۔ اور سرور بھی دل ہی کو پہنچتا ہے۔ دماغ نہ مغموم ہوتا ہے۔ نہ مسرور! چونکہ دماغ میں کسی قسم کا جذبہ نہیں!

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو شعُور انسان سے بم بنواتا ہے۔ وہ بھی "سمجھ" ہی ہے۔ اور جو شعُور انسان کو یہ کہتا ہے۔ کہ ایک بم سے کسی شہر کی تمام آبادی کو چند لمحوں میں نیست و نابود کر دینا ہوشمندی کی دلیل نہیں۔ وہ بھی "سمجھ" ہی ہے۔ پہلی "سمجھ" اور دوسری "سمجھ" میں اتنی اجنبیّت کیوں ہے؟

یا اِس مسئلہ کو یوں کہہ لیجئے۔ کہ وہ دماغ جو بم بنانے کی اہلیّت رکھتا ہے۔ وہ بموں کے اِستعمال سے جو اخلاقی جرائم ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اُن کی اہمیّت سے اتنا بے خبر کیوں ہے؟ یا قلب جو اِن جرائم کی ہولناک صورت کی اِس قدر حِسّ رکھتا ہے۔ وہ مادی دائرہ میں قدم کیوں نہیں رکھ سکتا۔ کہ وہ اس قسم کے بم بننے ہی نہ دے!

اِس صورتِ حال سے ہمیں اِس نظریّے کی تائید ملتی ہے۔ کہ انسان میں شعُور دو قسم کا ہے۔ اور اِن دونوں شعُوروں کے منبعے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور اِن کی خصوصیات بھی بالکل مختلف ہیں ؛ ایک شعُور دماغ میں ہے۔ دوسرا قلب میں ؛

دماغ کے شعُور (یعنی "عقل") کی خصوصیّت یہ ہے۔ کہ وہ بموں کی ایجاد کی اہلیّت تو رکھتا ہے۔ لیکن اُس میں یہ شعُور نہیں کہ وہ یہ بتا سکے کہ بموں کا استعمال جائز کہاں ہے؟ اور ناجائز کہاں؟

اس کے برعکس قلب کے شعُور (یعنی "بصیرت") کی خصوصیّت یہ ہے۔ کہ وہ بموں کو ایجاد تو نہیں کر سکتا۔ لیکن اُن کے ناجائز استعمال پر احتجاج کرنے کی اہلیّت رکھتا ہے!

Marfat.com

گویا دماغ کے شعور میں "عقل" تو ہے۔ لیکن "عقلمندی" (یا "بصیرت") بالکل نہیں! یہ اس لئے کہ موجودہ زمانے میں جتنے بھی مادی علوم ہیں۔ (جو انسان کے دماغ کی نشوونما کرتے ہیں) مثلاً ریاضی۔ فزکس یا کیمسٹری وہ خیر و شر کے لحاظ سے بالکل "غیر جانبدار" ہیں :

مثال کے طور پر ریاضی کا علم ہمیں یہ تو بتاتا ہے۔ کہ جمع و تفریق یا ضرب و تقسیم کے سوال کس طرح حل کرنے چاہئیں؟ لیکن یہ قواعد یہ نہیں بتا سکتے۔ کہ ایک انسان کو سخی ہونا چاہیئے۔ یا بخیل؟

اسی طرح موجودہ سائنس ہمیں یہ تو بتاتی ہے۔ کہ دشمن کی فوج کو کس قسم کی مشین گنوں سے نیست و نابود کیا جا سکتا ہے؟ یا اپنے آپ کو دشمن کے حملوں سے کس طرح محفوظ کرنا چاہیئے؟ لیکن موجودہ سائنس یہ نہیں بتا سکتی۔ کہ دنیا کی قوموں کو امن و چین سے رہنے کے لئے کون سے اصولوں پر کاربند ہونا لازمی ہے؟

یہ باتیں ہمیں صرف "بصیرت" بتا سکتی ہے۔ جو دل کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو نیک کرداری کے بغیر ممکن نہیں!

اب چونکہ مغرب کو اس بات کا علم ہی نہیں۔ کہ دل کی نشوونما بھی اس دنیا میں کوئی چیز ہے۔ (چہ جائیکہ اُس کو یہ علم ہو۔ کہ "بصیرت" دراصل صرف دل کی صحیح نشوونما کا ہی دوسرا نام ہے)۔ لہٰذا قدرتی طور پر مغرب کو ابھی یہ معلوم ہی نہیں کہ "بصیرت" (intelligence) کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ چنانچہ نفسیاتی علم کے ماہرین ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ ایک انسان جتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ یا جتنے اچھے ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ فطین یا صاحبِ بصیرت ہوتا ہے : یہ نظریہ غلط ہے : مغرب جس بات کو سمجھ نہیں سکا۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب ایک بچہ (الف۔ ب۔ ج یا ۱۔ ۲۔ ۳ سیکھتا ہے۔ تو اُس سے بچے کی معلومات (information) میں اضافہ ہوتا ہے۔ "بصیرت" (intelligence) میں نہیں!

اسی غلط فہمی کی بنا پر اہلِ مغرب جب چند لڑکوں کے شعور کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ تو وہ (مثال کے طور پر) ایک شیر کی تصویر کو کاٹ کر اُس کے آٹھ دس ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ اور پھر اُن ٹکڑوں کو آپس میں ملا جلا کر ممتحن لڑکوں سے کہتے ہیں۔ کہ ان مختلف ملے جلے حصّوں کو جوڑ کر وہ شیر کی تصویر بنائیں : چنانچہ جو اُس کو بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اُن کو فطین (intelligent) سمجھا جاتا ہے! لیکن مغرب اس بات کو سمجھ ہی نہ سکا۔ کہ جو لڑکے اِس قسم کے مختلف حصص کو جوڑ کر کامیابی سے شیر کی تصویر بنا لیتے ہیں۔ اس سے اُن لڑکوں کے دماغ یا ذہن کی نشوونما یعنی "عقل" (یا بالفاظِ دیگر brain development کا اندازہ ہوتا ہے "فطانت" یا "بصیرت" (یا بالفاظِ دیگر intelligence) کا نہیں!

Marfat.com

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی شخص میں "بصیرت" کتنی ہے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ اُس کے پاس موجودہ یونیورسٹیوں کی کتنی ڈگریاں موجود ہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا لازمی ہے۔ کہ کیا اُس میں یہ صلاحیت ہے؟ کہ وہ:-

(۱) دوسرے شخص کے نقطۂ نگاہ کو صحیح طور پر سمجھ سکے:

(۲) دوسرے شخص کے کردار (یا روزمرّہ کے حالات) کا صحیح اندازہ لگا سکے:

(۳) دوسروں کے ساتھ معاملات میں عدل وانصاف کر سکے:

(۴) معاملات کے حسن و قبح کو پرکھ سکے:

(۵) ازلی صداقتوں کی اہمیّت کا خود بخود احساس کر سکے:

(۶) الہامی کتابوں کے اصلی مفہوم کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔

وغیرہ۔ وغیرہ:

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان میں اس قسم کی صلاحیّت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ رسولِ عربیؐ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے: آپ کا ارشاد ہے۔ کہ ایک انسان میں "بصیرت" (intelligence) پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ ظاہری مادی علوم کو حاصل کرے: بلکہ اُس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ نیک کردار ہو: اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا ذکر آگے آئے گا:

موجودہ زمانہ کی بدقسمتی اس میں رہی۔ کہ ہم نے بدنی نشوونما کے اصولوں کو تو نہایت اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ اگر کوئی شخص ضرورت سے زیادہ کھائے گا۔ تو وہ بدہضمی کا شکار ہوگا۔ لیکن جہاں تک انسانی کردار کا تعلق ہے۔ عام طور پر ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں۔ کہ اگر (مثال کے طور پر) کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے۔ تو پھر کیا ہوتا ہے؟

نفسیّاتی علم کے ماہرین معاملہ کے اِس پہلو سے ابھی تک بالکل ناواقف ہیں! اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مغرب جب نفسیّاتی معاملات پر غور کرتا ہے۔ تو وہ "پیکرِ محسوس" کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ لیکن "پیکرِ محسوس" کے اندر جو جان، رُوح یا ضمیر ہے۔ اُس کو وہ بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس کی تحقیق بالکل ادھوری رہ جاتی ہے۔ اور جن نتائج پر وہ پہنچتا ہے۔ وہ نہایت سطحی ثابت ہوتے ہیں: اس کا ثبوت مندرجہ ذیل اقتباس سے ملے گا:

جارج سڈنی بریٹ۔ ایم۔ اے اپنی کتاب سائیکولوجی۔ قدیم و جدید (Psychology - Ancient and Modern) کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں:-

(آزاد ترجمہ) "اگر ہم 'سائیکولوجی' کے لفظ کو عام معنی میں استعمال کریں۔ جس میں کہ رُوحانی کیفیت

بھی شامل ہو۔ تو ہم شروع میں ہی غلطی کا شکار ہو جائیں گے:: جدید روشنی والوں کا یہ دعویٰ کہ سائیکولوجی اب سائینٹفک طریقہ سے سمجھی جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام خیالی نظریوں کو خواہ وہ مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، یا اخلاق، دینیات اور رُوحانیت سے، ان سب کو بکلّم علیحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ یہ نظریے حقیقت کے سمجھنے میں مخل نہ ہوں:: ایسا کرنے سے اگر زیر بحث معاملہ پچاس فی صدی کٹ جائے۔ تو مضائقہ نہیں۔ کیونکہ نئی سائیکولوجی کے حامی اپنے باقی پچاس فیصدی سے ہی بالکل مطمئن ہیں:: یہ اس لئے کہ بحث کو خیالی نظریات سے پاک کرنے کے بعد باقی جو بکھر رہ جاتا ہے۔ وہ محسوس کیا جاسکتا ہے:: اس کے متعلق ظاہر ہے۔ کہ ہر قسم کی چھان بین کی جاسکتی ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہیں رہتا::

اس سلسلہ میں جہاں مغرب نے ٹھوکر کھائی۔ اُس کی جڑ، خیالات کی اسی قسم کی افتاد میں ہی ہے:: انسان محض جسم نہیں ہے۔ بلکہ وہ مرکّب ہے۔ جسم اور رُوح کا:: ہم رُوح کو جب "غیر محسوس" یا "غیر مرئی" سمجھ کر علیحدہ کر دیتے ہیں۔ تو پھر ظاہر ہے۔ کہ باقی صرف جسم رہ جائے گا:: لہٰذا محض جسم کو سامنے رکھ کر جب ہم نفسیاتی علم کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ تو وہ بالآخر بے معنی ہی ثابت ہونا چاہیئے:: اس قسم کی بنیاد پر جو عمارت بھی بنائی جائے گی۔ وہ مستحکم نہیں ہو سکتی::

چنانچہ اسی طرح جب ہم اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر نیک کرداری یا بدکرداری کو "غیر محسوس" یا "غیر مرئی" ہونے کی وجہ سے بحث کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ نیکی یا بدی سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ہم اُن سے آگاہ نہیں ہوتے::

اس کے برعکس رسولِ عربی ؐ نے ایک حدیث میں نیک کرداری اور بدکرداری سے لامحالہ جو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اُن کو ایسی حیران کُن سادگی سے بیان فرمایا ہے۔ کہ اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان بھی اس اَدق مسئلہ کی گُتھیوں کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے::

آپ کا ارشاد ہے:-

اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ كَانَتْ نُقْطَةٌ سَوْدَآءُ فِیْ قَلْبِہٖ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ

(یعنی جب کوئی مومن گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر رُوحانی طور پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ توبہ کر لے۔ اور معافی مانگ لے۔ پھر تو یہ داغ دُھل جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے۔ اور گناہ کرتا جائے۔ تو پھر

آہستہ آہستہ اُس کا سارا دل سیاہ[*] ہو جاتا ہے)؛

اس حدیث میں جو راز مُضمر ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم جب بھی کوئی ایسا فعل کرتے ہیں جس کا تعلق ہمارے کردار یا چلن سے ہوتا ہے۔ تو اُس کے عوض ہمارے دل پر رُوحانی طور پر ایک نقطہ پڑ جاتا ہے؛ اُس کی صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ نیک کام کے عوض میں تو وہ نقطہ روشن ہوتا ہے۔ لیکن بد کام کے عوض میں یہ ایک سیاہ داغ کی صورت میں ہوتا ہے؛ یہی نقطے پھر ہماری ذہنیت بناتے ہیں۔ اور ہم میں صحیح یا غلط ادراک پیدا کرتے ہیں؛ یہ اس طرح کہ روشن نقطوں سے تو ہم روشن ضمیر ہوتے جاتے ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر ہم میں "بصیرت" (intelligence) پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم معاملات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اور پھر صحیح نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن سیاہ داغوں سے ہم میں کج فہمی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نہ معاملات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ صحیح نتائج اخذ کر سکتے ہیں؛

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ایک "کورا" دل ودیعت کیا گیا ہے؛ اگر ہم نیک کردار ہوتے ہیں۔ تو اس نیک کرداری کی وجہ سے ہمارے دل پر رُوحانی طور پر روشن نقطے پڑتے جاتے ہیں۔ جو ہمیں روشن ضمیر بناتے ہیں؛ ایسے لوگ پھر صاحبِ بصیرت (intelligent) کہلاتے ہیں۔ لیکن بُرے کاموں سے ہمارے دِل پر رُوحانی طور پر سیاہ داغ پڑتے جاتے ہیں۔ جو ہمیں کج فہم بناتے ہیں۔ ایسے لوگ پھر بیوقوف (unintelligent) کہلاتے ہیں؛

اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے اشارۃً کہا جا چکا ہے)۔ کتابیں پڑھنے سے صرف ہماری معلومات (information) میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ (جس سے ہماری لیاقت بڑھتی ہے۔ یعنی ہم خط و کتابت وغیرہ کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں)۔ لیکن "بصیرت" (intelligence) نہیں بڑھتی؛ یا بالفاظِ دیگر یُوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ اخلاق کی اچھی باتیں جو ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اگر ہم اُن پر عمل بھی کریں۔ پھر تو ہماری بصیرت بڑھتی ہے۔ لیکن اگر ہم اُن اچھی باتوں پر عمل نہ کریں۔ بلکہ اُن کے برعکس کریں۔ تو پھر ہماری کج فہمی بڑھتی ہے؛

اس کا مطلب یہ ہُوا۔ کہ صرف اخلاق کی اچھی کتابیں پڑھنے یا اچھے ماحول میں رہنے سے ہماری بصیرت نہیں بڑھتی۔ جب تک کہ اس قسم کی اخلاق کی باتیں یا اچھا ماحول ہمیں اس بات پر نہ اُکسائیں۔ کہ ہم نیک کردار بھی ہوں؛

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ "بصیرت" قدرت کی طرف سے ایک انعام ہے۔ جو کہ ایک انسان کو اُس کی نیک کرداری کے عوض میں ملتا ہے۔ اور "کج فہمی" قدرت کی طرف سے ایک سزا ہے۔ جو کہ ایک انسان کو اُس کی بدکرداری

[*] حاشیہ کے لئے دیکھیں صفحہ ۳۳۴؛ (اس حاشیہ کو ضرور مُلاحظہ فرمائیں)؛

Marfat.com

کے عوض میں ملتی ہے ؛

پس اگر ہم صاحبِ بصیرت (intelligent) ہونا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں لامحالہ سچ بولنا ہوگا۔ دیانتدار ہونا ہوگا۔ سخی ہونا ہوگا۔ عفو و درگذر کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ پاکباز ہونا ہوگا۔ وغیرہ۔ وغیرہ ؛

لیکن اگر ہم دروغگو۔ بددیانت۔ کنجوس۔ ظالم۔ اور بدمعاش ہوئے۔ تو پھر اس بدکرداری کی وجہ سے رُوحانی طور پر جو سیاہ داغ ہمارے دل پر پڑیں گے۔ اُن کی وجہ سے ہم ایسے کج فہم ہوں گے۔ کہ ہم کسی معاملہ کو اُس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور روشنضمیری اور دُوراندیشی و دُوربینی ہمارے پاس بھی نہ پھٹکے گی ؛

یہاں ایک انسان کے دل میں جو شُبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ موجودہ تعلیم کو صحیح شعور (بصیرت) کا ذمہ دار نہ سمجھنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ شُبہ مندرجہ ذیل مثال سے آسانی سے رفع ہو جائے گا:

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک لڑکا ہندسے سیکھنا شروع کرتا ہے۔ اور چند سالوں میں وہ ایک اچھا ریاضی دان بن جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ لڑکا ہندسوں کا پہلا سبق لیتے وقت کنجوس تھا۔ تو ریاضی دان بن کر وہ سخی نہیں ہو جائے گا۔ چونکہ حساب کے سوال ایک انسان کے دماغ کی نشوونما کرتے ہیں۔ کہ وہ اس قابل ہو جائے۔ کہ وہ ایک اعلیٰ قسم کا ریاضی دان بن جائے۔ لیکن اس دماغی نشوونما کا اثر اُس کے کردار پر نہیں پڑتا۔ کہ وہ کنجوس سے سخی بن جائے۔ اور ہم یہ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ کہ ایک انسان کی فطانت۔ روشنضمیری۔ دُوربینی اور معاملہ فہمی کا دارومدار صرف اس بات پر ہے۔ کہ وہ کس حد تک نیک کردار ہے ؛ گویا روشنضمیری کا تعلق صرف دل سے ہے۔ اور دل صرف نیک کرداری سے نشوونما پاتا ہے۔ حساب کے سوالوں کو حل کرنے سے نہیں ؛ گویا بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ حساب کے سوال حل کرنے یا دوسرے دنیوی علوم حاصل کرنے سے ایک انسان کی "عقل" ہی بڑھتی ہے۔ "بصیرت" نہیں بڑھتی!

اس وقت مغرب کے لوگ جو ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اُس کی وجہ سے یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے دنیوی علوم حاصل کر کے اپنی "عقل" بڑھائی جس سے وہ مختلف ایجادات کے مُوجد بن گئے۔ اور اس وقت چونکہ وہ صداقت و دیانت کے لحاظ سے بھی ہم میں سے بہتوں سے بہتر ہیں۔ لہٰذا وہ ہم سے "فطین" (intelligent) بھی زیادہ ہیں ؛

لیکن جو سب سے تعجب انگیز بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مغرب کو اپنی ہی فطانت (intelligence) کے راز کا علم نہیں!

یہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ مغرب تب ہی سمجھ سکتا تھا جب وہ نفسیاتی علوم میں جستجو کرتے وقت جسم اور جان یا بالفاظِ دیگر "مرئی" اور "غیر مرئی" دونوں حالتوں کو سامنے رکھتا۔ لیکن چونکہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔

Marfat.com

لہذا اُس نے اِس مقام پر ٹھوکر کھائی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ نہ صرف مغرب کے لوگ بلکہ مغربی تعلیمیافتہ مسلمان بھی اب "عقل" کے ہی دلدادہ ہیں۔ "بصیرت" کو انہوں نے نفسیّاتی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی؛ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان انگریزی ہے۔ وہ اِس زبان کے لفظ ''intelligence'' کو بھی (جو صحیح طور پر صرف "بصیرت" کے معنوں میں ہی استعمال کیا جا سکتا ہے)۔ غلطی سے "عقل" (brain development) کے معنوں میں استعمال کرنے لگ گئے ہیں؛ اِس غلطی کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ اُنہوں نے اِس بات کو سمجھا ہی نہیں۔ کہ ''intelligence'' (یا "بصیرت") وہ شعور ہے جو صرف نیک کرداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور "عقل" کے لئے موجودہ دنیوی علوم کو تو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن نیک کرداری سے اِس کا کوئی تعلق نہیں؛

اِسی لئے ہمارا انگریزی تعلیمیافتہ طبقہ بھی جو مغرب کی اندھی تقلید ہی کرتا ہے۔ وہ بھی انگریزی کے لفظ intelligence کو "عقل" کے معنوں میں ہی استعمال کرتا ہے۔ جو بالکل غلط ہے؛ اس کی مثال آگے آئے گی۔ یہاں ہم پہلے اس نظریئے کی سند معلوم کر لیں؛

اِس کی سند چیمبرز ڈکشنری ہے۔ اِس کے مطابق "intelligent" (یعنی صاحبِ بصیرت) اُس شخص کو کہتے ہیں۔ جس میں معقولیت ہو یعنی:۔

who is endowed with the faculty of reason

اور اِسی ڈکشنری کے مطابق reason (یا معقولیت) کے معنی صحیح اِدراک کے ہیں۔ یعنی

The faculty of the mind by which man draws conclusions, and determines *right* and *truth*; *just* view of things; RIGHT CONDUCT.

گویا intelligent (یا صاحبِ بصیرت) وہ شخص ہے۔ جس میں معقولیت ہو۔ اور معقولیت سے مُراد وہ صحیح شعوُر یا اِدراک ہے۔ جس سے ایک انسان صحیح نتائج اخذ کرتا ہے۔ حق اور صداقت کو پہچانتا ہے۔ معاملات کو عادلانہ طریق سے پرکھتا ہے۔ اور نیکی و بدی میں تمیز کر کے ہمیشہ نیکی کو ترجیح دیتا اور اپناتا ہے؛ اِس سے یہ بات واضح ہو گئی۔ کہ (جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے) ۔ انگریزی کے لفظ ''intelligence'' کا اطلاق صرف اُس شعوُر پر ہے۔ جو نیک کرداری کا نتیجہ ہو!

لیکن ہمارے مغربی تعلیمیافتہ طبقہ کی کورانہ تقلید مندرجہ ذیل مثال سے ظاہر ہو گی؛ بہت مدت کا ذکر ہے۔ کہ "پاکستان ٹائمیز" (لاہور) کے خط و کتابت والے کالموں میں ایک بحث چلی۔ کہ ''intelligence''

Marfat.com

(یا بصیرت) کیا ہے ؟

اِس سلسلہ میں ایک مراسلہ نگار نے لکھا:۔

"نیکی (virtue) کا فطانت (intelligence) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ نہ فطانت نیکی کرداری کا نتیجہ ہے!" (دیکھو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۱۳ راکتوبر ۱۹۵۶ء)؛

اِسی طرح ایک دوسرے صاحب نے لکھا:۔

"فطانت" کا تعلق دراصل اعصاب سے ہے۔ اگر یہ اعصاب ایک خاص طریقہ سے متحرک ہوں۔ تو فطانت نمودار ہوتی ہے!" (دیکھو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۲۲ راکتوبر ۱۹۵۶ء)؛

اِن الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اوپر کے اقوال لکھتے وقت دونوں مراسلہ نگاروں کے سامنے صرف وہ "عقل" ہے۔ جو آج کل کے انسان کو ایک کامیاب انجینیر۔ ڈاکٹر یا مُوجد بناتی ہے؛ اور ہمیں اب یہ بھی معلوم ہے کہ اِس "عقل" کے لئے کسی نیکی کرداری کی ضرورت نہیں۔

کیونکہ ایک دروغ گو انسان بھی انجینیرنگ کا ویسا ہی ماہر ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ایک راستگو انسان؛ اِسی طرح ریڈیو کے مُوجد کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ پارسا بھی ہو!

لیکن اس کے برعکس "بصیرت" پیدا ہی تب ہوتی ہے۔ جب ایک شخص صحیح معنوں میں نیک کردار ہو! اِن حقائق کو مدنظر رکھتے ہوتے کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں۔ اگر ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ نہایت بیباکی کے ساتھ یہ کہنا سُنائی دے کہ نیکی virtue کا فطانت یا بصیرت (intelligence) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ؟

اب سوال یہ ہے۔ کہ اِس قسم کی غلطی جدید تعلیمیافتہ حضرات سے کیوں سرزد ہوتی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ حضرات "بصیرت" جو نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو تو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ لیکن "عقل" جو محض دنیوی علوم کو پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس کو وہ اپنی بے علمی کی وجہ سے "intelligence" (یا "بصیرت") کا نام دیتے ہیں!

لیکن موجودہ بحث سے یہ واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ مندرجہ بالا مراسلہ نگار نفسیات کے علم کی ابجد سے بھی واقف ہیں؛ اِس بے علمی کی تہ میں یہ بات ہے۔ کہ آج کل ہم "عقل" والے شعُور کو ہی سمجھتے ہیں۔ "بصیرت" والے شعُور سے آشنا ہی نہیں۔ اور اِس کے نتیجہ کے طور پر ہمیں اِس وقت اِس بات کا علم ہی نہیں۔ کہ:۔

(۱) شعُور دو قسم کا ہے۔ ایک مادی دوسرا رُوحانی؛

(۲) مادی شعُور لکھنا پڑھنا سیکھنے اور حساب کے سوال حل کرنے سے حاصل ہوتا ہے؛ رُوحانی

Marfat.com

شعور، نیکی و بدی میں تمیز کرنے اور پھر صرف نیکی کو ہی اپنانے سے حاصل ہوتا ہے :

(۳) مادی شعور انسان کے دماغ میں ہے۔ رُوحانی شعور انسان کی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام انسان کا دل یا قلب ہے :

(۴) مادی شعور کے لئے کسی قسم کی نیک کرداری کی شرط نہیں۔ رُوحانی شعور کے لئے نیک کرداری اولین شرط ہے!

اِس تفصیل سے اب یہ بات عیاں ہو گئی ہوگی۔ کہ مندرجہ بالا دونو مراسلہ نگاروں کے اقوال کس قدر بے معنی اور حقیقت سے دُور ہیں :

قولِ اوّل (یعنی نیکی کا فطانت سے کوئی تعلق نہیں) اِس لئے غلط ہے۔ کہ ایک انسان کی نیک کرداری ہی وہ سرچشمہ ہے۔ جس سے اُس کی "فطانت" یا "بصیرت" پھوٹتی ہے :

اور دوسرا قول (یعنی فطانت کا تعلق انسان کے اعصاب سے ہے) اِس لئے غلط ہے۔ کہ ایک اعصاب کا مریض اپنی نیک کرداری کی وجہ سے بے حد رُوشن ضمیر اور صاحبِ بصیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس کے برعکس ایک وجیہہ انسان اپنی بے رہروی کی وجہ سے بے حد کج فہم ہو سکتا ہے!

اب یہ بات کہ جس شخص میں "عقل" ہے۔ اُس میں "بصیرت" کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ ذیل کی مثال سے واضح ہو جائے گا

فرض کر لیجئے کہ ایک شخص آج کل کے دنیوی علوم حاصل کر کے ایک ایسا بم ایجاد کرتا ہے۔ جو نصف دُنیا کو چند لمحوں میں تہس نہس کر دے : اب جہاں تک مُوجد کی ایجاد کا تعلق ہے۔ اِس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ "قابلیت" کے لحاظ سے اِس مُوجد کا کوئی ثانی نہیں : لیکن یہی مُوجد اگر اپنے بم کو پھینک کر واقعی آدھی دُنیا کو نیست و نابود کر دے۔ تو کیا کوئی ہوشمند انسان اِس کو صاحبِ بصیرت کہے گا؟

اب سوال یہ ہے۔ کہ مغرب نے عقل کے راز کو کیوں سمجھا؟ اور "بصیرت" کے بارہ میں وہ لاعلم کیوں رہا؟ اِس کی حقیقی وجہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ مغرب نے مادی چیزوں کا ہی تجزیہ کیا۔ لیکن رُوحانی نقطۂ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اِسی وجہ سے اُس نے دل کی بابت یہ تو معلوم کر لیا۔ کہ وہ "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ لیکن اِس بات سے بے خبر رہا۔ کہ دل میں ضمیر کے نام کی بھی کوئی چیز ہے۔ جو بصیرت کا سرچشمہ ہے : اور ہمارا مغربی تعلیمیافتہ طبقہ اِس لئے بے خبر رہا۔ کہ وہ محض مغرب کی لکیر کا فقیر ہے۔ اور اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے مذہبی علوم سے بے بہرہ رہ کر اُس نے اپنے آپ کو اسلام کے جواہر پاروں سے محروم رکھا!

Marfat.com

اِس سلسلہ میں ایک دوسرا نکتہ جہاں ہمارے مغربی تعلیمیافتہ حضرات غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ اخلاقی قوانین (یا بالفاظِ دیگر نیک کرداری) اور معاشرتی نظام (یعنی مقامی رسم و رواج) کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب اُنہوں نے دیکھا کہ :-

(۱) مغرب میں اگر کوئی مرد کسی عورت کا شارع عام میں بوسہ لے۔ تو وہاں کے لوگ کوئی عیب نہیں سمجھتے! لیکن

(۲) اگر یہی فعل مشرق میں کیا جائے۔ تو یہ ایک نہایت مذموم حرکت سمجھی جاتی ہے۔

تو اُنہوں نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ گناہ دراصل کوئی شے نہیں۔ یہ ایک اضافی اصطلاح ہے۔ جس کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ کیونکہ جو بات مغرب میں مباح ہے۔ وہی مشرق میں ناجائز ہے۔

اِس سلسلہ میں جس نکتہ پر اُنہوں نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ یہاں "نیک کرداری" اور "رسم و رواج" کو غلط ملط کر رہے ہیں :

یہ بات کہ گناہ ایک اِضافی شے نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ مندرجہ ذیل مثال سے بخوبی واضح ہو جائیگی :

فرض کر لیجئے۔ کہ کراچی بندرگاہ پر ایک پردیسی بہت سے سامان کے ساتھ جہاز سے اترتا ہے : کسٹم کے افسر اُس سے پوچھتے ہیں۔ کہ اُس کے پاس ریشم کا اَن سلا کپڑا تو نہیں ہے؟ وہ کہتا ہے۔ کہ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اِس سلسلہ میں ایک فارم بھر کر اُس پر دستخط کر کے بھی دے دیتا ہے۔ کہ اُس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں۔ جس پر کسٹم ڈیوٹی ضروری ہو : لیکن جب اُس محکمہ کے لوگ اُس کے اسباب کی چھان بین کرتے ہیں۔ تو اُس میں اُنہیں چالیس ہزار روپے کی مالیت کا اَن سلا ریشمی کپڑا ملتا ہے : اب وہ شخص اپنی صفائی میں یہ تو کہہ سکتا ہے۔ کہ اُس کے اپنے ملک میں اِس قسم کے کپڑے پر کوئی کسٹم ڈیوٹی نہیں دینی پڑتی : لیکن وہ اِس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ جو فارم اُس نے کسٹم کے محکمے کو بھر کر دی۔ اُس میں اُس نے یہ جھوٹ لکھا۔ کہ اُس کے پاس کوئی اَن سِلا ریشمی کپڑا نہیں ہے :

اب کیا کوئی ہوشمند شخص یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اِس قسم کا جھوٹ ایک اِضافی شے ہے۔ یا یہ محض جغرافیائی حیثیت رکھتا ہے؟ اِس سلسلہ میں ہمارے جدید تعلیمیافتہ حضرات نے جس بات کو محسوس نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ "نیک کرداری" اور "رسم و رواج" کی حیثیت بالکل علیحدہ علیحدہ ہے۔ اِن کو غلط ملط نہیں کرنا چاہئے :

اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جہاں تک معاشرتی قوانین۔ جنسی اقدار اور رسم و رواج کا تعلق ہے۔ یہ قریہ بہ قریہ اور ملک بہ ملک بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اخلاقی قوانین اور نیک کرداری کا تعلق ہے۔ یہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی معیار پر قائم ہیں : مثلاً دودھ میں پانی ملا کر بیچنا، اگر حضرت آدمؑ کے وقت گناہ تھا۔ تو اب بھی وہ ویسا ہی گناہ ہے۔ لیکن ایک قوم مُردوں کو دفن کرتی ہے۔ لیکن دوسری

Marfat.com

اُنہیں آگ میں جلاتی ہے۔ اِس کا تعلّق کُلیات یا واجبات سے ہے۔ جو مختلف مذاہب میں مختلف ہیں ٭ اور اِن کُلیات پر عمل کرنے سے ایک انسان کی "بصیرت" پر اثر نہیں پڑتا ٭

اِسی لئے "بصیرت" کے لحاظ سے ایک راستگو مسلمان (جو اپنے مُردوں کو دفن کرتا ہے) اور ایک راستگو غیر مسلم (جو اپنے مُردوں کو آگ میں جلاتا ہے) برابر ہیں ٭ اُن کی "بصیرت" میں اُس وقت فرق پڑے گا۔ جب وہ بدکرداری پر اُتر آئیں گے۔ اور بدکرداری سے مُراد دروغ گوئی۔ بددیانتی۔ بے صبری۔ کنجوسی۔ حسد یا ناپاکدامنی وغیرہ ہے۔ نہ کہ اپنے اپنے رسم ورواج یا مذہبی واجبات کے مُطابق عمل ٭ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ایک انسان کے دل پر سیاہ داغ اُس وقت پڑتے ہیں۔ جب وہ بدکرداری پر اُتر آئے۔ لیکن جب تک وہ اپنے ماحول یا ملک کے رسم و رواج کے مطابق دیانتداری سے عمل کرتا ہے۔ اُس وقت تک اُس کے دل پر سیاہ داغ نہیں پڑتے۔ کیونکہ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا

(سورۃ ۱۷ بنی اسرآئیل۔ آیت ۸۴)

(یعنی ہر شخص اپنے اپنے طریقہ کے مُطابق عمل کرتا ہے۔ اور تمہارا رب ہی صحیح طور پر جانتا ہے۔ کہ کون بہتر طریق پر ہے) ٭

اب آپ انسانی شعُور کے تیسرے بہترین درجہ یعنی "دانائی" کو لیں۔ جس کی معراج عِرفان و وجدان ہے ٭

دانائی کا تعلّق رُوحانیّت یا دِین سے ہے۔ یعنی جو شخص کردار کے لحاظ سے صرف صداقت و دیانت وغیرہ کا پابند ہوگا۔ وہ تو فطین اور صاحبِ بصیرت (intelligent) ہوگا۔ لیکن جو صداقت و دیانت وغیرہ پر پابند ہونے کے علاوہ، خدا کو بھی مانتا ہوگا۔ وہ دانا (wise) ہوگا ٭

بصیرت اور دانائی میں فرق یہ ہے۔ کہ ایک صاحبِ بصیرت شخص (جو صداقت و دیانت پر کاربند ہے۔ لیکن خدا کو نہیں مانتا) اپنی فطانت اور فراست کی وجہ سے اِس دُنیاوی زندگی میں تو ضرور امن و امان چاہے گا۔ لیکن اُخروی دُنیا میں اُسے دہریہ ہونے کی وجہ سے چین نصیب نہیں ہوسکتا ٭

اِس سلسلہ میں مسٹر برٹ رینڈ رسل (Mr. Bertrand Russell) (جو برطانیہ کے مشہور فلسفی ہیں) کی مثال بہت موزُوں ہے ٭ جہاں تک دُنیا میں امن و امان قایم کرنے کا تعلق ہے۔ اِس سلسلہ میں اُن کی کوششوں سے کون واقف نہیں؟ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے۔ اِس بارہ میں وہ بہت

Marfat.com

متذبذب میں ہیں۔ چونکہ اُن کے نزدیک یہ امر واضح نہیں ہے۔ کہ اِس دُنیا کی کبھی ابتدا بھی ہوئی تھی۔ لہذا وہ اِس دُنیا کو ازلی تصور کرتے ہیں۔ اِس قسم کے تخیّل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان آہستہ آہستہ یہ تصور کرنے لگ جاتا ہے کہ یہ دنیا نہ صرف ہمیشہ سے ہے۔ بلکہ ہمیشہ اِسی طرح ہی رہے گی۔ گویا اِس جہان کی نہ ابتدا ہے۔ اور نہ انتہا! تخیّل کے اِس قسم کی افتاد کا پھر اگلا قدم یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسا انسان اِس بات پر بھی شک کرنے لگ جاتا ہے۔ کہ خدا کی ذات ہے بھی یا نہیں چنانچہ اسی لئے مسٹر برٹرینڈ رسل Mr Bertrand Russell اپنی کتاب The History of Western Philosophy میں لکھتے ہیں:-

> "God might remain as a Creator but even that was doubtful, since it was not clear that the world had a beginning in time." (p.559).

(یعنی خدا کو خالق تو تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی تذبذب اس لئے ہے۔ کہ یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس دنیا کا کبھی آغاز بھی ہُوا تھا یا نہیں؟

اِن وجوہ کی بنا پر ایک ملاحدہ دہریہ فطین (intelligent) تو ہو سکتا ہے۔ لیکن دانا (wise) نہیں ہو سکتا!

لیکن اس کے برعکس ایک ایسا شخص جو صداقت و دیانت پر پابند ہونے کے علاوہ خدا کو بھی مانتا ہے۔ وہ "دانا" ہوگا۔ کیونکہ وہ اِس دُنیا میں بھی امن و امان چاہے گا۔ اور اگلی دُنیا میں بھی مسرور و شادمان ہوگا!

یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے: جب ایک انسان صرف صداقت و دیانت وغیرہ کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن خدا کو نہیں مانتا۔ تو اُس وقت اُس کی فطانت مادی ترقی کی طرف ہی مائل ہوتی ہے۔ چونکہ وہ رُوحانیت کا تو قائل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایک شخص کا صداقت و دیانت وغیرہ پر پابند ہونے کے علاوہ خدا پر بھی پختہ یقین ہوتا ہے۔ تو پھر وہ رُوحانیت کی طرف ترقی کرتا ہے۔ لیکن مادیّت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

اِسی وجہ سے، چونکہ مغرب کے لوگوں کا اِس زمانہ میں عام طور پر خدا پر ایمان نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو برائے نام۔ لہذا اُن کی فطانت نے مادی ترقی ہی کی۔ رُوحانیت کے لحاظ سے وہ بالکل "کورے" رہے۔ اسی لئے وہ ؎ زندگی، بے بندگی، شرمندگی! کے راز کو نہ سمجھ سکے۔

لیکن اس کے برعکس مشرق میں جن لوگوں نے صداقت و دیانت پر پابند ہونے کے علاوہ خدا پر بھی مضبوط ایمان رکھا وہ عرفان و وجدان کے مقام پر پہنچے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے کائنات کی "رُوحانی تسخیر" بھی کی! یہی لوگ پھر پیغمبر کہلاتے۔ اور رسولِ پاکؐ کی بعثت کے بعد اس قسم کے لوگ اب اولیائے کرام کہلاتے ہیں۔ اِسی لئے

Marfat.com

ان کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے :-

علمآء اُمتی کانبیآء بنی اسرائیل

یہاں سے جو نکتہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر آج کل کے زمانہ میں عقل ہمیں مٹی کے چراغ سے بجلی تک لے گئی ہے۔ تو پہلے زمانہ کے لوگ بھی جاہل مطلق نہ تھے۔ جیسا کہ عام طور پر اس وقت سمجھا جا رہا ہے :

اِس سلسلہ میں ہماری لاعلمی کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک انسانی ترقی کا تعلق ہے۔ ہمارا ذہن گذشتہ دو تین صدیوں سے زیادہ پیچھے نہیں جاتا : اسی لئے ہم اِس وقت یہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ پچھلے زمانہ کے لوگوں کی ترقی ایک طرف مٹی کے چراغ، چرخے اور بیل گاڑی تک محدود رہی۔ اور دوسری طرف بُت پرستی سے آگے نہیں بڑھ سکی ! یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اگر ہم دُنیا کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ تو صاف ہویدا ہوتا ہے۔ کہ گذشتہ زمانہ کے دانا دُنیا کے اس محیر العقول کارخانہ کو دیکھ کر جس نتیجہ پر پہنچے۔ وہ یہ تھا کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے ! کوئی ہے !

چنانچہ جب تک اُنہوں نے اُس ذات کا پتہ نہیں لگا لیا۔ جو اِس دُنیا کی خالق ہے۔ اُنہوں نے چین نہیں لیا ! اور جب وہ آخر کار فاطر السمٰوٰت والارض سے رُوشناس ہوئے۔ اور اُنہوں نے "خدا کی معرفت" حاصل کی۔ تو پھر اُنہوں نے کائنات کی "رُوحانی تسخیر" بھی کی ! یہی "دانائی" کی معراج ہے : اسی لئے مادی لحاظ سے اگر وہ مٹی کے چراغ یا بیل گاڑی سے آگے نہیں بڑھے۔ تو اُس کی وجہ یہ نہیں تھی۔ کہ وہ لوگ جاہل تھے۔ بلکہ اِس کا اصلی سبب یہ تھا۔ کہ وہ رُوحانی لحاظ سے اتنے ترقی یافتہ تھے۔ کہ اُنہوں نے چراغ یا بیل گاڑی سے آگے مادی ترقی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی : مثال کے طور پر جس شخص کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکل سکتی ہوں۔ اُس کو بجلی کی ضرورت کس طرح محسوس ہو سکتی ہے ؟ (دیکھو صفحہ ۱۲۴) : یا جس کا تخت ہوا میں اُڑ سکتا ہو۔ وہ ہوائی جہاز کی ضرورت کس طرح محسوس کر سکتا ہے ؟

سلیم الفطرت غیر مسلموں کی ذہنیت میں ترقی !

اب ایک اور مسئلہ جس پر ہمیں بہت کچھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ سلیم الفطرت غیر مسلموں کے بارہ میں ہے : اِس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ کہنا لازمی ہے۔ کہ سلیم الفطرت "غیر مسلموں" سے میری مُراد کس قسم کے لوگ ہیں ؟ یہ اِس لئے ضروری ہے۔ کہ مسلمانوں کے کانوں میں جب بھی "غیر مسلم" کے الفاظ پڑتے ہیں۔ تو اُن کے ذہن عام طور پر صرف اُن افراد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ جو اول تو خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر مانیں بھی۔ تو وہ اُس کے ساتھ بہتوں کو شریک بناتے ہیں۔ یا بُتوں کو پُوجتے ہیں : لیکن میری مُراد اِس قسم کے لوگوں سے ہرگز نہیں : میری مُراد ایسے غیر مسلموں سے ہے۔ جو جبلّی طور پر سلیم الفطرت ہیں۔ اور

Marfat.com

نہ صرف خدا کو ایک مانتے ہیں۔ بلکہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکوکار بھی ہیں،،

اس سلسلہ میں مَیں پہلے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ تاکہ جس قسم کے غیر مسلموں کے متعلق میرے نزدیک ہمیں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ذہن میں اُن کی ایک ہلکی سی تصویر آجاتے ؛

۱۹۶۲ء میں میرے ایک عزیز ڈاکٹری کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ گئے۔ اُنہیں وہاں ایک صاحب نارمن لوئیس ملے ؛ جن کو اسلام کی وحدانیت کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی۔ اُن کی اس بے پناہ دلچسپی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میرے عزیز نے اُن صاحب کو مشورہ دیا۔ کہ وہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔ چنانچہ اُن کا پہلا خط جو مجھے ملا ہے۔ اُس کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں ؛

جنابِ من۔ مجھے حال ہی میں آپ کے ایک عزیز سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُنہوں ہی نے مجھے آپ سے خط و کتابت کرنے کی رائے دی ہے ؛ مجھے اسلام کے ساتھ بہت گہری دلچسپی ہے ؛ میرا اسلام کے ساتھ شغف ایک تو اُس کی ابتدائی نوعیت کے لحاظ سے ہے۔ اور دوسرے اُس کی تاریخ کی وجہ سے جو میرے لئے بہت مسحور کُن ہے ؛ دراصل مجھے اسلام کی گذشتہ تاریخ سے اتنی دلچسپی نہیں ہے۔ جتنی کہ اُس کے مستقبل سے ہے ؛ میں یہ محسوس کرتا ہوں۔ کہ ایک نہ ایک دن اسلام دُنیا پر چھا کر رہے گا ؛ میرے نزدیک اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ چونکہ حقیقت میں خدا صرف ایک ہی ہے۔ لہٰذا جس قوم کا اُس سچے خدا پر ایمان ہوگا۔ اُسے اُس کی نصرت بھی ضرور حاصل ہو کر رہے گی ! سچ پوچھئے تو میں دراصل اس اُمید پر زندہ ہوں۔ کہ مجھے کبھی نہ کبھی زمین کے ایسے خطے میں رہنے کا شرف حاصل ہو۔ جہاں حقیقی خدا کی ہر وقت اور لگاتار پرستش ہو ؛ ایک انسان کے لئے اس سے بہتر کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے ؟ کہ وہ دن رات ایسے لوگوں کے ماحول میں رہے جو حقیقتاً صرف ایک خدا کے ہی پرستار ہوں !

"مجھے آپ سے جو سب سے اہم سوال کرنا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کیا لاہور اور مغربی پاکستان کے لوگ واقعی خدائے وحدہٗ لاشریک کے دل و جان سے شیدائی ہیں ؟ یا اُن میں سے زیادہ تر لوگوں کا ایمان ایسا کمزور ہے۔ جیسا کہ عیسائیت میں موجودہ عیسائیوں کا ——— یعنی بے حد کمزور !

"میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اس قسم کا سوال کچھ عجیب سا ہے۔ لیکن فطرتاً میری طبیعت کی اُفتاد ہی ایسی ہے۔ کہ میں صرف حقیقت کو ہی جاننا چاہتا ہوں ؛

Marfat.com

"مجھے یہ بھی لکھیں۔ کہ کیا مسلمانوں کا ایمان روز افزوں ترقی پر ہے؟ آپ کے عزیز کی گفتگو نے میری نظر میں آپ کے ملک کے وقار کو اور بڑھا دیا ہے!" وغیرہ۔ وغیرہ ؛

> اللہ تعالیٰ مومنین سے فرماتا ہے:
> وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭاِعْدِلُوْا ۣهُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭاِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝
> (یعنی تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر ابھارے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف ضرور کرو کیونکہ وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے کاموں کی خبر ہے)[1]

اب ہمیں اس سلسلہ میں جس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کے شخص کے متعلق اسلام کا فتویٰ کیا ہے؟

جہاں تک کہ ہمارے موجودہ علماء کا تعلق ہے۔ اُن کا فتویٰ یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کا رسالت پر ایمان نہیں وہ کافر ہیں۔ اور اس لئے جہنمی ہیں!

لیکن ہم نے جس نکتہ کی طرف ابھی تک کما حقہٗ توجہ نہیں دی وہ یہ ہے۔ کہ قرآن جن لوگوں کو کافر کہتا ہے۔ وہ عام طور پر وہ لوگ ہیں۔ جن پر مثال کے طور پر مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے:۔

ظالمین۔ مفسدین۔ متکبرین۔ کاذبین۔ فاسقین۔ جاہلین۔ مجرمین۔ وغیرہ۔ وغیرہ ؛

اب جہاں تک مندرجہ بالا شخص نارمن لوتیس کا تعلق ہے۔ اُس پر اوپر کے لفظوں میں سے کسی لفظ کا بھی **صحیح** طور پر اطلاق نہیں ہوتا ؛

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم نے اسلام کو مجموعی طور پر تو سمجھا ہے۔ لیکن اُس کی تعلیم کا تجزیہ نہیں کیا۔ جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا۔ کہ اُس کی کون سی تعلیم ایک انسان پر کیا اثر ڈالتی ہے؟

گذشتہ فصل میں "انسانی شعور" کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہاں اس فصل میں اسلام کی تعلیم کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے ؛

نہایت مختصر الفاظ میں اسلام کی تعلیم کو آسانی سے مندرجہ ذیل تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(الف) اخلاقِ حسنہ کی پابندی۔ یا نیک کرداری ؛ گویا سچ بولنا۔ دیانتدار ہونا۔ سخاوت کرنا۔ پاکباز ہونا۔ وغیرہ۔ وغیرہ ؛

---

[1] (سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۸)

(ب) توحید یعنی ایک وحدہٗ لاشریک خدا پر ایمان ؛

(ج) رسالت جس میں تمام پیغمبروں ۔ الہامی کتابوں اور خاص کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت اور روزِ جزا وغیرہ پر ایمان شامل ہیں ؛

اب جہاں تک شق (الف) یعنی اخلاقِ حسنہ کی پابندی کا تعلق ہے ۔ اِس بات کی ہر غیر مسلم سے توقع کی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ سچ بولے ۔ جھوٹ نہ بولے ؛ دیانت دار ہو ۔ بد دیانت نہ ہو ؛ یہ اِس لئے کہ نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے ۔ خواہ وہ مُسلم ہو یا غیر مُسلم ؛

اِسی طرح جہاں تک شق (ب) یعنی توحید کا تعلق ہے ۔ ہر غیر مُسلم سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ کم از کم یہ سمجھے ۔ کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی طاقت ضرور ہے ۔ جو کہ دُنیا کے کارخانہ کو ایک محیر العقول طریقہ سے چلا رہی ہے ؛

اب باقی رہی اسلام کی تعلیم کی تیسری شق (ج) یعنی رسالت ۔ اِس میں تمام رسولوں اور الہامی کتابوں پر ایمان ۔ فرشتوں اور روزِ جزا پر ایمان ۔ وغیرہ ۔ وغیرہ سب شامل ہیں ؛ جہاں تک اِس شق کا تعلق ہے ۔ اِس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا لازمی ہے ۔ کہ جس طرح پچھلی " انسانی شعُور " والی فصل میں واضح کیا گیا ہے اِس دُنیا میں علم کی دو قسمیں ہیں :۔

اوّل وہ علم جس کا ہر انسان کو فطرتاً پتہ ہوتا ہے ۔ (مثلاً سچ بولنا چاہیئے ۔ جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے ۔ وغیرہ ۔ وغیرہ) ۔ اور

دوم وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا ۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں ؛ (مثلاً ا ۔ ب ۔ ج یا ۱ ۔ ۲ ۔ ۳) ؛

اب جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے ۔ اِس کی شق (الف) یعنی اخلاقِ حسنہ کی پابندی ۔ اور شق (ب) یعنی توحید یہ تو علم کی اوّل قسم میں آتے ہیں ۔ چونکہ ان لی مبادیات کا ہر ایک کو از خود پتہ ہوتا ہے ۔ لہذا اِن کے متعلق تبلیغ کی چنداں ضرورت نہیں ؛ لیکن اسلام کی تعلیم کی شق (ج) یعنی رسالت علم کی دوسری قسم کے تحت آتی ہے ؛ گویا یہ حروفِ ابجد یا ہندسوں کی طرح ہے ۔ جن کی بابت ہر بچّے کو فرداً فرداً پڑھانا ہوتا ہے اور اِن کے پڑھائے بغیر کسی کو فیل نہیں کیا جا سکتا ؛ اسی طرح جہاں تک رسالت کا تعلق ہے ۔ اِس کی بابت جب تک تبلیغ نہیں ہو گی ۔ ہم کسی کو مورِدِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے ؛ اسی لئے ہم غیر مسلموں سے رسالت پر از خود ایمان لے آنے کی توقع ہی نہیں کر سکتے !

بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جب تک ہم علم کی مندرجہ بالا دو قسموں کو ہر وقت ذہن میں نہیں رکھیں گے۔ ہم اسلام کی تعلیمات کا صحیح طور پر تجزیہ نہیں کر سکتے ؛ اس کا ثبوت اب اس بات سے ملتا ہے۔ کہ اگر علم کی یہ دو قسمیں ہمارے سامنے ہوتیں۔ تو ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا۔ کہ کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ علم کی پہلی قسم کے تحت آتا ہے۔ لیکن اسی کلمہ کا دوسرا حصہ یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ علم کی دوسری قسم کے تحت آتا ہے۔

لہٰذا ہم اگر غیر مسلموں سے کچھ مواخذہ کر سکتے ہیں۔ تو صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے متعلق ہی کر سکتے ہیں۔ کلمہ طیبہ کے دوسرے ٹکڑے یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے بارہ میں ہم اُن سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ ہم اس کے بارے اُن کو بتائیں گے نہیں۔ یا صحیح تبلیغ نہیں کریں گے ؛

لیکن بدقسمتی سے ہم نے غیر مسلموں کے بارہ میں جتنے بھی فتوے دئے ہیں۔ ہم نے اُس وقت علم کی ان دو قسموں کو اپنے ذہن میں نہیں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہمارا اُن کے ساتھ رویہ کچھ اس طرح کا رہا ہے۔ جیسے کہ کسی آرٹس (Arts) کے طالب علم سے سائنس کے سوالوں کے صحیح جوابوں کی توقع کی جائے !

اس مثال سے بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ توحید اور رسالت میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ توحید کی مثال حساب کے مضمون کی طرح ہے۔ جس میں ہر طالب علم کو ضروری پاس ہونا پڑتا ہے۔ لیکن رسالت کی مثال ایک ٹیکنیکل مضمون (مثلاً سائنس) کی طرح ہے ؛ یعنی اگر طالب علم نے سائنس لی ہوئی ہے۔ پھر تو اُس سے اس مضمون کے سوال پوچھے جائیں گے۔ لیکن اگر اس نے سائنس نہیں لی ہوئی تو پھر نہ اُس سے اس مضمون کے سوال پوچھے جائیں گے۔ اور نہ اُسے اس مضمون میں فیل کیا جا سکتا ہے ؛[1]

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ توحید "دین" ہے۔ اور رسالت "شریعت" ؛ "دین" حضرت آدم سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ اور علم کی پہلی قسم کے تحت آتا ہے ؛ لیکن "شریعت" ہر پیغمبر کے زمانہ میں بدلتی رہی ہے۔ لہٰذا جب تک اُس کے متعلق تبلیغ نہ ہو۔ کسی سے اس پر ایمان کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ یہ علم کی دوسری قسم کے تحت

---

[1] ان الفاظ سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ خدا پر ایمان "لازمی" ہے۔ اور رسالت پر ایمان "اختیاری" ؛ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ رسالت چونکہ علم کی اُس قسم کے تحت آتی ہے۔ جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں۔ لہٰذا تبلیغ کے بغیر یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ کہ کوئی رسالت پر خود بخود ہی ایمان لے آئے ؛ اسی لئے صحیح تبلیغ کے بغیر رسالت کے بارہ میں کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ؛

Marfat.com

آتی ہے ؛ اِس مسئلہ کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ جب تک غیر مسلموں کو اسلام کی "شریعت" کی تبلیغ نہیں کی جائے گی۔ وہ اپنی اپنی "شریعتوں" کے مطابق عمل کرتے رہیں گے ؛ قرآن کی آیت کُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ[1] اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے ؛ آیت کے اِس ٹکڑے کے بعد قرآن میں جو الفاظ آتے ہیں۔ وہ بہت ہی معنی خیز ہیں۔ یعنی "وَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا"[2] یعنی چونکہ ایک غیر مسلم اسلام کی شریعت پر صرف اُسی وقت عمل کر سکتا ہے۔ جب کہ اُس کو صحیح طور پر تبلیغ ہو اور یہ بالکل ممکنات میں سے ہے۔ کہ ہر غیر مسلم کو تبلیغ نہ ہو سکے۔ (اور ایسی صورت میں وہ "عَلٰى شَاكِلَتِهٖ" عمل کرنے کے لئے مجبور رہے)۔ لہٰذا ان حالات میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کون کس راستہ پر چل رہا ہے؟ کیوں چل رہا ہے؟ اور وہ پھر ہدایت کی کس سطح پر ہے؟

اب چونکہ قرآن کی آیات کی بنیاد انہی نکات پر ہے۔ اور ہم میں سے اکثر نے ان نکات کی طرف کما حقہٗ توجہ ہی نہیں دی۔ لہٰذا ہم نے قرآن کی اُن آیات کی جن کا تعلق غیر مسلموں سے ہے۔ عام طور پر تفسیر درست نہیں کی ؛ (اس کی تفصیل بھی آگے آتے گی ؛)

ان وجوہ کی بنا پر ہمیں سب سے پہلے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ کہ کلمہ طیبہ کے اِس حصّہ کے بارہ میں ہمیں غیر مسلموں سے کس بات کی توقع کرنی چاہئے۔ اور پھر اُس کے بعد کلمہ طیبہ کے دوسرے حصّے یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے مقتضیات کو سمجھنا چاہیے ؛

آئیے اب پہلے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو لیں ؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم چونکہ لکیر کے فقیر ہیں۔ لہٰذا ہم اب تک یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ جو تین سو ساٹھ بُت کسی زمانہ میں کعبہ میں دھرے تھے۔ وہی اِس وقت تمام غیر مُسلم دُنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ گویا غیر مسلم دُنیا یا تو خدا کی منکر ہے۔ اور یا دوسروں کو اُسکے ساتھ شریک کرنے کی وجہ سے مشرک ہے۔ لہٰذا گذشتہ چودہ صدیوں میں غیر مسلموں نے کوئی رُوحانی ترقی نہیں کی ؛

اِس میں کچھ شک نہیں۔ کہ دُنیا اِس عرصہ میں بہت سی باتوں میں کافی پیچھے ہٹی ہے۔ لیکن بعض باتوں میں وہ آگے بھی بڑھی ہے۔ یہ اِس لئے کہ عام طور پر انسانوں کا فہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ صدق کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ آج کل کی تعلیم میں لاکھ نقص سہی۔ لیکن اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ وہ انسان کو معقولیت پسند بنا دیتی ہے ؛ اور یہ معقولیت پسندی ہی انسان کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ ہر معاملہ کو اُس کے اصلی رنگ میں دیکھے ؛

---

[1] ہر شخص اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے ؛ (سورۃ ۱۷ ابنی اسرآئیل۔ آیت ۸۴)

[2] اور تمہارا رب بہتر جانتا ہے۔ کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے؟ (ایضاً)

Marfat.com

مثال کے طور پر جنوبی ہند کے برہمن کو لے لیجئے ؛ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ اگر اُس پر شُودر کا سایہ بھی پڑ گیا۔ تو وہ بھرشٹ ہو جائے گا ؛ اُس کو لاکھ سمجھائیں۔ مگر اُس کی کھوپڑی میں یہ بات نہیں سماتی۔ کہ برہمن اور شُودر میں انسانیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ؛ (اس برہمن کو آسانی کے لئے سوہن کہ لیجئے) ؛

اب آپ اِس سوہن سے سر نہ کھپائیں۔ لیکن اُس کے لڑکے (موہن) کو آج کل کے کسی سکول اور کالج میں تعلیم دلوا دیں ؛ جب وہ بی۔ اے۔ یا ایم۔ اے۔ پاس کر لے گا۔ تو ۹۹ فی صدی اس امر کی توقع ہے۔ کہ وہ خود بخود کہنے لگ جاتے گا۔ کہ اُس کا باپ (سوہن) غلطی پر ہے۔ برہمن اور شُودر میں کوئی فرق نہیں ؛ اِس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ آج کل کی تعلیم ایک انسان کو کس حد تک معقولیت پسند بنا دیتی ہے ؛

اِس بات کے باوجود ہم میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سوہن اور موہن میں کوئی فرق نہیں کرتے ؛ اِس ذہنیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ کہ سوہن کے انداز سے نفرت ٹپکتی ہے۔ لیکن موہن کی طبیعت کی افتاد ہی دوسری ہے ؛ اُس کا ماحول ہی علیحدہ ہے ؛ اُس کی روش اُس کو ایک دوسرے راستہ پر لے جاتی ہے ؛ اِس افتاد۔ ماحول اور روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اِس قسم کے اکثر آدمی نیک کردار ہوتے ہیں ؛ اگر وہ سرکاری مُلازم ہیں۔ تو راشی نہیں ہوتے ؛ اور اگر اُن کی کوئی ڈیری فارم (Dairy Farm) ہے۔ تو وہ دُودھ میں پانی نہیں ملاتے ؛ اسلام کی تعلیم کی پہلی شق یہی ہے۔ کہ ایک انسان نیک کردار ہو ؛ یہی نیک کرداری ایک انسان کو روشنضمیر بناتی ہے ؛ اور یہ روشنضمیری پھر اُس کو اِس قسم کے رُجحان کی طرف لے جاتی ہے۔ کہ ڈیری فارم والا یہ سوچتا ہے۔ کہ وہ روز اپنی بھینسوں کو کھانے کے لئے چارا ڈالتا ہے۔ لیکن دوہتا ہے دُودھ! اِس میں راز کیا ہے ؟ اُس کے خیالات کی یہ اُفتاد اُس کو اِس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!! اور جو کوئی بھی ہے۔ وہ اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے! اسلام کی تعلیم کی دوسری شق یہی ہے۔ کہ انسان ایک ماوراء طاقت کو مانے! ایک بالاتر طاقت کو محسوس کرے!! خواہ اُس کا نام وہ کچھ بھی نہ رکھے!

یہی حالت سلیم الفطرت عیسائیوں کی ہے ؛ ہم خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ کوئی بستی۔ کوئی قریہ۔ کوئی قوم ایسی نہیں گذری۔ جس پر کسی نہ کسی وقت کوئی نبی نہ مبعوث ہوا ہو ؛ قرآن کے الفاظ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ[1] اِس کے لئے کافی سند ہیں ؛ اب ہمارا اعتراض یہ ہے۔ کہ عیسائی لوگ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں۔ لہذا وہ گمراہ ہیں ؛ یہاں تک میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن ایک بات جس کی طرف ہم نے کماحقہٗ توجہ نہیں دی۔ وہ یہ ہے۔ کہ اِس وقت کی دُنیا میں بہت سے عیسائی ایسے بھی ہیں۔ جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تصور نہیں کرتے! یہ اس وجہ سے کہ دُنیا اب مذہب کو مسجدوں۔ مندروں اور گرجاؤں میں جا کر نہیں سمجھتی۔ اور نہ وہ عالموں۔ پنڈتوں

---

[1] اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے ؛ (سورۃ ۱۳ الرعد۔ آیت ۷) ؛

Marfat.com

اور پادریوں کی محتاج ہے ۔ بلکہ سلیم الفطرت دنیا کا تخیل اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے ۔ کہ وہ از خود سوچتی ہے ۔ کہ اس محیر العقول دنیا کے پیچھے کوئی قوت والا ہاتھ ہے ۔ اور جونہی کوئی شخص اپنے دل میں دیانتداری کے ساتھ اس قسم کی بات محسوس کرتا ہے ۔ وہی توحید کی پہلی سیڑھی پر گویا کھڑا ہو گیا ۔ اور وہ "موحد" کہلانے کا حقدار ہے ! ہم نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا مطلب ہی نہیں سمجھا ۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ خدا کو ماننے کے لئے کسی کتاب کو پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ خواہ وہ الہامی ہو ۔ یا دوسری ۔ کیونکہ اگر ایک انسان ، کسی اُستاد کے پڑھائے بغیر یا بغیر کسی کتاب کے پڑھنے کے ، محض اپنی سمجھ بوجھ سے (جو ہر انسان کو عطا کی گئی ہے) خدا کو نہیں مان سکتا ۔ تو پھر کروڑوں اَن پڑھ انسان تو کہیں کے بھی نہ رہے ! حالانکہ حقیقت یہ ہے ۔ کہ آج کل کے زمانہ میں بہت سی اَن پڑھ دنیا کا خدا کے بارہ میں تصوّر پڑھی لکھی دنیا سے بہتر ہے ! یہ اس لئے کہ انسان کی بصیرت کا انحصار زباندانی یا صرف و نحو جاننے پر نہیں ہے ۔ بلکہ روشن ضمیری پر منحصر ہے ۔ اور روشن ضمیری کا راز اوّلاً صداقت اور دیانتداری کی زندگی گذارنے میں ہے ۔ اور نابینا اس دنیا کے پیچھے کسی ماورا طاقت کا احساس کرتے ہیں ! اور یہ ظاہر ہے ۔ کہ یہ دونو باتیں ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان میں بھی ممکن ہو سکتی ہیں ۔ خواہ وہ مُسلم ہو ۔ یا غیر مُسلم ۔ عرب کا باشندہ ہو یا امریکہ کا !

انہی وجوہ کی بنا پر ایک عرصہ ہوا ۔ ایک سلیم الفطرت عیسائی نے خدا کی وحدانیت کے بارہ میں ایسی تحقیق کی ہے ۔ کہ اُس کی اس کاوش کی داد دینی پڑتی ہے ۔

غالباً پچاس سال سے اُوپر کا ذکر ہے ۔ میری نظر سے ایک عیسائی مصنّف کی ایک کتاب کا اشتہار گزرا جس میں لکھا تھا :-

> "Most churches teach that three persons unite in a trinity to make one God and that the three are co-equal and co-eternal. Unable to explain it, they call it a mystery. But history calls it a pagan myth that started in Babylon and spread from there all over the earth and to many religions................ The only Bible support for it is............... Bible's text at 1, John 5 : 7 saying God and Christ and the Holy Ghost are one, but this text is found in no reliable Bible manuscript, and most modern Bibles leave

Marfat.com

it out. Trinity's only foundation is a pagan foundation.

God and Christ are not co-equal............They are not co-eternal. God is without beginning. Christ had a birth and beginning............"

(یعنی" عیسائیت عام طور پر یہ سکھاتی ہے۔ کہ تثلیث میں تین ہستیاں مل کر ایک خدا بناتی ہیں۔ اور یہ تینوں برابر ہیں۔ اور ازلی ہیں: چونکہ اس کُلیہ کو معقولیت سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اس معمہ کو "راز کی بات" کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے: لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے۔ کہ یہ معمہ کوئی "راز" نہیں۔ بلکہ یونہی "اٹکل پچو" بات ہے۔ جو بابیلون میں شروع ہوئی۔ اور دُنیا میں عیسائیت کے اکثر فرقوں میں پھیل گئی: .... انجیل میں اس کے متعلق صرف ایک ہی آیت ہے۔ (دیکھو ا۔ یوحنا ۵ : ۷)۔ جو یہ کہتی ہے۔ کہ "خدا اور عیسیٰؑ اور روح القدس ایک ہی ہستی ہیں": لیکن یہ آیت کسی مستند[1] انجیل کے مسوّدہ میں نہیں ملتی: اور نئی انجیلوں میں یہ آیت حذف کی جا رہی ہے۔ کیونکہ تثلیث کی بُنیاد کفر کی بنا پر مبنی ہے:

خدا اور عیسیٰؑ برابر نہیں ہیں۔ اور نہ ایک جیسے قدیمی۔ کیونکہ خدا ازلی ہے۔ یعنی اُس کا "شروع" کوئی نہیں۔ لیکن عیسیٰؑ کی پیدائش ہے۔ لہٰذا اس کا "شروع" ہے!")

اب کیا یہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تعلیم نہیں ہے؟ اور کیا مندرجہ بالا کتاب کے مصنف نے اِس توحید کو کسی اسلامی ملک کے علماء سے سیکھا ہے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ قدرت نے یہ بات ہر شخص میں (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ودیعت کی ہوئی ہے۔ کہ اگر وہ ذرا بھی ہوشمندی سے کام لے گا۔ تو وہ لامحالہ اسلام کی دو باتوں کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچے گا: ایک اخلاقِ حسنہ کے متعلق یعنی صداقت اور دیانت ایک انسان کا شعار ہونا چاہیئے۔ اور دوسرے یہ کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!!

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمارا تمام زور اِس بات پر ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کا

---

[1] اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اِس کتاب کے مصنف نے کس قدر کاوش سے کام لیا ہے: یہ ظاہر ہے۔ کہ انجیل کے مستند مسودے دُور دراز ملکوں میں ہوں گے۔ گویا مصنف نے پہلے اِن تمام دُور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ اور پھر وہاں تمام مستند مسودوں کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا۔ اور اِن سب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ آخر اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ تثلیث والی آیت کسی بھی مستند مسودہ میں موجود نہیں!

Marfat.com

خدا کے متعلق تصوّر درست ہو۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ جس ذات کے متعلق ہم اتنا زور دیتے ہیں کہ اُس کے متعلق تصوّر درست ہونا چاہئے۔ وہ ہے کس قسم کی؟ اس کے متعلق ایک شاعر نے کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم!

اب جو ذات ایک انسان کے خیال۔ قیاس۔ گمان اور وہم سے بالاتر ہو۔ اُس کے متعلق ایک عیسائی (ہم اُس کا نام البرٹ رکھ لیتے ہیں) تثلیث کا عقیدہ رکھے۔ اور ایک دوسرا عیسائی (اُس کا نام سمتھ رکھ لیجئے) وہ عقیدہ رکھے۔ جو اوپر کے انگریزی اقتباس میں درج ہے۔ تو کیا یہ دونوں ایک جیسے ہی ہیں؟ اگر ہم ایسا کہیں گے۔ تو یہ ہماری کوتاہ فہمی کی دلیل ہوگی۔ عقلمندی کی نہیں! جو غیر مسلم خدا کی وحدانیت کو فطرتاً سمجھے۔ اُس کے لئے دوہری شاباش ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے تو اُس کی وحدانیت کو اسلامی ماحول اور قرآن سے سیکھا۔ لیکن سمتھ جیسے غیر مسلموں نے توحید کی ایسے حالات میں شہادت دی۔ جب کہ اُن کا ماحول تثلیث سے لبریز تھا۔ اور جو الہامی کتاب اُن کے پاس موجود تھی۔ وہ بھی تثلیث ہی کی تائید کرتی تھی! لہٰذا البرٹ اور سمتھ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ البرٹ جو تثلیث کا قائل ہے۔ وہ تو بدیہی طور پر گمراہ ہے۔ لیکن سمتھ جس نے تثلیث کا ردّ کر کے توحید کے ثبوت میں کتاب لکھی ہے۔ وہ "موحّد" کہلانے کا حقدار ہے۔

اِس سلسلہ میں ہمارے علماء کا کہنا یہ ہے۔ کہ چونکہ سمتھ کا رسالت پہ ایمان نہیں لہٰذا وہ کافر ہے۔

اِس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ہمیں کلمہ طیبہ کے دوسرے ٹکڑے یعنی مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ کے مقتضیات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے۔ کہ کلمہ طیبہ کا یہ ٹکڑا علم کی اُس قسم کے تحت آتا ہے۔ جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں۔

لہٰذا ایک غیر مسلم سے اس بات کی توقع تو کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اخلاقِ حسنہ کا پابند ہو۔ اور ایک خدا کا ماننے والا ہو۔ لیکن اُس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ کہ وہ خود بخود اِس بات کو بھی سمجھے۔ کہ اس دنیا میں موسیٰ عیسیٰ اور محمدؐ کے نام کے پیغمبر ضرور ہونے چاہئیں۔ یا توریت انجیل اور قرآن کے نام کی الہامی کتابیں ضرور ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ان اُمور کی بابت ایک انسان کو کسی دوسرے کے بتائے بغیر علم ہو ہی نہیں سکتا۔

اب ہمیں جس بات سے اُلجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر وہ غیر مُسلم (جو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اور نیک کردار بھی ہیں۔ لیکن جن کو رسالت کی صحیح طور پہ تبلیغ نہیں ہوئی)۔ "موحّد" کہلا سکتے ہیں۔ اور اُن کی نجات

بھی ہو سکتی ہے۔ تو پھر ان کو اسلام لانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں تک کہ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی!

یہ وہ سوال ہے۔ جس کا عام طور پر موجودہ علماء سے جواب بن نہیں پڑا۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ عام طور پر ہمارے علماء نے اپنے سامنے مقصد صرف جنّت اور جہنم کو رکھا۔ لیکن اس دُنیاوی زندگی میں جو حقیقی مقصدِ حیات ہے یعنی "خدا کی معرفت" اُس کو نظر انداز کر دیا ہے[1]

انسانیت کو رسالت کی ضرورت اِس لئے ہے۔ کہ اگرچہ ایک انسان خدا کو واحد مان سکتا ہے۔ اور نیک کردار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک ذی فہم۔ ہوشمند اور سلیم الفطرت انسان کی اِس دُنیاوی زندگی میں انتہائی خواہش۔ انتہائی ضرورت اور انتہائی تڑپ یہ ہوتی ہے۔ کہ اُس کا اپنے خالق کے ساتھ واسطہ ہو۔ رابطہ ہو۔ تعلق ہو۔ جوڑ ہو! اِس کی معرفت اُس کو حاصل ہو! اُس کا عرفان اُس کو میسّر ہو! اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کا راز ہی صرف اس بات میں مضمر ہے۔ کہ اس کی اتباع ایک انسان کو اُس کے خالق کے ساتھ جوڑ دیتی ہے! اُس کو "خدارسیدہ" کر دیتی ہے! اور یہ ایک انسان کے لئے ایسا اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔ کہ اِس سے اعلیٰ وارفع کوئی مرتبہ ہو ہی نہیں سکتا!

لہٰذا رسالت پر ایمان اِس اور صرف اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ محض نجات حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ جیسا کہ اِس وقت سمجھا جا رہا ہے:

اِسی لئے جہاں تک نجات کا تعلق ہے۔ قرآن نے اوّل توحید اور دوم نیک کرداری کو ہی لازم قرار دیا ہے: اِسی لئے ارشاد ہوتا ہے:-

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۃ ۴۶ الاحقاف - آیت ۱۳)

(یعنی بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا۔ کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اِس بات پر قائم رہے۔ تو اُن کو قطعاً کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے!)

(۲) مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ

---

[1] اِس ملک کے علماء میں سے غالباً صرف مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہیں۔ جنہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ صالح غیر مسلموں کی نجات ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔ کہ پھر ایسی صورت میں ہم اِس امر کو لابدی کیوں سمجھتے ہیں کہ تمام غیر مسلم اسلام ضرور لائیں؟ اِس سوال کا جواب اب متن میں دیکھیں:

Marfat.com

عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (سورۃ البقر۲ - آیت ۱۱۲) :-

(یعنی جو اپنی جبین نیاز کو اللہ کے سامنے جھکا دے۔ اور نیکوکار بھی ہو۔ اُس کے رب کے ہاں اس کے لئے اجر ہے۔ اور اُن کو آیندہ نہ خوف ہوگا۔ نہ حُزن و ملال!)

یہ ظاہر ہے۔ کہ ان آیات میں نہ انبیاء پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اور نہ الہامی کتابوں یا فرشتوں پر ایمان لانے کی شرط ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو لوگ ایک خدا کے پرستار ہیں۔ اور نیک کردار بھی ہیں۔ اُن کے لئے قرآن نے لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ کے الفاظ استعمال کرکے اُن کو نجات کی خوشخبری دی ہے :- یہ اس لئے کہ جہاں تک خدا پر ایمان اور نیک کرداری کا تعلق ہے۔ ان دونوں کے بارہ میں ایک انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ از خود خدا کو بھی مانے اور صالح بھی ہو :- لیکن جہاں تک انبیاء یا الہامی کتابوں پر ایمان کا تعلق ہے۔ اس کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ ایک انسان کو ان باتوں کی صحیح طور پر تبلیغ ہو۔ جب تک ان باتوں کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ کسی سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کہ وہ ان پر خود بخود ہی ایمان لے آئے گا :-

اب چونکہ دُنیا میں لاکھوں اور کروڑوں ایسے انسان ہیں۔ جن کو قرآن یا رسالت کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ (اور یہ صدیوں سے نہیں ہو رہی)۔ اُن کی نجات کے لئے قرآن کی مندرجہ بالا آیات ایک بیّن سند ہیں۔ صرف اس شرط پر کہ اوّل اُن کا ایک خدا پر ایمان ہو۔ اور دوم وہ صالح ہوں :-

لیکن بد قسمتی سے عام طور پر ہمارے علماء نے قرآن میں اس قسم کی آیات میں جو راز ہے اُس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی :-

ان آیات میں راز یہ ہے۔ کہ اسلام کی رُو سے چونکہ :-

(۱) انسان کا مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" ہے۔ محض "خدا کو ماننا" نہیں۔ اور اس "معرفت" کی صحیح تبلیغ کا کام صرف وہ علماء ہی کر سکتے ہیں۔ جو کَاَنۡبِیَآءِ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ہوں۔ (جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ صحیح تبلیغ کے اہل صرف اولیائے کرام ہی ہیں[1])

(۲) قدرت کو معلوم تھا۔ کہ اس قسم کے علماء (یعنی اسلام کے "درخشندہ ستاروں[2]") نے حضور کے وصال کے بعد صرف تیس سال تک "رونقِ محفل" رہنا ہے۔ اور اس کے بعد "خلافتِ راشدہ" پیچھے ہٹ جائے گی۔ اور ملوکیت آگے بڑھ جائے گی۔ اور تقریباً چودہ سو سال

---

[1] ہم نے اس نہایت لازمی نکتہ کو اس پہلو سے دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی!

[2] صحابہ کرام

Marfat.com

تک دُنیا" طائرانِ حرم" کی دید سے محروم رہے گی[1]۔ اور

(۳) اِس عرصہ میں غیر مسلم اقوام کو "ابلاغِ مبین" نہیں ہو سکے گی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اتنی طویل مدت کے لئے صالح غیر مسلموں کو بغیر اُن کے کسی قصور کے جہنّم کی آگ میں نہیں جھونکا جا سکتا تھا۔

لہذا قرآن کی مندرجہ بالا قسم کی آیتیں اِس کمی کو پورا کرنے کے لئے نازل فرمائی گئیں!

لیکن انسان کا "عدو" مبین" جو نکہ نہایت "کایاں[3]" ہے۔ اُس نے جس طرح حضوؐر کے زمانہ کے یہودی علماء کو سبق یہ پڑھایا۔ کہ وہ اپنی الہامی کتاب کے اُن الفاظ پر جس میں نبی آخر الزماںؐ کی آمد کی بشارت ہے۔ اُنگلی رکھ لیا کریں۔ اُسی طرح چودھویں صدی کے مسلمان علماکو وہ اِس طرف لے گیا۔ کہ جس طرح یہود یہ کہتے تھے۔ کہ تمام نصرانی بے دین ہیں۔ اور نصرانی یہ کہتے تھے کہ تمام یہود بے دین ہیں۔ اُسی طرح ہمارے علماء تمام یہود و نصریٰ کو بے دین کہیں ؛ قرآن نے اس قسم کی ذہنیت کے لوگوں کے لئے كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[4] کے الفاظ استعمال کئے ہیں! یہ اِس لئے کہ اِس قسم کی باتیں صرف وہی لوگ کہتے ہیں۔ جن کو اوّل تو اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا۔ کہ صحیح تبلیغ کرنے کے اہل کس قسم کے اعلیٰ پایہ کے لوگ ضروری ہیں۔ اور دوسرے وہ "دین" اور "شریعت" میں تمیز نہیں کر سکتے ؛ لہذا یہاں پہلے "دین" اور "شریعت" کے فرق کو سمجھنا لازمی ہے ؛

"دین" سے مُراد توحید اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی ہے ؛ توحید کی بابت صحیح تخیّل اور اخلاقِ حسنہ کے تمام احکام حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی رہے ہیں ؛ اسی لئے "حضرت موسیٰؑ کے دین" "حضرت عیسیٰؑ کے دین" اور "حضرت محمدؐ کے دین" میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ؛ (البتہ ان "ادیان" کے "ارتقاء" میں فرق ضرور ہے۔ جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا) ؛

"شریعت" سے مراد ہر زمانہ کے اپنے اپنے عبادت کے طریقے اور احکام ہیں ؛ یہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں مختلف رہے ہیں ؛

لہذا جہاں تک توحید کے تخیّل اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے۔ ان میں حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک سرِ مُو فرق

---

[1] اولیائے کرام ؛

[2] سوائے چند ایک اولیائے کرام کے جو تبع تابعین تک "سرکاری" طور پر نہیں۔ بلکہ "غیر سرکاری" طور پر دنیا کو مستفیض فرماتے رہے بہ مثال کے طور پر حضرت داتا گنج بخشؒ یا حضرت معین الدین چشتیؒ وغیرہما اسی استثنا میں آتے ہیں!

[3] چالاک ؛

[4] یعنی اس طرح صرف وہ لوگ ہی کہتے ہیں۔ جو بے علم ہیں ؛ (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۱۱۳) ؛

Marfat.com

نہیں آیا۔ فرق صرف "شریعت" کے احکام میں آیا ہے: مثال کے طور پر اگر ایک پیغمبر کی "شریعت" میں یہ حکم تھا۔ کہ لوگ ایک دن روزہ رکھیں۔ اور دوسرے دن افطار کریں۔ تو دوسرے پیغمبر کی "شریعت" میں ہر مہینہ میں صرف تین روزے رکھنے کا حکم تھا: اِسی طرح ایک دن میں نمازوں کی تعداد میں بھی فرق ہوتا رہا ہے: اس کا مطلب یہ ہے۔ ہر "شریعت" میں نہ صرف پیغمبر مختلف ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ الہامی کتابیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں۔ اور عبادت کے طریقے بھی مختلف ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک توحید کے صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے۔ یہ ہمیشہ سے جُوں کے توں قائم ہیں: بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ موجودہ اسلام کا $\frac{2}{3}$ حصّہ (یعنی توحید کا صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی) حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ لیکن $\frac{1}{3}$ حصّہ (یعنی شریعتِ محمدیؐ) مختلف ہے: اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ جو صالح غیر مسلم اسلام کے $\frac{2}{3}$ حصّہ کے دل و جان سے پابند ہیں۔ وہ اسلام کے "دین" پر تو ہیں۔ لیکن اسلام کی "شریعت" پر نہیں ہیں: اسلام کی "شریعت" کے پیرو وہ اُس وقت ہی ہو سکتے ہیں۔ جب اُنہیں صحیح طور پر تبلیغ ہوگی۔ اور جب تک اس قسم کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ معذور ہیں:

ایک اور اہم بات جس کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہو سکی۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اس معاملہ کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی: ایک شخص جو اپنے مذہب پر صحیح طور پر چل رہا ہے۔ وہ اُسے چھوڑنے کو تب ہی تیار ہو سکتا ہے۔ جب کہ دوسرے مذہب میں اُسے زمین و آسمان کا کوئی فرق معلوم ہو: اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو حقیقی فرق ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ دوسرے مذاہب والے گو خدا کو ایک بھی مان سکتے ہیں۔ اور صالح بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ خدا رسیدہ نہیں ہو سکتے۔ گویا وہ خدا کا اتنا قُرب حاصل نہیں کر سکتے۔ جتنا کہ اولیائے کرام قُرب حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سُنّت پر عمل کرنے سے ایک انسان جتنا خدا کا قُرب حاصل کر سکتا ہے۔ اور کسی طریقہ سے حاصل نہیں کر سکتا!

اب اس طرح امتیاز کی حقیقت چونکہ صرف اولیائے کرام ہی واضح کر سکتے ہیں۔ جو اِس وقت دُنیا میں روپوش ہیں۔ لہٰذا کسی دوسرے مسلمان سے یہ کام باحسن وجوہ سر انجام نہیں پا سکتا: اس امر کا ثبوت اس بات سے بھی مل سکتا ہے۔ کہ اِس وقت مسلمانوں کے جتنے بھی فرقے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا وہ کسی غیر مذہب والے شخص پر کس طرح اپنا اثر ڈال سکتے ہیں؟

Marfat.com

اِس سلسلہ میں ہماری دوسری اُلجھن یہ رہی ہے۔ کہ اگر صالح غیر مسلموں کو نجات کا حقدار سمجھ لیا جائے۔ تو پھر ایک مُسلم اور غیر مسلم میں فرق ہی کیا ہوا؟ اِس قسم کی غلط فہمی پھر اس بات کا ثبوت مُہیا کرتی ہے۔ کہ ہم نے انسان کے حقیقی مقصدِ حیات کو اپنے سامنے نہیں رکھا!

اسلام کے نزدیک چونکہ مقصدِ حیات محض خدا کو "ماننا" نہیں۔ بلکہ خدا تک "پہنچنا" ہے۔ لہٰذا جو لوگ رسالت پر ایمان لاکر اور حضورؐ کی سُنّت پر عمل پیرا ہوکر خدا کی "معرفت" حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اِس دُنیا میں اور آخرت میں خُدا کا "قرب" حاصل کرتے ہیں؛ لیکن جو غیر مسلم (تبلیغ کے نہ ہونے کی وجہ سے) ابھی تک اسلام نہیں لائے۔ لیکن وہ صالح ہیں (یعنی ایک خدا کو ماننے والے ہیں۔ اور نیکوکار بھی ہیں)۔ وہ آخرت میں "نجات" تو حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا کا "قُرب" حاصل نہیں کر سکتے؛ "قُربِ الٰہی" اور "نجات" میں فرق کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے ایک جلسہ میں خواص تو کُرسیوں اور صوفوں پر بیٹھے ہوں۔ اور عوام دریوں پر بیٹھے ہوں!

غرض جو لوگ:۔

(۱) "خدا کی معرفت"۔ اور

(۲) محض "اِتقا"

کے مدارج میں فرق نہیں کر سکے۔ وہ جنّت میں جو مختلف درجے ہیں۔ اُن سے بھی ناآشنا رہے ہیں؛ جو لوگ صرف "نجات" کے مستحق ہیں۔ اُن کے حصّہ میں جنّت کی سب سے نچلی منزل آئیگی۔ لیکن جن کو اس دُنیا میں "قُربِ الٰہی" نصیب ہوتا ہے۔ اُن کیلئے "جنّت العلیّین" مخصوص ہے؛

اِس مسئلہ کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن کے الفاظ "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ" (سورۃ ۲ البقرہ آیت ۶) سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ "کافر" دراصل صرف وہ لوگ ہیں۔ جو باوجود رسولوں وغیرہ کے ڈرانے کے کبھی بھی ایمان نہیں لاتے؛ لہٰذا جو لوگ زُود یا بدیر ایمان لے آئیں۔ اُن پر "کافر" کے لفظ کے اطلاق کے لئے بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے؛ اس لئے ہمیں ہر وقت اِس بات کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ جس طرح ایک انسان کے ہاتھ کی اُنگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ اُسی طرح سب انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے؛

گویا جس طرح اچھوں میں بعض بُرے بھی ہوتے ہیں۔ اُسی طرح بُروں میں اچھے بھی ہو سکتے ہیں؛

بالفاظِ دیگر اِس کا مطلب یہ ہے۔ کہ غیر مسلموں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ جن میں جوہرِ قابل"

Marfat.com

موجود ہے ؛ لیکن چونکہ صرف "عارفین" ہی اس "جوہرِ قابل" کو پہچان سکتے ہیں۔ لہٰذا صاحبِ بصیرت حضرات کا یہ فرض ہے کہ وہ نہایت احتیاط سے کام لیں۔ اور سب غیر مسلموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکیں!

اِس سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت نہایت معنی خیز ہے۔ جسمیں ارشاد ہوتا ہے :-

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـٴُـھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ (سورۃ ۲ البقرہ آیت ۲۵۷)

(یعنی کافروں کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نُور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں) ؛

اس آیت میں کافروں کے بارہ میں "یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ" کے الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ کیونکہ جو نُور سے اندھیروں کی طرف نکالے جائیں۔ اُن میں کچھ "نُور" تو ضرور ہوتا ہی ہے۔ جس میں سے وہ نکالے جاتے ہیں ؛ یہ نُور "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے جواب میں "بَلٰی" والا نُور ہے۔ گویا "نُورِ میثاقی" ؛ بالفاظِ دیگر صحیح صورت یہ ہوئی۔ "نُورِ میثاق" سب انسانوں میں موجود ہے۔ خواہ وہ مُسلم ہوں یا غیر مُسلم۔ البتہ جن غیر مسلموں کو شیطان اِس "نُورِ میثاق" سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ وہ تو کافر ہو جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے صالح رہتے ہیں۔ لہٰذا "صالح غیر مسلموں" پر کافر کے لفظ کا اطلاق درست نہیں۔ اس لئے ہمیں اس سلسلہ میں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے جو اس وقت تقریباً مفقود ہے ؛

اسی بے احتیاطی کی وجہ سے آجکل کے بعض علماء نے قرآن کی اُن آیات کے بارہ میں جن کا تعلق سلیم الفطرت غیر مسلموں سے ہے۔ ایسی توجیہیں کی ہیں۔ کہ قرآن کے الفاظ اُن توجیہوں کے متحمل نہیں ہو سکتے!

مثال کے طور پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت لے لیں :-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصَّابِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۶۲) ؛

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔ (دیکھو حمائل عکسی "القرآن الحکیم" مع ترجمہ و تفسیر) :

"یہ حقیقی بات ہے۔ کہ مسلمان یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین۔ ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر۔ اور کارگذاری اچھی کرے۔ ایسوں کے لئے اُنکے کا حق الخدمت بھی ہے۔ اُن کے پروردگار کے پاس اور وہاں جا کر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں۔ اُن پر۔ اور نہ وہ مغموم ہوں گے" ؛

اب یہ ترجمہ سو فیصدی دُرست ہے۔ لیکن جب وہ اسی آیت کی تفسیر فرماتے ہیں۔ تو حمائل کے حاشیہ پر یوں رقمطراز ہیں :-

"مطلب یہ ہوا۔ کہ جو مسلمان ہو جائے گا۔ وہ مستحقِ نجاتِ اُخروی ہوگا" ؛

گویا مولانا نے اِس قرآنی آیت سے جو مُراد لی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو غیر مسلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر مسلمان ہو جائے گا۔ وہ نجات کا مستحق ہوگا! یہ ظاہر ہے۔ کہ قرآنی آیت کے الفاظ اس تفسیر کے ہرگز متحمل

Marfat.com

نہیں ہو سکتے!

مولانا کی اِس سلسلہ میں غلط فہمی کی ایک وجہ مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر کے وقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى

(سورۃ ۵ مائدہ۔ آیت ۸۲)؛

اور ان مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر اُن لوگوں کو پاتے گا۔ جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں؛)

ان الفاظ کی تفسیر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ آیت تمام ازمنہ اور امکنہ کے نصاریٰ کے باب میں نہیں ہے؛"

اس کی وجہ وہ اپنے رسالہ "توحید الحق" کے صفحہ ۲۶ پر یہ لکھتے ہیں۔ کہ سورۃ مائدہ والی آیت میں "لَتَجِدَنَّ" کے معنی ہیں۔ "آپ پاویں گے"؛ اور یہ الفاظ حضورؐ کو فرماتے گئے ہیں۔ "اور حضورؐ اُنہیں کو پائیں گے۔ جو حضورؐ کے عہدِ مبارک میں تھے۔ ہر جگہ اور ہر زمانہ کے عیسائیوں کو عام نہیں"؛

مولانا کے ان الفاظ ("حضورؐ اُنہیں کو پائیں گے۔ جو حضورؐ کے عہدِ مبارک میں تھے۔") سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا نے اِس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ بخاری شریف میں ایک حدیث ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

عُرِضَتْ عَلَیَّ اَعْمَالُکُمْ[1] صَبَاحًا وَّمَسَاءً فَاَنَا اَنْظُرُ اِلَیْهَا فَمَا وَجَدْتُّ مَحَاسِنَکُمْ اَفْرَحُ بِهَا وَمَا وَجَدْتُّ غَیْرَ ذَالِکَ اَیْئَسُ مِنْهَا؛

(یعنی میرے سامنے ہر صبح و شام تمہارے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کو میں دیکھتا ہوں۔ پس جب میں تمہاری خوبیاں دیکھتا ہوں۔ تو خوش ہوتا ہوں۔ لیکن جب تمہارے عیوب دیکھتا ہوں۔ تو اُن سے بیزار ہو جاتا ہوں)؛

نہایت سادہ الفاظ میں اِس حدیث کا مطلب یہ ہے۔ کہ حضورؐ کے پاس جب یہ خبر پہنچتی ہے۔ کہ سوہن[2] بیوی صدی

---

[1] یہاں شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو۔ کہ "اَعْمَالُکُمْ" سے مُراد مسلمانوں کے اعمال ہیں۔ نہ کہ تمام دُنیا کے لوگوں کے؛ جن لوگوں کے دل میں ایسا شبہ ہے۔ اُنہوں نے "رحمۃ للعلمین" کی حقیقت کو ہی نہیں سمجھا؛ حضورؐ کائنات کی تمام مخلوق کی طرف رسُول بنا کر بھیجے گئے ہیں جس میں سب خلق شامل ہے۔ خواہ وہ بشر ہوں۔ جنّ ہوں یا فرشتے؛

[2] دیکھیں صفحہ ۱۵۶؛

Marfat.com

میں بھی ایسا غبی ہے۔ کہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے۔ کہ شُودر کے ساتھ سے اُس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ تو اُس سے آپ بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب حضورؐ کو موہنؔ کے بارہ میں یہ اطلاع پہنچتی ہے۔ کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کا پیرو ہے۔ یعنی وہ سورج کو تو خدا نہیں سمجھتا۔ بلکہ سورج کے خالق کو خدا سمجھتا ہے۔ یا وہ پیپل کے درخت کو تو نہیں پُوجتا۔ بلکہ اُس درخت کے اُگانے والا کا مدّاح ہے۔ تو حضورؐ خوشی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور اُس کی شفاعت فرماتے ہیں!

بالکل اسی طرح جب حضورؐ کو البرٹؔ کے متعلق اطلاع ملتی ہے۔ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے۔ تو آپؐ بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب آپؐ کو سمتھؔ کے متعلق خبر پہنچتی ہے۔ کہ تثلیث والے ماحول کے باوجود اُس نے خدا کے واحد ہونے کے ثبوت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ تو حضورؐ خوشی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور اُس کی شفاعت فرماتے ہیں!

غرض مندرجہ بالا حدیث کے ہوتے ہوتے۔ یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ آیت مذکرہ "اُنہیں عیسائیوں کے ساتھ خاص ہوئی۔ جو حضورؐ کے زمانہ مبارک میں تھے"۔ جو لوگ حضورؐ کے زمانہ مبارک کے بعد ہوتے۔ اُن کا حشر کیا ہو گا؟ اس سوال کے جواب کی طرف ہی تو مندرجہ بالا حدیث ہماری رہبری کرتی ہے! غرض مولانا نے "توحید الحق" رسالہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ غالباً مندرجہ بالا حدیث کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے لکھا ہے۔

اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا استدلال یہ ہے۔ کہ خدا کو محض "ایک کہنا" یا "رسماً ماننا" خدا کے نہ ماننے کے برابر ہے۔ یہاں ہم نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ایک بات کا خیال نہیں رکھتے۔ ہم مسلمان جب خدا کو ایک کہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی بتایا۔ سکول میں ہمیں یہی پڑھایا گیا۔ اور ہمارا تمام ماحول اسی قسم کا عقیدہ رکھتا ہے۔ لیکن جب ایک ایسا غیر مسلم خدا کی توحید کا قائل ہو۔ جس کا ماحول بُتوں کو پُوجتا ہے۔ یا جس کے ماحول میں تثلیث کا چرچا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارے میں یہ ماننا پڑے گا۔ کہ وہ توحید کی گواہی لسانًا نہیں

---

[1] دیکھیں صفحہ ۱۵۶

[2] " " " ۱۵۹

[3] " " " ۱۵۹

Marfat.com

دے رہا۔ بلکہ قلبی طور پر دے رہا ہے اور جو شخص توحید کی قلبی گواہی دے۔ اُس کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے۔

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃ

اس سلسلہ میں ایک اور چھوٹی سی مثال بھی کافی سبق آموز ہے :۔ میری ملازمت کے دوران میرا ایک ہمعصر انگریز انجنیئر تھا۔ جو دو ڈھائی ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا :۔ دورانِ گفتگو میں نے اُس سے ایک دن پوچھا۔ کہ کیا وہ خدا کو مانتا ہے؟ وہ چند لمحے خاموش رہا! اور پھر کہنے لگا۔ کہ بات یہ ہے۔ کہ اتنی بڑی زمین۔ اتنا بڑا آسمان۔ اور اس زمین و آسمان کے اتنے بڑے نظام کو دیکھنے کے بعد ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ اس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی طاقت ہے!

جب ایک غیر مسلم توحید کی ان حدوں کو چھو لیتا ہے تو پھر اُس سے جو زیادہ سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ وہ اُس ذات کے بارہ میں جس کی بابت اُسے احساس ہے۔ کہ وہ ضرور کار فرما ہے۔ اُس کی یکتائی کو مانے اور اخلاقی طور پر نیک کردار ہو :۔

اب ایسے شخص سے اِس بات کی توقع رکھنا کہ وہ خود بخود یہ بھی کہے۔ کہ خدا کی ذات ستار العیوب بھی ہے اور جبار و قہار بھی زیادتی ہے :۔ اس قسم کی باتیں ایک انسان کو بتانے سے ہی آتی ہیں ۔ خود بخود نہیں آ سکتیں :۔ چہ جائیکہ ہم یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ چونکہ خدا کی تمام صفات کو ماننا لازمی ہے۔ اور خدا کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ انبیاء کو انسانیت کی ہدایت کے لئے بھیجتا رہا ہے۔ اور ہر نبی خاتم النبیینؐ کے آنے کی بشارت دیتا رہا ہے۔ لہٰذا ہر غیر مسلم کو رسول پاکؐ پر ایمان خود بخود لے آنا چاہیے :۔ یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص یہ سمجھے۔ کہ دو سگے بھائیوں میں سے اگر ایک کو ہم نے ابجد پڑھا دی ہے۔ تو دوسرے کو یہ خود بخود آ جانی چاہیئے۔ کیونکہ یہ دونو ایک ہی گھر میں رہتے سہتے ہیں!

اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنی بھی لازمی ہے۔ کہ اگر ہم یہ باور بھی کر لیں۔ کہ پڑھے لکھے غیر مسلموں کو اپنی الہامی کتابوں سے خاتم النبیینؐ کی بشارت کے متعلق علم ہو سکتا ہے تو پھر جو غیر مسلم اَن پڑھ ہیں۔ اُن کو کس منطق کی رُو سے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہم خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ پچھلی الہامی کتابوں میں اُن کے پیروؤں نے ترمیم کر دی ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر اُنہوں نے اپنی کتابوں میں خاتم النبیین کی بشارت والے الفاظ حذف کر دیئے ہیں۔ تو آج کل کے پڑھے لکھے غیر مسلموں کو اس بشارت کے بارہ میں کس طرح علم ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اِس بات کی طرف خاطر خواہ دھیان ہی نہیں دیا کہ تبلیغ کی ضرورت ہی اسی لئے ہے۔ کہ جن باتوں کا ایک انسان کو دوسرے کے بتاتے بغیر علم نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس تک پہنچائی جاتی ہیں :۔ چنانچہ

Marfat.com

خلافتِ راشدہ کے وقت تمام صحابہ کرام غیر مسلموں کو خود اسلام کی دعوت دیتے رہے ؛ جب "درخشندہ تاروں" کو پیچھے ہٹا دیا گیا۔ اور ملوکیت قائم ہوئی۔ تو اس وقت بھی اولیائے کرام اپنے طور پر غیر مسلم اقوام میں جہاں جہاں انہیں جوہر قابل نظر آیا۔ اُن کو وہ اپنی فیضانِ نظر سے مشرف باسلام کرتے رہے ؛ لیکن اس وقت جب کہ ایک مصلحت کی بنا پر یہ برگزیدہ ہستیاں رُوپوش ہیں ہمیں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیئے۔ کہ سلیم الفطرت دنیا ختم نہیں ہو چکی۔ غیر مسلم اقوام میں سینکڑوں انسان اس قسم کے ہوں گے۔ جو موحد ہیں۔ اور اگر وہ اب تک اسلام نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم خود "دانائے[1] راز" نہیں ہیں۔ اس لئے ہم اُن کو بھی "دانائے راز" نہ کر سکے[2] ؛ لہٰذا اب ہمیں اُن کے بارہ میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ اس لئے کہ دُنیا میں قوموں کے عروج و زوال کا تعلق اُن کے "عدل کے معیار" پر منحصر ہے۔ جب کسی قوم کا "عدل کا معیار" انصاف و صداقت کے درجہ سے گر جاتا ہے۔ تو وہ کبھی پنپ نہیں سکتی!

غرض موجودہ صورتِ حالات کے غیر تسلی بخش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہم اسلامی اداروں میں قرآن و حدیث تو پڑھاتے ہیں لیکن طالبعلموں کو یہ نہیں بتاتے۔ کہ فلاں آیت یا حدیث عملی دُنیا میں استعمال میں کس طرح آتی ہے؟ مثال کے طور پر سمنتھ[3] کے حالات پر ایک دفعہ پھر غور کیجئے ؛ جب اُس نے تین خداؤں کی بجائے ایک کو مانا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ اپنی حقیقی فطرت کی طرف لوٹ آیا جس فطرت پر قدرت نے انسان کو پیدا کیا ہے! اب سوال یہ ہے۔ کہ قدرت نے لوگوں کو کس فطرت پر پیدا کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے۔ کہ رب العزت نے لوگوں کو اللہ کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور اللہ کی فطرت ظاہر ہے۔ کہ توحید ہی ہے ؛ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (سورۃ ۳۰ الروم آیت ۳۰)

(یعنی اللہ کی فطرت جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ؛)

یہاں یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کہ قرآن میں جس جگہ بھی "النّاس" کا لفظ آتا ہے۔ تو اُس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں مُراد ہوتے ہیں۔ گویا مندرجہ بالا آیت کی رُو سے اگر مسلمان "فطرت اللہ" پر پیدا کیے گئے ہیں۔ تو غیر مسلم بھی اسی فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں ؛ لہٰذا مسلمان اگر فطرتاً توحید پرست ہو سکتے ہیں۔ تو غیر مسلم بھی فطرتاً توحید پرست ہو سکتے ہیں!

---

[1] خدا رسیدہ یا عارف

[2] یہاں ایک تمثیل دلچسپی سے خالی نہیں ہو گی ؛ ایک بندۂ نفس کلمہ گو نے ایک غیر مسلم سے کہا کہ تم اسلام کے بہتری اصولوں کے دلدادہ ہو۔ تو حلقہ بگوشِ اسلام کیوں نہیں ہو جاتے؟ اُس نے جواب دیا کہ حضرت بایزید بسطامی والے اسلام تک تو میری رسائی نہیں۔ اور تم جیسا مسلمان ہونا پسند نہیں کرتا ؛ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عدم تبلیغ سے کہیں بڑھ کر مسلمان کہلوانے والوں کی بد اعمالیاں اور غلط کاریاں صحیح اسلام کے راستہ میں سب سے زیادہ حائل ہیں ؛

[3] دیکھیں صفحہ ۱۵۹ ؛

چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث بھی اِس قرآنی ارشاد کی تائید کرتی ہے :۔ یعنی ؛

کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَتِہٖ

یعنی ہر بچہ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے ۔ وہ اپنی حقیقی فطرت یعنی توحید کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے :۔ سمتھ کی مثال قرآن اور حدیث کے اِس کلیہ کو ثابت کرتی ہے ۔ یعنی گو وہ اُس ماحول میں پیدا ہوا ۔ جس میں اُس کے ماں باپ ، بھائی بند، دوست احباب تین خداؤں کو مانتے تھے ۔ لیکن اگر کوئی شخص ذرا بھی تدبر سے کام لے گا ۔ تو وہ لامحالہ اِس نتیجہ پر پہنچے گا ۔ کہ خدا ایک ہی ہے :۔

اب اِس خدا کی صفات کیا ہیں ؟ یہ ہمارا کام ہے ۔ کہ ہم دُنیا کو بتائیں :۔ اور اگر ہم یہ نہیں بتائیں گے ۔ تو کیا ہم یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ خدا اور اُس کا رسولؐ اِس بات کی انتظار میں رہتے ہیں ۔ کہ ہم کس کو مومن قرار دیتے ہیں ۔ اور کس کو کافر ؟

حقیقت یہ ہے ۔ کہ ہم کو اِس جستجو میں ہونا چاہیئے ۔ کہ جب دُنیا کے لوگوں کے اعمال ہر صبح و شام رحمۃ للعلمیٰن کے رُوبرُو پیش ہوتے ہیں ۔ تو حضورؐ کس کے حق میں بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں ۔ اور کس کے حق میں خوشنودی کا ۔ اور اپنے فتوے پھر اُس کے مُطابق دیں ــــــــــ اور یہ ممکن نہیں جب تک ایک انسان خدا رسیدہ نہ ہو ۔ لیکن اگر ہم خدا رسیدہ لوگوں کو ہی اپاہج[1] بنا کر دم لیں ۔ تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے ۔ کہ ہمارے تخیّل کی گراوٹ کس حد تک پہنچ چکی ہے ؟

یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے ۔ وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے ۔ کہ ہر بچہ خواہ وہ مسلم گھرانہ کا ہو ۔ یا غیر مسلم کا ۔ اپنی ماں کے پیٹ سے مومن ہی پیدا ہوتا ہے :۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک غیر مسلم بچہ ایک ہفتہ کا ہوتا ہے تب وہ مومن ہی ہوتا ہے :۔ ایک ماہ یا سال کا ہوتا ہے ۔ پھر بھی وہ مومن ہی ہوتا ہے :۔ اب آٹھ یا دس سال کی عمر پر پہنچ کر اگر اُس کے ماں باپ نے اُسے بتایا ۔ کہ خدا تین ہیں ۔ پھر تو وہ تثلیث کا قائل ہو جائے گا ۔ لیکن اگر وہ سلیم الفطرت ہے ۔ اور اپنی چھان بین کی وجہ سے وہ سمتھ[2] کی طرح اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے ۔ کہ خدا ایک ہی ہے ۔ تو پھر ظاہر ہے ۔ کہ وہ اپنی جبلّی فطرت پر قائم رہا :۔ ایسی صورتِ حالات میں وہ تمام عمر مومن کا مومن ہی رہا ۔ کافر کب ہوا ؟ اور کیوں ہوا ؟

اِس سلسلہ میں اسلام جس بات کا خاص لحاظ کرتا ہے ۔ وہ صرف خلوص ہے :۔ مثال کے طور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ایک گڈریے کا قصہ مشہور ہے ۔ وہ خدا سے محبت کرتا تھا ۔ لیکن اِس بارہ میں اُس کا تخیّل کچھ اِس قسم کا تھا ۔ کہ وہ کہتا تھا ۔ کہ کاش خدا اُسے ملے ۔ وہ اُسے پھر نہلاتے ! اُس کے سر میں تیل لگاتے ! اور اُسے اچھے اچھے کپڑے پہناتے ! جب حضرت موسیٰؑ نے یہ الفاظ سنے ۔ تو آپ نے اُس کو ڈانٹا ۔ لیکن رب العزت نے حضرت موسیٰؑ کو سرزنش کی ۔ کہ وہ گڈریے کے الفاظ کی طرف نہ جائیں ۔ بلکہ اُس کے جذبے کو دیکھیں ۔ کہ اُس میں کتنی

---

[1] دیکھو صفحات ۱۰۵ - ۱۰۶ :۔

[2] دیکھو صفحہ ۱۵۹ :۔

محبت پائی جاتی ہے:۔ کیا ہم کبھی بھی اس قسم کی رعایت کرنے کو تیار ہوتے ہیں؟

آیئے اب ہم سلیم الفطرت غیر مسلموں کے مسئلہ کا قرآن کی چند دوسری آیات کی روشنی میں مطالعہ کریں:۔
اس سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ نہایت لازمی ہے:۔

(۱) قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

(سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۶۴):۔

(یعنی آپ فرما دیجئے۔ کہ اے اہل کتاب آؤ ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یہ کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم اور کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔ پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں۔ تو تم لوگ کہہ دو۔ کہ تم اس کے گواہ رہو۔ کہ ہم تو ماننے والے ہیں):۔

(۲) لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ

(سورۃ ۳۔ آل عمران۔ آیت ۱۱۳):۔

(یعنی یہ سب برابر نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق پر قائم ہیں۔ وہ اللہ کی آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں۔ اور سجدے بھی کرتے ہیں):۔

(۳) هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(سورۃ ۹ التوبۃ۔ آیت ۳۳):۔

(وہی ہے۔ جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کی تمام ادیان پر فوقیت ظاہر ہو جائے)

اب پہلی آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان ایک بات ایسی بھی ہے۔ جو دونوں میں یکساں ہو سکتی ہے۔ اور وہ ایک خدا کی عبادت ہے:۔ اگر دونوں میں یہ بات یکساں نہ ہو سکتی۔ تو قرآن اس کا اس طرح ذکر ہی نہ کرتا۔ اور جب ذکر کیا گیا ہے۔ تو وہ یکساں چیز کفر نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اسلام میں کفر ہرگز نہیں سما سکتا:۔ لہٰذا جو

Marfat.com

چیز یکساں ہے۔ وہ توحید اور نیک کرداری ہی ہو سکتی ہے ؛

دوسری آیت اس اوپر والی بات کی تائید کرتی ہے۔ کہ اہلِ کتاب میں دو گروہ ہیں۔ ایک میں وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ کی آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں۔ اور سجدے کرتے ہیں۔ اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے بلکہ فاسق ہیں ؛

پہلے اور دوسرے گروہ میں چونکہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا قرآن ہمیں حکم دیتا ہے۔ کہ ہم ان دونوں کو ایک جیسا نہ سمجھیں !

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اہلِ کتاب کا جو صالح گروہ ہے۔ وہ دین الحق[1] (یعنی موجودہ اسلام) کے گروہ کے مقابلہ میں کیسا ہے ؟

---

[1] یہاں یہ بتانا لازمی ہے۔ کہ "دین الحق" کسے کہتے ہیں ؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے (۱) "دین" (۲) "شریعت" (۳) "مذہب" اور (۴) "اسلام" کی اصطلاحوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح (۱) اور (۲) کے بارہ میں پہلے واضح کیا جا چکا ہے (دیکھیں صفحات ۱۵۴ اور ۱۶۲) :-

(۱) "دین" سے مُراد توحید اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی ہے ؛ توحید کا صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی رہے ہیں ؛ اسی لئے "حضرت موسیٰؑ کے دین" "حضرت عیسیٰؑ کے دین" اور "حضرت محمدؐ کے دین" میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ البتہ ان "ادیان" کے "ارتقاء" میں فرق ہے۔ جس کا ذکر نیچے آتے گا ؛

(۲) "شریعت" سے مراد ہر زمانہ کے اپنے اپنے عبادت کے طریقے۔ اور اُن کی بابت احکام ہیں ؛

(۳) "مذہب" سے مراد ہے۔ "دین" اور شریعت دونوں ہیں ؛ یہ "اسلام" ہے ؛ اسی لئے حضرت نوحؑ کا مذہب اسلام کی ابتدائی شکل ہے ؛ حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور سلیمانؑ و عیسیٰؑ کے وقت اسلام اور "نکھر گیا۔ اور حضرت محمدؐ کے وقت اسلام "تکمیل" کو پہنچ گیا !

(۴) "دین الحق" سے مُراد موجودہ "تکمیل شدہ اسلام" ہے ! (گویا اسلام کا لفظ "دین" اور "مذہب" دونو معنوں میں استعمال ہوتا ہے) ؛

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب "دین" حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ تو پھر "دین کی تکمیل" کے کیا معنی ہیں ؟

"دین کی تکمیل" کا مطلب دراصل "خدا کی معرفت" کی تکمیل ہے ؛ "معرفت" میں دو باتیں شامل ہیں :-

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۷۳ پر

Marfat.com

تیسری آیت میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے۔ کہ اگر ان دونو گروہوں (یعنی اہلِ کتاب کے صالح گروہ اور دین الحق کے گروہ) کا مقابلہ کیا جائے۔ تو موخر الذکر گروہ فوقیت لے جائے گا۔ یہ اس لئے کہ رسولِ پاکؐ کی سُنّت پر صحیح معنوں میں پیروی کرنے والے لوگ خدا رسیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیرو اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتے!

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس طرح پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ "دین الحق" تکمیل شدہ دین کا نام ہے۔ اور باقی ادیان کے وقت یہ تکمیل ابھی نہیں ہوئی تھی:۔ اس کا ثبوت قرآن کے الفاظ "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" میں ملتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے"؛ اسی لئے دین الحق (یعنی اسلام) آخر کار باقی تمام ادیان پر فوقیت اور سبقت لے جائے گا؛ قرآن نے "لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ" کے الفاظ استعمال کر کے اسی مفہوم کا اظہار کیا ہے:۔

لہٰذا تیسری آیت کا حقیقی مطلب یہ ہے۔ کہ دین الحق (یعنی اسلام) دوسرے ادیان سے بہتر ہے۔ یہ نہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲ کا)

(الف) خدا کا دیدار۔ اور

(ب) کائنات کی "رُوحانی تسخیر"!

اب پہلے (الف) کو لیں:۔ جب حضرت موسیٰؑ نے چاہا۔ کہ اُنہیں خدا کا دیدار ہو۔ تو رب العزت نے فرمایا "لَنْ تَرَانِیْ" در واقعی ایسا ہوا بھی۔ چونکہ جب رب العزت کی تجلیات وارد ہوئیں۔ تو نہ صرف حضرت موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلکہ طُور کا پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا! اس کے مقابلہ میں جب حضورؐ کی باری آئی۔ تو "قَابَ قَوْسَیْنِ" تک نوبت پہنچی!

یہاں جو نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت نوحؑ نے خدا کے دیدار کی تمنا نہیں کی۔ یہ اس لئے کہ اُس وقت انسانیت ابھی "بچپنے" میں تھی! حضرت موسیٰؑ نے یہ تمنا کی۔ لیکن وہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ یہ اس لئے کہ انسانیت ابھی "بلوغت" کو نہیں پہنچی تھی؛ یہی "دین" کے "ارتقاء" کی مثال ہے؛ حضورؐ کی نوبت "قَابَ قَوْسَیْنِ" تک اس لئے پہنچی۔ کہ اُس وقت انسانیت اپنی بلوغت کے پُورے جوبن پر تھی! اسی لئے یہ "دین" کی "تکمیل" کی مثال ہے۔ اور یہی "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" کی تفسیر ہے:۔

اب شق (ب) کو لیں:۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب رب العزت سے پُوچھا۔ کہ مُردے زندہ کس طرح کئے جاتے ہیں؟ تو پرندوں والا قصہ مشہور ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰؑ نے خود مُردے زندہ کئے۔ حضرت ابراہیمؑ سے مُردے زندہ نہیں کروائے گئے۔ وہ اس لئے کہ زمین ابھی تیار نہیں تھی! حضرت عیسیٰؑ نے خود مردہ زندہ کئے۔ یہ اس وجہ سے کہ اب زمین تیار ہو چکی تھی! یہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کی "ارتقا" کی مثال ہے:۔ رسولِ پاکؐ کے زمانہ میں اس "ارتقا" کی معراج ہوئی۔ اس کی مثال شق القمر کا معجزہ ہے۔ اور سورج کو آگے پیچھے کرنا ہے! یہ "اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" کی تفسیر ہے!

Marfat.com

اسلام سچا ہے۔ اور دوسرے ادیان جھوٹے ہیں۔ چونکہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک دُنیا میں جتنے بھی ادیان ہوتے ہیں۔ وہ سب برحق ہی تھے ؛ چنانچہ اگر ہم اسلام کا دوسرے ادیان سے مقابلہ کریں گے۔ تو فرق صرف اتنا نکلے گا۔ کہ حضرت نوحؑ کے وقت اگر دین اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ تو حضرت ابراہیمؑ کے وقت اُس نے بہتر صورت اختیار کر لی ؛ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے وقت وہ اور نکھر گیا۔ اور آخر کار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت وہ پورے جوبن پر آگیا !

اس وقت چونکہ اسلام تکمیل شدہ صورت میں ہے۔ اور دوسرے ادیان اس تکمیل شدہ درجہ سے کم ہیں۔ لہٰذا مؤخر الذکر دراصل اسلام کی ہی ابتدائی شکل ہیں ؛

اب جو ادیان اسلام کی ابتدائی شکل میں ہیں۔ اُن کے پیروؤں میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو بھی ایک مانتے ہیں۔ اور روزمرّہ کی زندگی میں نیکوکار بھی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو مشرک یا کافر ہیں ؛

مؤخر الذکر لوگ تو بلاشبہ جہنمی ہیں۔ لیکن اوّل الذکر جن کو رسالت کی صحیح معنوں میں تبلیغ نہیں ہوتی۔ وہ موحّد اور صالحین ہیں۔ لہٰذا وہ نجات کے حقدار ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے ایمان و عمل کی وجہ سے صبح و شام رحمۃ للعلمینؐ کی شفاعت حاصل کرتے رہتے ہیں[1]۔ اور اُن کو رسالت کی تبلیغ کا نہ ہونا اُن کے اپنے بس کا روگ نہیں ؛ اسی لئے ان غیر مسلموں کے بارہ میں قرآن میں جتنی بھی آیات آتی ہیں۔ اُن کے آخر میں عام طور پر لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ؛ یہی اُن کی نجات کے لئے ایک بیّن سند ہے۔ لیکن ہم نے عام طور پر یا تو ان الفاظ کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اور اگر سمجھا ہے۔ تو ان کی تفسیر غلط کی ہے۔ جس کی مثال مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ میں اوپر دیدی گئی ہے[2] ؛ بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ تھا ؛

اب قرآن کی لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ والی آیت دُنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کرتی ہے۔ کہ باوجود اس بات کے ہم موجودہ اسلام کا مقابلہ دوسرے ایسے ادیان سے کریں۔ جن کے پیرو اپنے ایمان و عمل اور رسولِ پاکؐ کی ہر صبح و شام کی شفاعت کی وجہ سے نجات کے حقدار ہیں۔ پھر بھی اسلام تمام دوسرے ادیان سے بہتر ہے !

اب اسلام کی بہتری اس بات میں مضمر ہے۔ کہ اس دین کے پیرو نہ صرف خدا کو "ماننے" ہیں۔ بلکہ خدا تک "پہنچ" بھی سکتے ہیں۔ گویا وہ "خدا رسیدہ" ہو سکتے ہیں ! اور یہ "خدا رسیدگی" ہی دراصل

---

[1] دیکھیں صفحہ ۱۶۶

[2] دیکھیں صفحات ۱۶۵ - ۱۶۷

وہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ارفع منزل ہے۔ جس کے لئے ایک ہوشمند، سلیم الفطرت، باریک بیں اور تعمق پسند انسان اِس دُنیاوی زندگی میں تڑپتا ہے!

اور چونکہ خدا کی معرفت ایک انسان کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت پر صحیح معنوں میں پیروی کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اِس بنا پر اسلام، تمام ادیان سے نہ صرف بہتر ہے۔ بلکہ اسلام لانے کے بغیر (یعنی رسولِ پاکؐ پر ایمان لانے اور آپؐ کی سُنّت پر صحیح معنوں میں پیروی کئے بغیر) ایک انسان، رُوحانیت کی معراج پر پہنچ ہی نہیں سکتا!

یہاں یہ بات سمجھنی بھی لازمی ہے۔ کہ ہم دوسروں پر اپنی بہتری اور فوقیت صرف اُسی صورت میں جتا سکتے ہیں۔ کہ ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہو۔ اور جب تک یہ میسّر نہ ہو۔ دوسرے لوگ ہماری فوقیت کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟

اِس تمام بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے۔ کہ چونکہ غیر مُسلم دُنیا میں سلیم الفطرت انسانوں کا ایک ایسا عنصر موجود ہے۔ جو خدا کی یکتائی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور نیکوکار بھی ہے۔ لہٰذا اس وقت "موحّد" دو قسم کے ہیں:۔

(۱) ایک وہ جن کا رسولِ پاکؐ سے "تعارف" ہو چکا ہے۔ اس میں تمام مسلمان آجاتے ہیں۔ او

(۲) وہ "موحّد" جو خدا کی یکتائی کو تو تسلیم کرتے ہیں۔ اور نیکوکار بھی ہیں۔ لیکن جن کا خاتم النبیینؐ سے ابھی "تعارف" نہیں ہوا۔ حضورؐ نے معراج کے موقع پر اس شق کے لوگوں کو "صالحین" کے لفظ سے یاد فرمایا ہے:۔

مثال کے طور پر جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو معراج کے موقع پر "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ" کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا:۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا میں دُنیا کے تمام وہ لوگ آجاتے ہیں۔ جو حضورؐ پر ایمان لا چکے ہیں ——— اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ دُنیا کے تمام مسلمان ہیں ——— لیکن جن لوگوں کو کسی وجہ سے رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکی۔ اور وہ موحّد اور نیکوکار بھی ہیں۔ اُن پر حضورؐ کے "عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ" کے الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے:۔

اِن "صالحین" میں نہ صرف حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک سب پیغمبر اور اُن کی اُمتوں کے تمام نیک لوگ شامل ہیں۔ بلکہ وہ سب صالح غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ جن کو حضورؐ کی حیوٰۃِ طیبہ میں کسی وجہ سے رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکی۔ یا آئندہ نہیں ہو سکے گی:۔

Marfat.com

مثال کے طور پر حضورؐ کی اپنی دُنیاوی زندگی میں اسلام کی تبلیغ صرف عرب یا عرب کے آس پاس کے نزدیک ممالک تک ہی محدود رہی ۔ لیکن اُس عرصہ میں چین ۔ جاپان ۔ ہندوستان ۔ افریقہ اور یورپ کے ممالک بھی آباد تھے ؛ ان ملکوں کے "صالحین" باشندے جو خدا کو ایک مانتے تھے ۔ اور نیکوکار بھی تھے ۔ وہ حضورؐ کی معراج والے موقع کی "سلامتی" والی دُعا میں شامل ہیں ۔ اسی طرح آئندہ بھی وہ باشندے شامل رہیں گے ۔ جن کو کسی وجہ سے رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکے گی ۔ بشرطیکہ وہ موحد اور نیکوکار ہوں گے !

"دو قوموں" والے نظریئے پر بحث

اب جب تک ہم مندرجہ بالا شق نمبر (۲) کے "صالحین" کو خاتم النبیین سے رُوشناس نہیں کرا سکتے ۔ اس سوال پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ کہ پاکستان کی بُنیاد جو "دو قوموں" کے اصول پر رکھی گئی ہے ۔ اُس پر اس مسئلہ کی رُو سے کیا اثر پڑتا ہے ؟

آیئے ۔ پہلے پاکستان کے بننے کی وجوہات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں ؛ یہ ظاہر ہے ۔ کہ ابتدا میں پاکستان کے بننے کی وجوہات زیادہ تر معاشی اور سیاسی تھیں ۔ کیونکہ اگر تقسیم سے قبل ہندوستان کے مُسلمانوں کو معاشرتی اور سیاسی مشکلات پیش نہ آتیں ۔ تو غالباً ملک کے تقسیم کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا ؛ لیکن جب یہ مشکلات حل نہ ہوئیں ۔ اور ان کا حل محض ملک کی تقسیم میں ہی نظر آیا ۔ تو اس وقت یہ خیال بھی سُرعت کے ساتھ ترقی کرتا گیا ۔ کہ تقسیم کے بعد ہی ہمیں وہ مواقع ہاتھ آئیں گے ۔ جب کہ ہم ایک ایسی حکومت کی تشکیل کریں جس میں اسلام کے زرّیں اصول بروئے کار لائے جائیں ۔ چنانچہ اس جذبہ نے پاکستان کو معرضِ ہستی میں لانے کے لئے توقع سے زیادہ مدد دی ؛

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے ۔ کہ اگرچہ عام مسلمانوں کو ایک علیحدہ حکومت قائم کرنے کا خیال نہیں تھا ۔ (اور اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں کوئی سمجھوتا ہو جاتا ۔ تو اس قسم کا خیال شاید کبھی زور ہی نہ پکڑتا) ۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال یا چوہدری رحمت علی جیسے لوگوں کا تعلق ہے ۔ وہ شروع ہی سے ایک ایسے علیحدہ خطّہ کے دل وجان سے خواہاں تھے ۔ جہاں خالص اسلامی اصولوں پر ایک حکومت کی تشکیل کی جائے !

غرض پاکستان بننے کی اصل وجہ یہ ہوئی ۔ کہ چونکہ تقسیم سے پہلے تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا ۔ اور مسلمان قوم پسماندہ تھی ۔ اس لئے وہ ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی ؛

اسی طرح مسلمان چونکہ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے تقریباً پچاس سال پیچھے تھے ۔ لہٰذا سرکاری ملازمتوں میں بھی وہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت ہی کم تھے ؛

اِس کے علاوہ ہندوؤں کا تعصّب بھی اس صورتِ حالات کا بہت حد تک ذمہ دار ہوا ؛ مثال کے طور

Marfat.com

پر پاکستان بننے سے پہلے تمام سرکاری دفاتر اور بینکوں میں خزانچی ہندو تھے۔ کیونکہ مسلمان اچھے حساب دان تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ نہ صرف تمام دفاتر میں خزانچی مسلمان ہیں۔ بلکہ تمام بینکوں کو مسلمان ہی چلا رہے ہیں۔ اور کامیابی سے چلا رہے ہیں ؛

اسی طرح تقسیم سے پہلے' کاروبار کے سلسلہ میں' مسلمان اپنی غربت کی وجہ سے اس میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اب جب کہ تمام مواقع مسلمانوں کے لیے کھل گئے ہیں۔ وہ اُسے بھی کامیابی سے چلا رہے ہیں ؛

بالکل اسی طرح سیاسی معاملات میں مسلمان چونکہ قلیل تعداد میں تھے۔ لہٰذا وہ جمہوری نظام حکومت کے تحت ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اب جب کہ یہ مقابلہ نہیں رہا۔ پاکستانی حکومت مثالی نہ سہی۔ خاصے اچھے طریقے پر چل رہی ہے ؛

لیکن بایں ہمہ کسی شخص کی رُوحانیت کا فیصلہ ہم اُس کی قومیت کی بنا پر نہیں کر سکتے ؛ یا بالفاظِ دیگر اگر کسی شخص سے ہمارا معاشرتی یا سیاسی اختلاف ہے۔ تو اُس کی بنا پر ہم اُس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ یہ بات ہر شخص کے ایمان پر منحصر ہے ؛ اگر کوئی سومنی خدا کو نہیں مانتا۔ تو وہ موحد نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس اگر اُسی شہر کا رہنے والا مومن خدا کی یکتائی کا قائل ہے۔ تو وہ موحد کی بجائے کافر نہیں کہلا سکتا ؛

لہٰذا اس سلسلہ میں ہمیں بیحد محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہمیں قرآن کا حکم یہ ہے۔ کہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس بات پر نہ اُکسا دے۔ کہ ہم اُس کے ساتھ بے انصافی کرنی شروع کر دیں ؛ (سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۸)

اس سلسلہ میں ہمیں ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ جب ہم آج کل کے تعلیم یافتہ غیر مسلم لوگوں کے مذہب کے بارہ میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (مثال کے طور پر جب ہم مختلف یونیورسٹیوں کے غیر مسلم انجینیروں اور ڈاکٹروں کے مذہب کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں)۔ تو اس وقت اکثر ہم جو غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم تب اُن کے نام اور قوم کے لحاظ سے فتویٰ لگاتے ہیں۔ تعلیم کی نوعیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ؛

مثلاً اگر ایک انجینیر یا ڈاکٹر ہندو ہے۔ تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اُس کے "مذہبی فلسفہ میں خدا کی ذاتِ واجب الوجود کائنات سے اوراء ہے۔ اُس کے نزدیک کائنات وہمی مایا ہے۔ اور جیو دنیا کی بیکار بھی وہمی ہے"[1] وغیرہ۔ وغیرہ ؛

اسی طرح اگر کوئی انجینیر یا ڈاکٹر بدھ مذہب کا ہے۔ تو ہمارا فتویٰ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس کے نزدیک "نفسِ انسانی کوئی حقیقی جوہر نہیں رکھتا۔ بلکہ اعراض ہی اعراض ہے۔ یہاں تک کہ وہ تمنا سے

---

[1] دیکھیں حاشیہ بر صفحہ ۱۷۸ ؛

حیات کو بھی بیخ و بن سے اُکھاڑ دینا چاہتا ہے۔"[1] وغیرہ وغیرہ ؛

اور اگر کوئی انجینئر یا ڈاکٹر عیسائی ہے۔ تو ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ اُس کے فلسفہ میں جو "خدا کا تصور ہے۔ اُس سے نہ کائنات وحیات کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اور نہ وہ انسانی زندگی میں کام آسکتا ہے"۔[2] وغیرہ۔ وغیرہ ؛

غرض اس قسم کے خیالات کے اظہار کے وقت ہم جو بات بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب ہم انہی انجینئروں اور ڈاکٹروں کی ٹیکنیکل لیاقت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ اُس وقت تو ہم اُن کی ڈگری کے مُطابق اندازہ لگاتے ہیں۔ اور صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ لیکن جب انہی لوگوں کے مذہبی خیالات کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں۔ تو پھر جو کچھ ہم نے مختلف مذاہب کے بارہ میں کتابوں میں پڑھا ہوتا ہے۔ وہی اُن پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ آج کل تمام ممالک کے نوجوان خیالات کی افتادِ رُجحان اور مطمحِ نظر کے لحاظ سے کم و بیش بالکل ایک جیسے ہیں خواہ اُن کا برائے نام مذہب کچھ بھی ہو ؛ لہٰذا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ آج کل کے غیر مسلم انجینئر یا ڈاکٹر نہ تو "تمنائے حیات کو بیخ و بن سے اُکھاڑنے کو تیار ہیں"۔ نہ وہ کسی "خیر و شر کی پیکار" میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور نہ اُن کے نزدیک کائنات "وہمی مایا" ہے ؛ بلکہ اُنہوں نے جو ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ وہ اُس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ خواہ وہ برائے نام ہندو ہوں یا سکھ عیسائی ہوں یا مسلمان اُن کو علیحدہ علیحدہ پوچھنا ہوگا۔ کہ اُن کا مذہب کے بارہ میں نظریہ کیا ہے ؟ اور ہو سکتا ہے۔ کہ زیادہ تر لوگوں کا جواب وہی ہو۔ جو کہ میرے ہمعصر انجینئر نے مجھے دیا۔ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ؛ (دیکھو صفحہ ۱۶۸)

لہٰذا مذہب کے معاملہ میں کسی کو مومن یا کافر کہنا یا سمجھنا نہایت ذمہ داری کا کام ہے ؛ اس سلسلہ میں غیر ذمہ داری برتنا بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ کسی شریف آدمی کو ہم کہہ دیں۔ کہ وہ پرلے درجہ کا بدمعاش ہے۔ اور کسی پرلے درجہ کے بدمعاش کو ہم یہ کہیں کہ وہ بے حد شریف ہے!

اس قدر محتاط ہونے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے۔ کہ (جس طرح پہلے بھی کہا جا چکا ہے)۔ گو آج کل کے سکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا زیادہ رواج نہیں۔ لیکن سائنس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ لوگ اب توہم پرست نہیں رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جب سلیم الفطرت حضرات "صحیفۂ کائنات" کا (جو سب کے لئے

---

[1] [2] ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم نے رسالہ "ثقافت" بابت ماہ جنوری ۱۹۵۷ء میں صفحہ ، پر انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ خیالات سطح بینی پر مبنی ہیں ؛ ہندو مذہب، بُدھ مذہب یا عیسائی مذہب کی اصل حقیقت کیا ہے ؟ اِس کا مفصّل ذکر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (پاکستان) ہی کی کتاب "اسلام اور مذاہب عالم" میں موجود ہے ؛ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی ؛

Marfat.com

یکساں طور پر کھلا ہے)۔ مطالعہ کرتے ہیں۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس محیر العقول کارخانہ کا بغیر کسی ارفع و اعلیٰ ہستی کے، معرضِ وجود میں آنا ممکن نہیں ؛ یہی خیال ایک انسان کو "موحّد" بنا دیتا ہے ؛ [1]

لہٰذا ہمیں جس مقام پر بیحد احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ گو ہماری کسی قوم سے دشمنی دیرینہ ہو۔ اور اُن کے ساتھ ہمارے سیاسی اختلافات بھی ہوں۔ لیکن اُس قوم کے پڑھے لکھے طبقہ کے مذہبی خیالات سے ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے ؛

مثال کے طور پر میری ملازمت کے دوران ایک ہمعصر ہندو افسر نے ایک دفعہ مجھ سے کہا۔ کہ خدا کی ہستی کے سمندر کو اگر کسی زبان نے کُوزے میں بند کیا ہے۔ تو وہ عربی کے چار الفاظ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہیں! اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا۔ کہ خدا کی ہستی کے تخیل کے متعلق گو سب زبانوں نے اپنی اپنی جگہ پر "طبع آزمائی" کی ہے۔ لیکن جس اختصار اور خُوبی سے عربی زبان نے ان چار لفظوں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ اور کسی زبان سے یہ ممکن نہیں ہو سکا!

مزید تشریح و تفصیل کے لئے صفحات ۱۹۰ تا ۱۹۱ اور ۲۱۶ تا ۲۱۷ ملاحظہ کریں ؛

غرض جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے۔ اوپر کی تصریحات سے آج کل کی پڑھی لکھی ہندو دُنیا کے خیالات کی افتاد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اس پہلو سے معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی کبھی ضرورت ہی

---

[1] یہ اس لئے کہ ؎

نشّۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!

(اقبال)

Marfat.com

محسوس نہیں کی :

اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ خاتم النبیینؐ کے رُوبرُو جب اِس قسم کے خیالات ہر صبح وشام پیش ہوتے ہیں۔ تو وہ[1] اُن سے خوش ہوں گے یا بیزار؟

لہٰذا ہم لامحالہ اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ ملک کی تقسیم سے پہلے جب تک ہم اپنی معاشرتی اور سیاسی اُلجھنوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ تب تک تو ہم شاید معذور سمجھے جا سکتے تھے۔ کہ ہمیں اِن معاملات پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن اب جب کہ یہ عذر باقی نہیں رہا ہم کسی کے کفر یا ایمان کا فیصلہ کسی کی قومیت کی بنا پر نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ ہر شخص کے اپنے اپنے نظریئے پر منحصر ہوگا :

اِس سلسلہ میں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمیں جب کفر سے مؤدّت کرنے سے روکا گیا ہے۔ تو ایسا کسی معاشرتی یا سیاسی نقطۂ نگاہ سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ کفر کے ساتھ ایک سلیم الفطرت انسان کو فطرتاً نفرت ہوتی ہے : مثلاً اسلام کے نزدیک عادتاً جھوٹ بولنے کو ایک نہایت ہی قبیح گناہ تصوّر کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کافر اور جھوٹے کی سزا قرآن نے ایک ہی مقرر کی ہے : مثلاً قرآن میں کفار کے متعلق آتا ہے وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ[2] اور جھوٹے انسانوں کے بارہ میں بھی قرآن نے یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ[3]

اب یہ ظاہر ہے۔ کہ کوئی شخص بھی جھوٹے آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ایک جھوٹے شخص کے ماں باپ بھی اُسے پسند نہیں کرتے :

اِسی طرح اگر کوئی شخص رب العزت کی بجائے سورج یا چاند کو خدا مانے۔ یا شجر و حجر کو معبود سمجھے۔ تو اُس میں تخیّل کی کتنی گراوٹ پائی جاتی ہے : اِس قسم کے انسان سے ایک سلیم الفطرت شخص کو قدرتی طور پر لگاؤ نہیں ہو سکتا : چنانچہ اِس قسم کے فطری کھچاؤ یا نفرت کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے : لہٰذا اِس قسم کے انسان کے ساتھ مؤدّت کرنے سے اگر ہمیں روکا گیا ہے۔ تو قرآن نے بجا کیا ہے :

لیکن اِس کے برعکس اگر ہم کسی غیر مسلم سے جو موحّد بھی ہو۔ اور اخلاقِ حمیدہ بھی رکھتا ہو۔ نفرت کرنا شروع کر دیں۔ تو یہ فطری بات نہ ہوگی۔ بلکہ اُس کی تہ میں تعصّب۔ تنگدلی یا ذاتی دشمنی ہوگی۔ جس کو اسلام جائز قرار نہیں

---

[1] دیکھیں صفحہ ۱۹۶ (نیز دیکھیں صفحہ ۱۰۸ جہاں ارشاد ہوا ہے: "جب تم ذاتِ الٰہی کی طرف ایک قدم بڑھو۔ تو جنابؐ نہایت خوش ہوتے ہیں") :

[2] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۰۴ : اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

[3] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۰ : یعنی اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ بدلہ اُن کے جھوٹ کا :

Marfat.com

دیتا۔ لہذا جو لوگ اِس قسم کے انسانوں سے مؤدت کرنے سے روکتے ہیں۔ جو سوہن[1] نہیں۔ بلکہ موہن[2] ہیں۔ یا البرٹ[3] نہیں۔ بلکہ سمتھ[4] ہیں۔ تو وہ محض اپنے تعصب اور تنگدلی کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ جو قرآن کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

اِس موقع پر ہمیں قرآن کی مندرجہ ذیل قسم کی آیات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے:۔

(۱) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ[5]

(سورۃ المائدہ ۔ آیت ۵۱)

(۲) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ[6]

(سورۃ المائدہ ۔ آیت ۵۷)

ان آیات میں جن یہود و نصاریٰ کے ساتھ تعاون سے روکا گیا ہے۔ وہ صرف وہی ہیں جو یا تو خدائے واحد کے قائل نہیں۔ اور یا اُس سے شرک کرتے ہیں۔ ظالم ہیں۔ اور یا جنہوں نے دین کو ہنسی اور مذاق بنا رکھا ہے۔ لیکن جو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اُس سے شرک نہیں کرتے۔ ظالم نہیں ہیں۔ اور دین کا مذاق نہیں اُڑاتے۔ وہ اِن آیات کے زمرے میں نہیں آسکتے۔

---

[1] دیکھیں صفحہ ۱۵۶
[2] دیکھیں صفحہ ″
[3] دیکھیں صفحہ ۱۵۹
[4] دیکھیں صفحہ ″
[5] اے ایمان والو! مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست۔ وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے۔ اور جو کوئی تم میں دوستی کرے اُن سے وہ اُنہیں میں سے ہے۔ اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو۔
[6] اے ایمان والو! مت بناؤ اُن لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں تمہارے دین کو ہنسی [illegible] اور کافروں کو اپنا دوست اور ڈرو اللہ سے اگر تم ایمان والے ہو۔

گویا قرآن نے صرف اُس قسم کے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کی ہے۔ جو مثال کے طور پر رسولِ پاک کے زمانہ میں بدترین ذہنیت کے مالک تھے۔ اور حضورؐ کی تبلیغ کے باوجود راہ راست سے بھٹکے رہے :: لیکن جن لوگوں کی ذہنیت درست تھی۔ اُنھوں نے حق کی آواز کو سنتے ہی لبیک کہا۔ اور ایمان لے آئے :: یہی کیفیت پھر پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر تبلیغ کرنے والی ہستیاں ایک دفعہ پھر "دانائے راز" ہوں!

یہاں ایک اور مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو ماننے والے ہیں۔ لیکن اُن کا خاتم النبیینؐ پر ایمان نہیں۔ اُن کے خلاف عام طور پر قرآن کی ذیل کی قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں :-

(۱) قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝[۱]

(سورۃ ۲۳ المومنون۔ آیت ۸۴-۸۵)

(۲) قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝[۲]

(سورۃ ۲۳ المومنون۔ آیت ۸۶-۸۷) ::

(۳) قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ۝[۳]

(سورۃ ۲۳ المومنون۔ آیت ۸۸-۸۹) ::

اِن آیات سے استدلال یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ایسے لوگ موجود تھے۔ جو اللہ کو ماننے والے تھے۔ لیکن چونکہ اِن لوگوں کا خدا کے علاوہ خاتم النبیینؐ۔ ملائکہ۔ یا روزِ جزا وغیرہ پر ایمان نہیں تھا۔ اِس لئے قرآن نے اُنھیں نہیں سراہا :: لیکن یہاں جس بات کا عام طور پر لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ یہ ہے۔ کہ قرآن کی اِس

---

[۱] تو کہہ کس کی ہے۔ زمین اور جو کوئی اُس میں ہے؟ بتاؤ۔ اگر تم جانتے ہو۔ اب کہیں گے۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ تو کہہ پھر تم ذاکر کیوں نہیں ہو؟

[۲] تو کہہ کون ہے مالک ساتوں آسمان کا اور مالک اُس تخت کا۔ اب بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ پھر تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے؟

[۳] تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی؟ اور وہ بچا لیتا ہے۔ اور اُس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔ وہ بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑتا ہے؟

Marfat.com

قسم کی آیات میں بھی اُن لوگوں کا ذکر ہے ۔ جو خدا کو تو مانتے ہیں۔ لیکن دنیوی زندگی کی محبت میں کچھ اس طرح پھنسے ہوتے ہیں ۔ کہ خدا کی یاد کے لئے اُن کے پاس فرصت ہی نہیں ہوتی ۔ یا اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود فاسق ہوتے ہیں ؛ یا اُنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا " اللہ " بنایا ہوتا ہے ؛ ان آیات میں اُن لوگوں کا ذکر نہیں جو خدا کو واحد ماننے کے ساتھ ساتھ نیکوکار بھی ہیں ؛ باقی رہا ۔ خاتم النبیینؐ اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان ۔ اس کے متعلق بالتفصیل اوپر بحث گذر چکی ہے ۔ کہ تبلیغ کے بغیر غیر مسلموں سے اِن اُمور پر ایمان کی توقع نہیں کی جا سکتی ؛

یہاں ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔ وہ یہ کہ سلیم الفطرت غیر مسلم دنیا کے تمام پیغمبروں کو (خاتم النبیینؐ سمیت) عزت اور توقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ اُن کی فطرت کی افتاد ہی اِس قسم کی ہوتی ہے ۔ کہ وہ کسی پیغمبر کو بھی گھٹانا بڑھانا نہیں چاہتے ؛ اُن کا تمام پیغمبروں کے بارہ میں اعتقاد بالکل اُس قسم کا ہوتا ہے ۔ جیسا کہ مسلمانوں کا اعتقاد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے بارہ میں ہے ؛ سوائے گنتی کے چند ایک پیغمبروں کے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے ۔ مسلمان نہ اُن کے نام جانتے ہیں ۔ نہ یہ جانتے ہیں ۔ کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کس ملک میں مبعوث ہوئے ۔ اور نہ اُن کو اُن کی شریعتوں کی تفصیل کا کچھ علم ہوتا ہے ؛ مسلمانوں کا صرف اِس بات پر ایمان لے آنا ۔ کہ سب پیغمبر برحق ہیں ۔ بالکل کافی ہوتا ہے ؛ بالکل یہی کیفیت سلیم الفطرت غیر مسلموں کی ہے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ سب پیغمبر صرف ایک ہی پیغام لے کر آئے ۔ یعنی یہ کہ ایک انسان خدا کو واحد مانے ۔ اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکوکار رہے ۔ اور چونکہ اِن دونو باتوں پر وہ پہلے سے ہی کاربند ہوتے ہیں ۔ لہٰذا وہ اور کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔ اس لئے مذہب کی تبدیلی کا فلسفہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا ؛

اب اُن کو مذہب کی تبدیلی کی اہمیت کو سمجھانے کے لئے لامحالہ مقصدِ حیات والا مسئلہ پھر نہایت شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے ؛ یعنی اگر ہم اُن کو حقیقی اسلام کی طرف لانا چاہتے ہیں ۔ تو لازمی طور پر ہمیں اُنہیں اِس بات کی تبلیغ کرنی ہوگی ۔ کہ مقصدِ حیات صرف خدا کو ماننا اور نیکوکار ہونا نہیں ہے ۔ بلکہ " خدا تک پہنچنا " اور " خدا رسیدگی " ہے ۔ اور اس کے لئے خاتم النبیینؐ کی سُنّت پر چلنا لازمی اور لابدی ہے ؛ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہم خود " خدا رسیدہ " نہیں ہوں گے ۔ دوسروں کو اس کی تبلیغ کس طرح کر سکتے ہیں ؟ ؛ غرض تمام مسئلہ کا راز صرف مقصدِ حیات کے فلسفہ کو صحیح طور پر سمجھنے میں مضمر ہے ؛ چنانچہ جب انسانی مقصدِ حیات کی حقیقی منزل یعنی " خدا کی معرفت " ذہن میں ہر وقت موجود ہو ۔ تو پھر اس بات کا اندازہ بھی آسانی سے ہو جاتا ہے ۔ کہ اس درجہ پر پہنچنے کے لئے تقویٰ کے کس بلند معیار کی ضرورت ہے !

Marfat.com

تقویٰ کی اِس بلند معیاری کی روشنی میں "جہاد" کے مسئلہ کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ چونکہ "جہاد" کا اصلی تعلق بھی تقویٰ سے ہی ہے ؛

ہم اس وقت تک یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ ہر وہ شخص جو دھوئیں دار تقریریں کر سکتا ہے۔ اور لوگوں کو مشتعل کر سکتا ہے۔ وہی سب سے بڑا "مجاہد" ہے ؛ یہ درست نہیں ہے ؛

اسلام نے جہاد کے سلسلہ میں دو تین نہایت سبق آموز نشانیاں رکھی ہیں ؛ جب تک ایک انسان اُس معیار پر نہ اُترے۔ وہ فساد تو برپا کر سکتا ہے۔ لیکن مجاہد نہیں ہو سکتا ؛ اسلام کے معیار کی بلندی مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہوگی ؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ کوئی کافر مسجدِ نبوی میں آیا۔ اور پیشاب کرنے لگا ؛ اُس کی اِس حرکت پر حاضرین بہت برہم ہوئے ؛ لیکن رسول مقبول صلعم نے فرمایا۔ کہ اُس کو پیشاب کر لینے دو۔ پیشاب کرتے وقت کسی کو روکنا نہیں چاہیئے ؛ چنانچہ جب وہ فارغ ہو چکا تو آپؐ نے اُسے بلایا۔ اور نہایت نرمی سے سمجھایا۔ کہ مسجد خدا کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس میں پیشاب نہیں کرتے ؛ اور خود پانی کا ڈول لے کر مسجد کو دھونا شروع کر دیا !

جو شخص اِس قسم کا تحمّل کر سکتا ہے۔ جب اُس کے ہاتھ میں تلوار دی جائے گی۔ تو وہ صحیح معنوں میں مجاہد ہو گا۔ لیکن جو اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار صرف اُس کے اپنے دل کی بھڑاس نکالیگی۔ لہٰذا اپنے طیش میں وہ مجرموں اور غیر مجرموں میں تمیز نہیں کر سکتا ؛ اسی لئے آج کل اگر کوئی غیر مسلم خدانخواستہ کسی مسجد میں پیشاب کر دے۔ تو ہم میں سے کوئی بھی اس دل گردے کا نہیں نکلے گا۔ جو یہ کہے۔ کہ اُسے پیشاب کر لینے دو ؛ ہم میں سے اکثر پہلے اُس کا "قیمہ" کریں گے۔ اور پھر جب تک اُس "قیمہ" کے وہ "کوفتے" نہ بنا لیں۔ اُن کے انتقام کی بھڑاس ختم نہیں ہوگی ؛

اسی سلسلہ میں دوسری مثال حضرت علیؓ کی ہے ؛ مشہور ہے۔ کہ وہ کسی کافر سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور آخر اُسے چاروں شانے چت گرا کر اُس کے سینہ پر بیٹھ گئے ؛ جب وہ کافر اپنی اِس زک پر آپے سے باہر ہو گیا۔ تو اُس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا ؛ حضرت علیؓ نے اُس وقت اُس کا "قیمہ" کر کے "کوفتے" نہیں بنائے۔ بلکہ اُسے فوراً چھوڑ دیا۔ اور اُس کی وجہ یہ بتائی۔ کہ وہ تو محض حق کی خاطر اُس سے دست و گریباں ہوئے تھے۔ لیکن جب اُس کافر نے اُن کے منہ پر تھوکا۔ تو اُن کو غصہ آگیا۔ جو اُن کو اپنی ذات کے سلسلہ میں آیا تھا۔ لیکن چونکہ اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ لینا اسلام کی نظر میں مستحسن نہیں۔ لہٰذا اُن کو اُسے چھوڑنا پڑا !

اب سوال صرف اتنا ہے۔ کہ اس قسم کا ضبط و تحمّل کس طرح حاصل ہوتا ہے ؟ یہ قرآن کی آیات کو رٹنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص اپنی روز مرّہ کی زندگی میں :-

Marfat.com

"فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝"

کی تصویر بن جائے۔ یعنی وہ کسی یتیم کو کبھی قہر آلود نگاہوں سے نہ دیکھے۔ اور جب وہ کسی سوال کرنے والے کو جواب دے۔ تو اُس کے جواب میں تلخی نہ ہو:

لیکن چونکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اِن احکام پر عامل نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم عام طور پر "جہاد فی سبیل اللہ" اور "فساد" میں تمیز نہیں کرسکے!

چنانچہ اگر ہم ہندوستان کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ پر انصاف سے نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بعض اوقات اِس قسم کے واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کہ اگر کسی مسلمان نے ہندو لڑکی کو اغوا بھی کرلیا۔ اور پھر اُس کے نتیجہ کے طور پر فساد ہُوا ہے۔ تو اُس کو بھی عام طور پر "کفر و اسلام" کے درمیان "معرکہ آرائی" ہی سمجھا گیا!

عام مسلمانوں اور "خدا رسیدہ" ہستیوں میں بس یہی فرق ہے: ایک کے "جہاد بالنفس" کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ہم اس وقت ہند و پاکستان میں ۹۰ ملین۔ بیس کروڑ مسلمان دیکھتے ہیں۔ اور ہمارے "جہاد برائے نفس" کا نتیجہ یہ ہُوا کہ "اسلام اور کفر" کی معرکہ آرائی تو بدستور رہی۔ لیکن نتیجہ صفر کا صفر ہی رہا!

اِس تمام بحث سے اب ہم غالباً اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ "دو قوموں والے" نظریئے کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ایک معاشرتی اور سیاسی اور دوسرا مذہبی: جہاں تک اس نظریئے کے معاشرتی اور سیاسی پہلو کا تعلق ہے۔ ہم جن مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اُن کا 'بغیر ملک کی تقسیم کے' بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا: لیکن جہاں تک اس نظریئے کا مذہب سے تعلق ہے۔ اس میں ہمیں کافی سے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ کفر و ایمان کے بارہ میں قرآن "حرفِ آخر" کا حکم رکھتا ہے: اس سلسلہ میں ہمیں اس کی آیات کو ٹھنڈے دل سے پڑھنا ہوگا: لہٰذا کفر و الحاد کے فتووں کے سلسلہ میں ہم قرآنی الفاظ سے کھیل نہیں سکتے: آنے والے زمانہ میں جس کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے۔ قرآن اور صرف قرآن کائنات کے نظم و نسق میں کارفرما ہوگا: قرآن کے الفاظ خود اس سلسلہ میں ناطق ہوں گے۔ اور اُس وقت پھر صرف وہ لوگ کامیاب و کامران ہوں گے۔ جو قرآن کے الفاظ کے حقیقی منشا کی تہ تک پہنچیں گے: جنہوں نے اُس کے الفاظ کے حقیقی منشا سے اپنے تعصب۔ تنگدلی۔ لاعلمی یا جہالت کی وجہ سے سرِ مُو بھی انحراف کیا۔ اُن کے حصّہ میں صرف خُسران ہی خُسران ہوگا:

لے سورۃ ۹۳ الضحٰی۔ آیت ۹۔ ۱۰ (یعنی یتیم پر دباؤ نہ ڈالو اور سائل کو نہ جھڑکو):

کشمیر کا مسئلہ

"دو قوموں" والے نظریئے کی بحث کے ضمن میں کشمیر کا معاملہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اِس خطہ کے حصول کے لئے ہم نے گذشتہ بیس بائیس سال متواتر کوشش کی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامیابی کو ہمیں دو زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے :: ایک تو وہ زاویہ ہے۔ جس سے ہم سب ہر وقت اس معاملہ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حق ہماری طرف ہے۔ لیکن دُنیا کی ناحق شناس طاقتیں ہمارے حق کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ::

لیکن ایک دوسرا زاویہ بھی نہایت اہم ہے۔ جس کی طرف عام طور پر ہماری نظر نہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمیں قرآنی الفاظ :-

تُؤۡتِي ٱلۡمُلۡكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ ٱلۡمُلۡكَ مِمَّن تَشَآءُ[1] (سورۃ ۳ ال عمران۔آیت ۲۶)

پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے ::

یہ ظاہر ہے۔ کہ دُنیا میں مختلف قوموں کو مختلف ملکوں کی حکومتیں وقتاً فوقتاً ملتی بھی رہتی ہیں۔ اور پھر اُن سے چھنتی بھی رہتی ہیں۔ لیکن جس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس طرح ممالک کے ملنے اور چھننے میں قدرت کون سے اصول پر کاربند ہے؟

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اِس سلسلہ میں دو اصول کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی جب کوئی قوم کردار کے لحاظ سے گِر جاتی ہے۔ تو اُن سے بہتر قوم اُن پر حکمران کر دی جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے۔ تو قدرت اُس کی سازگار بن جاتی ہے۔ اور اس کی دستگیری کرنے لگ جاتی ہے ::

پاکستان کی تخلیق کے وقت ہمارا دعویٰ یہ تھا۔ کہ اِس ملک میں ایک ایسی حکومت کی تشکیل کی جائے گی۔ جو اسلام کے زریں اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہو گی :: اس بارہ میں اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ ہم نے کس حد تک اس عہد کو نبایا ہے؟

پہلے بیس بائیس سال تو مختلف قسم کی بدعنوانیوں میں گزر گئے۔ اب حالات کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں بھی ہم اگر صرف ایک بات کو اسلام کی کسوٹی تصور کر لیں۔ تو حالت کچھ کہنے کے بغیر ہی عیاں ہو جاتی ہے ::

اسلام کا حقیقی مقصد چونکہ صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان کا تعلق باللہ ہو جائے۔ لہٰذا نماز اسلام کا ایک اہم ترین ستون ہے :: اس پر صحیح معنوں میں کاربند ہونے کے معنی یہ ہیں۔ کہ اگر پاکستان میں اِس وقت بارہ کروڑ کی آبادی ہے۔

---

[1] جسے چاہے سلطنت دے۔ اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے ::

تو اس میں سے دو کروڑ بچے نکال دیجئے۔ باقی دس کروڑ مردوں اور عورتوں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنی چاہیئے ؛ لیکن آپ اب خود ہی اندازہ لگالیں۔ کہ اس وقت پانچ فی صدی مسلمان مرد اور عورتوں سے زیادہ اس فرض پر کاربند نہیں ہیں ؛ لہٰذا ہم دُنیا کو تو دھوکا دے سکتے ہیں۔ لیکن خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے ؛

قدرت ہمیں اسلام کے تمام احکام کی پابندی کے لحاظ سے پرکھ رہی ہے۔ وہ اس نہج سے نہیں پرکھ رہی۔ کہ کتنے گھروں میں بجلی لگ چکی ہے۔ اور کتنوں میں ابھی لگنی باقی ہے ؛

اگر قدرت کا اصول یہ ہو۔ کہ وہ " حوُر و قصوُر" کی نعمتوں کے بانٹنے میں " مسلم آئین " ہونے کی شرط کو مدِنظر رکھتی ہو۔ تو ہمیں بھی اُتنا ہی حصہ مل سکتا ہے۔ جتنے کے کہ ہم اہل ہیں!

لہٰذا اس وقت حقیقت یہ ہے۔ کہ نہ صرف ہمارا، بلکہ تمام دنیا کا ہر لمحہ و ہر لحظہ امتحان ہو رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ہر امتحان کے لئے ایک نصاب مقرر ہوتا ہے ؛ لیکن جس ایک نہایت ضروری بات کو ہم بالکل نظرانداز کر رہے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ غیر مسلم اقوام کے لئے نصاب قرآن و حدیث نہیں ہے۔ چونکہ اُن کا خاتم النبیینؐ کے ساتھ ابھی "تعارف" نہیں ہوا ؛ اگر اُن کے لئے بھی نصاب یہی ہوتا۔ تو دُنیا میں ایک چپّہ زمین بھی غیر مسلم اقوام کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔ بلکہ قدرت کا قانون یہ ہے۔ کہ جہاں تک غیر مسلم اقوام کا تعلق ہے۔ اُن کے لئے نصاب ہے۔ "اچھا شہری" ہونا ؛ لیکن مسلمانوں کے لئے نصاب محض "اچھے شہری" ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے لئے نصاب ہے۔ " محمدؐ سے وفا "!

اب جہاں تک "اچھے شہری" ہونے کا تعلق ہے۔ ہر قوم اپنے ماحول، گذشتہ تجربات اور ذہنی نشوونما کے مطابق "اچھے شہری" ہونے کے متعلق علیحدہ علیحدہ نظریے رکھتی ہے ؛ مثلاً رُوس کے نزدیک ایک ملک کے افراد "اچھے شہری" اُسی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اُن کے ملک کا نظامِ حکومت "کمیونزم" کے اصولوں کے ماتحت اُستوار ہو ؛ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے نزدیک "جمہوری نظام" کا ہونا ضروری ہے ؛ ہندوستان اپنے خصوصی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھتا ہے۔ کہ نہ صرف اس کا نظامِ حکومت جمہوری ہو۔ بلکہ وہ secular (دنیوی) بھی ہو ؛

لیکن اِن تمام قسم کے نظاموں میں قدرت صرف ایک بات کو مدِنظر رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی قوم کے "انصاف اور عدل" کا معیار کیا اور کیسا ہے ؟ قدرت کا یہ قانون اٹل ہے ؛

چنانچہ اگر اِس نظریے سے اپنے گرد و پیش دیکھا جائے۔ تو عجیب قسم کے انکشافات ہوتے ہیں ؛ مثلاً مُغلوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سال حکومت کی۔ اور انگریزوں نے دو سو سال کی۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ مُغلوں کے مقابلہ میں انگریزوں کا اپنی رعایا پر عدل ۴ گنا تھا! لہٰذا موخرالذکر دو سو سال کے بعد یہاں سے

رخصت ہو گئے ۔ اب اسی عدل کے اصول کے ماتحت تمام دنیا کی زمین مختلف اقوام میں بٹی ہوئی ہے ۔ جو قوم جس حد تک اس قانون پر صحیح اترتی ہے ۔ اُسی حد تک اُس کو کامرانی اور حکمرانی نصیب ہوتی ہے!

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۔ ان کے لئے نصاب محض "اچھے شہری" ہونا نہیں ہے ۔ بلکہ ان کا نصاب "محمدؐ سے وفا" ہے ۔ ہم اس اور صرف اسی "نصاب" کے لحاظ سے پرکھے جا رہے ہیں ۔ اس وقت تک ہم چونکہ اسلام کے اس نصاب کے مطابق پورے نہیں اُترے ۔ لہٰذا قدرت نے کشمیر اور فلسطین وغیرہ کے مسائل کو نہ صرف پیدا کر دیا ہے ۔ بلکہ جان بوجھ کر اُن کو اُلجھنوں میں بھی ڈال دیا ہے ۔ تاکہ معاملہ التواء میں رہ کر "معلق" رہے ۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے ۔ کہ یہ تمام جھمیلہ اس وقت دراصل "از ماست کہ بر ماست" کی تفسیر ہی ہے!

چنانچہ اگر ہم آخر کار اپنے "نصاب" کے مطابق پورے اترے ۔ پھر تو کشمیر کیا "لوح و قلم" ہمارے ہیں ۔ لیکن اگر ہم اس "وفا" کی حقیقت کو ہی نہ سمجھ سکے ۔ جس کی کہ ہم سے توقع کی جا رہی ہے ۔ تو پھر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے ۔ کہ ہم سے کوئی اور بہتر قوم اس "وفا" کی ڈیوٹی کو سنبھال لے گی اور ہم إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ[1] کی وعید سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے!

اسلام اور دوسرے مذاہب

اس وقت جب کہ ہم سلیم الفطرت غیر مسلموں کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اسلام کے مقابلہ میں ہم دوسرے مذاہب کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالیں ۔

حقیقت یہ ہے ۔ کہ دنیا کا کوئی آسمانی مذہب بھی ابتداءً غلط ثابت نہیں ہو سکتا ۔ چونکہ سب مذاہب کے بانی مبانی پیغمبران علیہم السلام تھے ۔ اور وہ حق کے بغیر کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتے ۔ البتہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مختلف مذاہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں غلط اعتقادات اور غلط قسم کی عبادات شامل کر لیں ۔ جن سے حقیقی مذہب مسخ ہو کر رہ گیا ۔

دوسرے مذاہب کی چھان بین کرنے سے پہلے اگر اسلام کی حالت پر ہی غور کیا جائے ۔ تو معلوم ہو جائے گا ۔ کہ یہ مذہب شروع میں کیا تھا ۔ اور اب کیا ہو کر رہ گیا ہے؟

رسول پاکؐ اور صحابہ کرام کی زندگیوں کو اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے ۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اُن کے نزدیک مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" تھا ۔ محض "نیک ہونا" نہیں تھا ۔ اور اُس کے نتیجہ کے طور پر اُنہوں نے جس

---

[1] سورۃ ۸۵ البروج ۔ آیت ۱۲ ۔ بیشک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے ۔

Marfat.com

طرف رُخ کیا۔ کامیابی نے اُن کے قدم چُومے! یہاں تک کہ "یاساریۃ الجبل" اور سے "بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" والے واقعات اُن کے بائیں ہاتھ کے کرتب تھے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کائنات کی ہر چیز اُن کے لئے رُوحانی طور پر مسخّر تھی! اسی طرح اولیائے کرام سے جو کرامات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اُن سے بھی اسی بات کا ثبوت ملتا ہے!

اب اسلام کی موجودہ حالت پر نظر ڈالیئے: جیسا کہ ان صفحات میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔ آج کل کے وعظوں میں زور صرف اس بات پر دیا جاتا ہے۔ کہ ایک انسان خدا اور رسول پر ایمان لائے۔ نیک اعمال کرے۔ اور نجات حاصل کرے: جہاں تک خدا رسیدگی یا کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کا تعلق ہے۔ آج کل کے وعظوں میں عام طور پر ان کے بارہ میں ذکر تک نہیں ہوتا۔ اور اس ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اب یہ بات ممکنات میں سے سمجھی ہی نہیں جاتی۔ کہ خدا رسیدہ لوگوں میں کوئی غیر معمولی طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔ یا یہ ہستیاں کسی کی ظلمت و ضلالت کو دُور کر سکتی ہیں۔ یا کائنات کی کوئی قوت اُن کے تابع ہو سکتی ہے: گویا اسلام کے آج کل کے نام نہاد فرقوں کے عقیدے کے مُطابق' ایک انسان رُوحانی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ "عطّار" ہی بن سکتا ہے۔ "طبیب" بننا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں: (دیکھیں صفحات ۱۰۵-۱۰۶)

اس قسم کا عقیدہ پھر اس بات پر مُنتج ہؤا۔ کہ بعض لوگوں نے معجزوں سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا: چنانچہ ایک مسلک والوں نے ہر معجزہ کی تاویل کی! اس سے اگلا قدم یہ تھا۔ کہ موجودہ مغربی تہذیب کو سراہا جائے۔ چنانچہ ایک دوسرے مسلک والوں نے "ایک قرآن" کے "دو قرآن" بنا دئے!

یہی ذہنیت پھر اس بات کی محرک ہوئی۔ کہ ایک تیسرے مسلک والوں کے نزدیک نہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ نہ وہ آسمان پر گئے۔ اور نہ اُن کے واپس آنے کا کوئی امکان ہے!

ان تمام باتوں کے نتیجہ کے طور پر ایک چوتھے مسلک والوں نے نہ صرف حدیثوں سے انکار کیا۔ بلکہ ہر مادی ایجاد کے مُوجد کو حقیقی "ولی" سمجھا! (دیکھیں صفحہ ۹۲)

اب جہاں تک ان تمام مسالک کے علماء کا تعلق ہے۔ اُن کی غلطی تو صرف اس بات میں رہی۔ کہ اگر اسلام کی تعلیم (مثال کے طور پر) ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے مترادف تھی۔ انہوں نے اسلام کی تعلیم کو محض پانچویں جماعت تک محدود سمجھا: گویا وہ "ابتدائی" اسلام کی حیثیت تک تو پہنچے۔ لیکن "عرفانی" اسلام کے راز کو نہ پا سکے:

اور جہاں تک انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا تعلق ہے وہ صرف سے دل میں لندن کی ہوس لب پہ نرے ذکرِ حجاز کی تفسیر بن کر رہ گئے!

Marfat.com

اب یہ اُس مذہب کا حال ہے۔ جس کو دُنیا میں آئے ہوئے صرف چودہ سَو سال ہوئے ہیں :۔
لیکن جن مذاہب کی عمر دو تین یا چار ہزار سال ہے۔ اگر وہ اب مسخ شدہ معلوم ہوں۔ تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے ؟

اِس سلسلہ میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (پاکستان) نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام "اسلام اُور مذاہب عالم" ہے :۔ اس کے پڑھنے سے ایک سلیم الفطرت انسان پر پہلے تو یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ دنیا کے تمام الہامی مذاہب ابتداءً بالکل سچے تھے۔ اور پھر یہ بھی عیاں ہوتا ہے۔ کہ صدیاں گزرنے کے بعد اَب وہ مذاہب کیا ہو کر رہ گئے ہیں ؟

چونکہ یہ مسئلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں اب کچھ تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے :۔
مندرجہ بالا کتاب کا مصنّف پہلے ہندو مذہب کو لیتا ہے۔ اَور اُس کے بارہ میں یُوں رقمطراز ہے :۔
"ہندو ذہن اصلاً مفکرانہ ہے۔ وہ محسوس تجربات سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس کا بنیادی تصوّر یہ ہے۔ کہ تمام اشیاء اَور موجودات ایک ایسی طاقت کی مظہر ہیں۔ جو اُن سے بالکل ماوراء ہے" :۔ (صفحہ ۲۵)
"برہمنوں نے ہندو مذہب .... میں نجات (مُکتی) کا دارومدار اس امر پر رکھا۔ کہ انسان ذاتِ الٰہی کا مکمل عرفان حاصل کرے" :۔ (صفحہ ۲۵)
"بھگوت گیتا میں خدا کا جو تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ اُس کی رُو سے خدا ایک ذی شعور، ابدی اَور توانا ہستی ہے جو اَزل سے موجود تھی۔ وہ نہ صرف اِس عالمِ فانی سے ممیّز ہے۔ بلکہ انسانوں کی لافانی رُوح سے بھی اُس کی ہستی بالکل جُدا ہے" :۔ (صفحہ ۲۱) :۔
"کرشن کا مذہب عقیدۂ توحید پر مبنی تھا۔ اَور اُس میں اخلاقیات پر زور دیا گیا تھا :" (صفحہ ۲۰) :۔
"ویدانت کا بنیادی نظریہ یہ ہے۔ کہ .... برہمن (خدا) کی ذات ابدی اَور لامحدود ہے۔ اَور اُسی کی طاقت تمام اشیاء میں کام کر رہی ہے :" (صفحہ ۱۳) :۔ گویا "ویدانت میں برہمن (خدا) کا ہمہ اوستی نظریہ پیش کیا گیا ہے :" (صفحہ ۱۲) :۔
"ویدوں کے راگوں میں وحدانیت کا تصوّر بھی موجود ہے .... اپنشاد میں یہی عقیدہ برہما کی صورت میں موجود ہے۔ کیونکہ برہما کو روحِ عالم یا ہستیٔ مطلق قرار دیا گیا ہے" :۔ (صفحہ ۱۱) :۔
"بدھ مت نے پہلی مرتبہ یہ عقیدہ پیش کیا کہ انسان اسی دُنیا اَور اسی زندگی میں نیک اعمال کے ذریعہ نجات پاسکتا ہے" :۔ (صفحہ ۱۸) :۔

Marfat.com

"مہاتما بدھ کی تعلیم میں خدا کا ذکر نہیں"...... (صفحہ ۳۶) ؛ لیکن اس کے باوجود "یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا - کہ مہاتما بدھ نے خدا کا انکار کیا - یا کہ انہوں نے مادہ کو کائنات کی بنیاد قرار دیا" ؛ (صفحہ ۳۷) ؛

"بدھ مت کے مہایانا فرقہ میں جو خدا کا تصور آراستہ کیا گیا ہے - وہ گوتم بدھ کے مقاصد اور ذہنی رجحان کا پوری طرح آئینہ دار ہے" ؛ (صفحہ ۳۸) ؛ اس فرقہ کے "نظریات نہ تو دہریت پر مبنی ہیں - اور نہ تشکیک پر - بلکہ خدا کے یقین پر"........ "جو تمام ذیلی طاقتوں پر مافوق اور کائنات کا خالق ہے" ؛ (صفحہ ۳۸) ؛

"مہایانہ بدھ مت ابتدا سے توحیدی مذہب تھا" ؛ (صفحہ ۴۰) ؛ -- "اس نے ایک حقیقتِ اعلیٰ کا تصور پیدا کیا - جس سے عالم ظہور میں آیا" ؛ (صفحہ ۴۴) ؛

"مہایانہ بدھ مت میں بعض ذیلی فرقے بھی پیدا ہوئے........ مثلاً ایک فرقہ مراقبہ کو اصل دین سمجھتا ہے - اس کے نزدیک معرفت، علم - مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی - بلکہ وہ زندگی میں کسی وقت اچانک قلب پر جلوہ ریز ہوتی ہے" ؛ (صفحہ ۴۵) ؛

ان اقتباسات سے واضح ہوگیا ہوگا - کہ ہندو مذہب کی اصلیت کیا ہے ؟ لیکن جس طرح اوپر اسلام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے - کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے - اور اب وہ کس حالت پر پہنچ گیا ہے - بالکل اسی طرح جب ہندو مذہب کی مسخ شدہ صورت پر نظر ڈالتے ہیں - تو پھر ہمارے سامنے جو تصویر آتی ہے - وہ اس قسم کی ہے :-

"برہمنا کے عہد میں سب سے زیادہ اہم عقیدہ جو ہندو مت میں داخل ہوا - تناسخ کا عقیدہ تھا - ویدوں میں یہ عقیدہ کہیں نہیں ملتا - اس کے برعکس ان کتابوں میں بقائے شخصی کا عقیدہ نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے یعنی موت کے بعد انسان کی روح باقی رہتی ہے - اور اسے دنیا میں نہیں آنا پڑتا - لیکن ست پت برہمنا میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مذہبی رسوم کو پورے طور پر ادا نہیں کرتے - انہیں ایک مدت کے بعد پھر دنیا میں آنا پڑتا ہے" ؛ (صفحات ۱۶-۱۷)

ہندو مذہب کا آغاز ویدوں کے عہد سے ہوتا ہے - جن کا زمانہ سنہ ۱۵۰۰ ق م کا تھا - جب ہندو آریا پہلے پہل ہندوستان داخل ہوئے - تو ان کے مذہبی تصورات نہایت سادہ تھے - انہیں تصورات کو ویدوں میں مدون کیا گیا ہے - لیکن اس کے بعد جو زمانہ آیا - اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (یعنی برہمنوں) کی مذہبی سیادت قائم ہوگئی تھی - اور انہوں نے اپنی سیادت کے جواز میں جو مذہبی کتابیں ترتیب دیں - انہیں برہمنا کہا جاتا ہے ؛ برہمنا کا بدھ مت اور جین مت کی کتابوں سے مقابلہ کیا جائے - تو معلوم ہوگا - کہ ان میں واقعات و حالات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے" ؛ (صفحہ ۹) ؛

جب حالات نے یہ رُخ اختیار کر لیا۔ اُس وقت تک " ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اپنے دیوتاؤں اور معبودوں کو محسوس شکل میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی" ؛ (صفحہ ۱۸) ؛

" نئی برہمنیت کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ اُس نے ہندوؤں کے مراسم وعبادات اور سماجی اطوار وعادات کو باقاعدہ شکل میں مرتب کیا۔ یہ قانونی کتب دھرم شاستر کہلاتی ہیں۔ ان میں منو دھرم شاستر سب سے زیادہ مشہور ہے" ؛ (صفحہ ۱۹) ؛ .... اس میں احترامِ برہمن دھرم کا ایک اہم جزو ہے۔ جو شخص برہمن کی بے عزتی کرے۔ یا اُسے دُکھ پہنچائے۔ اُس کو دوزخ کی سزا کا مستحق گردانا گیا ہے[1] ؛ (صفحہ ۲۰) ؛

" اس زمانہ میں ہندومت ایک مشرکانہ اور کثرت پرستانہ مذہب تھا (صفحہ ۲۷) ؛

" ویدک مذہب میں مادی خواہشات کی تسکین کو مقصودِ حیات قرار دیا گیا تھا......... جُوں جُوں ہندوستانی ذہن میں کرما اور تناسخ کے عقیدے جڑ پکڑتے گئے۔ جنت اور دوزخ کے تصور میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ چنانچہ اب اُنہیں عارضی مقامات سمجھا جاتا ہے۔ جہاں سے رُوح پھر دُنیا میں ایک نئے جسم کے ساتھ واپس ہوتی ہے ؛ (صفحہ ۳۵) ؛

غرض ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہندو مذہب حقیقت میں کیا تھا۔ اور جب وہ مسخ ہوا۔ تو پھر اُس نے کیا صورت اختیار کی ؟

اب زرتشت مذہب کو لیجئے ؛ " زردشت نے ہندو ایرانی قوم کو مظاہرِ فطرت کی پرستش سے نکال کر وحدانیت کی تعلیم دی" ؛ (صفحہ ۵۰) ؛

" زردشت نے انسان کو ایک معبودِ حقیقی کی طرف بلایا۔ اُس کا نام خالقِ اکبر تھا۔ اُس کی صفات تعداد میں چھ تھیں" ؛ .... سب سے زیادہ ممتاز یہ ہیں۔ آشا (راستی۔ صداقت)۔ واہومانا (نیک خیالات)۔ آرامیتی (تقویٰ) ...." (صفحہ ۵۱) ؛

" زردشت پہلا مصلح تھا۔ جس نے وحدانیت کو سحر اور نجوم سے پاک کر کے بالکل خالص اور بے آمیزش شکل میں پیش کیا" ؛ (صفحہ ۵۱) ؛

" زردشت کے نزدیک اچھے انسان موت کے بعد ایک ایسی زندگی میں داخل ہوں گے۔ جن میں نیک اعمال اور اچھے خیالات کا چلن ہو گا.......... اس کے برعکس بُرے انسان مرنے کے بعد نہ صرف بُرے اعمال وخیالات سے

---

[1] معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرانے زمانہ کے سچے برہمنوں کی حقیقت وہی تھی۔ جو اسلام میں اولیائے کرام کی ہے!

Marfat.com

دو چار ہوں گے۔ بلکہ انہیں جسمانی سزا بھی ملے گی" ؛ (صفحہ ۵۲) ؛

اب زردشت کی مسخ شدہ حالت دیکھئے ؛ "اس میں سگے رشتوں میں باہمی ازدواج کو مستحسن قرار دیا گیا ہے" ؛ (صفحہ ۵۵) ؛

"زردشت کی وفات کے بعد اس کی مذہبی تحریک بہت جلد ملیامیٹ ہو گئی۔ مظاہر فطرت اور قدیم دیوتاؤں کی پرستش کا طریقہ پھر رائج ہو گیا" ؛ (صفحہ ۵۵) ؛

اب مجوسی مذہب کو لیجئے ؛ "مجوسی تصورات کی رُو سے کائنات ایک شطرنج کی بساط ہے۔ جس میں بادشاہ ظلمت، نور کی ہر چال کا جواب دیتا ہے۔ اور اچھائی کے ہر مہرے کے بالمقابل برائی کا ایک مہرہ موجود ہوتا ہے ؛" (صفحہ ۴۸) ؛

"لیکن زردشتی تعلیمات کا مجوسیوں پر یہ اثر ہوا۔ کہ وہ بھی نور کی طاقت کو بالادست قرار دینے لگے۔ اور اس امر کا یقین کرنے لگے۔ کہ آخری کامیابی نور کو ہوگی ؛" (صفحہ ۴۸) ؛

"معلوم ہوتا ہے۔ زردشت کی کامیابی کے بعد مجوسیوں نے اپنی تبلیغی جدوجہد کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دی۔ اور بہتر حالات کا انتظار کرتے رہے ؛ عوام نے پھر مجوسیوں کو اپنا مذہبی پیشوا مان لیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد اعلیٰ طبقات بھی اُن کے زیر اثر آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مجوسیوں کی قیادت میں زردشتی مذہب کے اندر قدیم طرز پرستش اور قدیم دیوتا پھر داخل ہو گئے .... اور اناہیتا (پانی کی دیوی) کی عبادت پھر سے شروع ہو گئی ؛ .... اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہی خاندان کے افراد اور درباری اُمرا پھر بُت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ؛ جہاں تک مذہبی رسوم کا تعلق ہے۔ زردشت کے بعد جادو۔ منتر۔ اور ستارہ شناسی کا رواج دوبارہ شروع ہو گیا ؛" (صفحہ ۵۶) ؛

"زردشت کی وحدانیت اب یہاں تک بگڑ گئی۔ کہ خود اہورا مزدا (خالق خیر) فرشتوں کی عبادت کرتا ہے ؛ .... خدا اور اس کی مخلوقات دونو کو معبودیت کا یکساں درجہ حاصل ہو گیا ؛" (صفحہ ۵۷) ؛

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجوسی صرف تھوڑی مدت کے لئے حقانیت کی طرف مائل رہے۔ بعد میں بہت جلد بُت پرست ہو گئے ؛

اب یہودی مذہب کو لیجئے ؛ اس "مذہب کی بنیاد دو عقیدوں پر ہے۔ اولاً خدا کی وحدانیت۔ دوم

Marfat.com

اسرائیل کے ساتھ خدا کا مخصوص تعلق ؛ یہودی عقیدہ کی رُو سے عالم کائناتِ خیر ہے۔ اور انسان حصولِ خیر کا پورا پورا اہل ہے ؛ یہودی اس امر پر ایمان رکھتے ہیں۔ کہ انسان اپنے افعال کا مختار اور ذمہ دار ہے ؛ وہ ایمان کی نسبت اعمال کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں ؛ اس طرح یہودیت ایک عقیدہ ہی نہیں۔ بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ جو ہر عملِ انسانی کو رضائے الٰہی کا تابع بنانا چاہتا ہے........ روزمرہ کی گفتگو میں ایک معمولی سا مبالغہ یا ادنیٰ سی دل آزاری بھی یہودیوں کے نزدیک ایک عظیم ترین گناہ کی موجب ہو سکتی ہے ؛ یہودیوں کے لئے مذہباً ممنوع ہے۔ کہ وہ فحش کلامی کا ارتکاب کریں۔ یا کسی کو اشتعال دلائیں۔ یا کسی کمزور اور لاچار آدمی کے سامنے غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کریں......... ہر یہودی پر یہ فرض ہے۔ کہ وہ دن میں تین بار نماز ادا کرے۔ کھانے سے پہلے دعائے شکر نہ پڑھے۔ زندگی کی ہر لذت و مسرت پر اظہارِ تشکر کرے ؛ ہر روز کتابِ مقدس کی کچھ آیات تلاوت کرے۔ اور صبح کی نماز کے وقت خاص لباس میں ملبوس ہو ؛" (صفحہ ۶۷- ۶۸) ؛

"یہودیت تبلیغ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی ؛ کسی یہودی کے لئے مذہباً مستحسن نہیں۔ کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے پیرودں کو یہودیت کی دعوت دے۔ بلکہ اگر کوئی شخص یہودیت کی طرف میلان ظاہر کرے۔ تو یہ ضروری ہے۔ کہ اُس پر یہودی رسوم و شعائر کی مشکلات واضح کر دی جائیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ یہودیت قبول کرنے پر مُصر ہو۔ تو اُسے یہودی مذہب میں داخل کیا جا سکتا ہے ؛" (صفحہ ۶۸) ؛

"یہودیت کو کسی حکومت یا اُس کی ہیئت ترکیبی سے کوئی تعرض نہیں۔ یہودی عبادت گاہوں میں اُس ملک کی سلامتی کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔ جہاں یہودی عبادت کے لئے جمع ہوں ؛ یروشلم کے قدیم معبد میں رُومی حکومت کے لئے دُعائیں کی جاتی تھیں ؛" (صفحہ ۶۸) ؛

"بنی اسرائیل کی مذہبی تاریخ کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوا۔ جب کہ اسرائیل (شمالی سلطنت) کے فرمانروا اومری نے ٹائر کی سلطنت سے تعلقات قائم کئے۔ اور اپنے فرزند کی شادی فرمانروائے ٹائر کی لڑکی سے کی ؛ اس وقت تک یہواہ (خدا) ہی اسرائیل کا واحد معبود تھا۔ لیکن اب ٹائر کے معبد بعل کی پرستش رائج کرنے کی کوشش شروع کی گئی ؛" (صفحہ ۸۱) ؛

"اس فتنہ کے خلاف بنی اسرائیل کے دو نبیوں الیعا اور الیشیا نے زبردست تحریک شروع کی۔ اور بالآخر اُنہوں نے ایک سپہ سالار جیہو کی مدد سے اومری خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس طرح یہواہ (خدا) کی عبادت از سرِ نو قائم ہوئی ؛" (صفحہ ۸۱) ؛

"آٹھویں صدی کے دوران میں شمالی سلطنت (اسرائیل) میں مذہبی اصلاح کا کام از سرِ نو شروع ہوا ؛ ظاہری اعتبار سے اس زمانہ کے حالات اچھے تھے ؛ آرامی لڑائیوں کا خونریز سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اور جرو بوم ثانی

Marfat.com

کے تحت اسرائیل کی حدود میں بھی توسیع ہوئی تھی ؛ اس میں کوئی شک نہیں ۔ کہ ان فتوحات کے باعث یہوواہ (خدا) کی کارسازی کا عقیدہ اور زیادہ پختہ ہوگیا ۔ اور لوگوں کے اندر بے انتہا مذہبی جوش و خروش نمایاں تھا ۔ لیکن اس کا ایک خطرناک پہلو بھی تھا ۔ اور وہ یہ کہ مذہبی جوش میں عوام اور اعلیٰ طبقات اخلاقی تقاضوں کو فراموش کرتے جا رہے تھے ؛ اومری خاندان کے تحت تجارت میں بڑی ترقی ہوئی تھی .... اور باشندگان اسرائیل کی دولت و فراغت میں بے انتہا اضافہ عمل میں آیا ۔ جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اُن میں بہت سی اخلاقی بُرائیاں پیدا ہوگئیں ؛ (صفحہ ۸۲) ؛ .... یہودیوں کے اکثر معبدوں میں حرام کاری کو مذہبی تقدس حاصل ہوگیا تھا ۔ اور یہوواہ (خدا) کے نام پر سب کچھ کیا جاتا تھا ۔ جو بعل کے پرستار کیا کرتے تھے ؛" (صفحہ ۸۳) ؛

"یہی زمانہ تھا ۔ جب کہ عاموس نبی نے اپنی اصلاحی تبلیغ شروع کی ؛ عاموس نے لوگوں کو آنے والے عذاب سے ڈرایا ۔ جو کہ آشوری طاقت کے روز افزوں خطرہ کی صورت اختیار کر رہا تھا ؛ اُنہوں نے لوگوں کو آگاہ کیا ۔ کہ یہوواہ (خدا) کو اُن کے جانوروں کے گوشت پوست کی حاجت نہیں ۔ جس سے اُس کی خوشنودی حاصل کی جا سکے ؛ اُنہوں نے یہود کو بتایا ۔ کہ تمہارے آباؤ اجداد بھی یہوواہ (خدا) کے پرستار تھے ۔ لیکن اُن کے یہاں قربانی کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ؛" (صفحہ ۸۳) ؛

"اسی زمانہ میں شمالی سلطنت (اسرائیل) میں ایک اور یہودی نبی نمودار ہوئے ۔ اُن کا نام ہوشع تھا" ...... اُنہوں نے بُت پرستی کے خلاف آواز اُٹھائی ۔ اور اُسے مذہباً ممنوع قرار دیا ؛" (صفحہ ۸۳) ؛

"بہر حال اب وقت آگیا تھا ۔ کہ ان دونوں نبیوں کی پیش گوئیاں پایۂ تکمیل کو پہنچیں ۔ چنانچہ ۷۲۴ ق م میں آشوری فرمانروا تگلاتھ پلیسر نے اسرائیل پر حملہ کر کے یہودیوں کی شمالی سلطنت کا خاتمہ کر دیا ؛" (صفحہ ۸۳) ؛ .... حملہ آوروں نے اُن کے بتوں کو اُٹھا کر اپنے قبضہ میں لے لیا ۔ اس سے بالواسطہ مصلحین اور نبیوں کی مساعی کو فائدہ ہؤا ؛" (صفحہ ۸۴) ؛

"لیکن یہ مذہبی اصلاحات دیرپا ثابت نہ ہو سکیں ۔ اور حزقیاہ کی وفات کے بعد ان کے خلاف زبردست ردِ عمل شروع ہوگیا ۔ نہ صرف قدیم توہمات کا از سر نو احیا ہؤا ۔ بلکہ آشوری عہدہ داروں نے بہت سے جدید بُت پرستانہ اور مشرکانہ عقائد کو رواج دیا ؛" (صفحہ ۸۵) ؛

"آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہؤا ۔ کہ بخت نصر نے کلدانی افواج کو یروشلم کی تسخیر کے لئے روانہ کیا ۔ تین ماہ کے اندر اندر یہودیوں کو ان حملہ آوروں کے ہاتھ کامل شکست اُٹھانی پڑی ۔ اور جودیا کی یہودی سلطنت صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئی ؛" (صفحہ ۸۹) ؛ .... شاہی محل اور یروشلم کے معبد کو بالکل نہس نہس کر کے یہود کو بالکل بے دست و پا کر دیا ؛ یہودیوں کے باقی امرا اور کاہنوں کو بھی بابل میں جلا وطن کر دیا گیا ؛" (صفحہ ۸۹) ؛

Marfat.com

"یروشلم کی تباہی اور جوڈیا کے خاتمے کا یہودیوں کے قومی اتحاد پر خوشگوار اثر ہوا ۔ .... نئے حالات میں یہودی مصلحین نے قومی اتحاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی ۔ کہ صرف یروشلم کو یہودیوں کی واحد قومی عبادت گاہ قرار دیا جائے ۔" (صفحہ ۸۹) ۔

"بابل کی جلاوطنی اور پھر یروشلم کی واپسی کے دوران میں یہودی مذہب فلسطین سے نکل کر بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکا تھا ۔ خدا کی وحدانیت کا اعتقاد جو یہودیوں میں ابتدا ہی سے موجود تھا ۔ اب اور زیادہ پختہ ہو گیا ۔ بعل کی پرستش اور دیگر بت پرستانہ مراسم یہودیوں میں پھر کبھی نہ ابھر سکیں ۔ لیکن جلاوطنی کے زمانہ میں یہودی علماء بعض ایسے مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ جن کا اس سے قبل اُن کے ذہن میں کوئی وجود نہ تھا ۔ مثلاً گناہ کی حقیقت کیا ہے ؟ دنیوی مصائب کے اسباب کیا ہیں ؟ اور شر کا وجود کیسے شروع ہوا ؟ (صفحہ ۹۱) ۔ .... اس کی وجہ یہ نہ تھی ۔ کہ یہود" اپنے حکمرانوں کے مذہبی اعتقادات سے مرعوب تھے ۔ بلکہ اخلاقی بلندی کی خواہش اور صداقت کی جستجو اس میلانِ فکر کی حقیقی محرک تھی ۔" (صفحہ ۹۱) ۔ لیکن آہستہ آہستہ "یہودیوں میں عبادات کی نسبت قانون کے درس و تدریس کا زیادہ شغف پیدا ہو گیا ۔ .... لوگ قانون کی لفظی تشریح اور منطقی توجیح سے زیادہ اُس کی لفظی پابندی کو ضروری سمجھتے" ۔ ...... چنانچہ جسم کی پاکیزگی کی خاطر "یہ لوگ اکثر غسل کرتے ۔ بار بار اپنے کپڑوں کو دھوتے ۔ ...... وہ اُن یہودیوں اور غیر یہودیوں سے بھی دُور رہتے ۔ جو مذہبی قوانین کے پابند نہ تھے ...... ان لوگوں کی رسمی دینداری اور ظواہر پرستی نے دینِ موسوی کو اتنا کٹھن بنا دیا ۔ کہ دیگر اقوام کے جو لوگ بت پرستی سے بیزار ہو کر یہودی مذہب اختیار کرنا چاہتے تھے ۔ اُن کے لئے تبدیلِ مذہب کا تصور نہایت ہیبت ناک ہو گیا ۔ اور وہ ایسا دین اختیار کرنے کی بجائے ۔ جو زندگی کی تمام تفصیلات و فروعات میں انسانی آزادی کا مخالف تھا ۔ اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے ۔" (صفحہ ۱۲۳) ۔

"مذہبی رسوم و شعائر کو یہودیوں کے یہاں انسانی ہمدردی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی ۔ اور بعض مذہبی قواعد ایسے بھی تھے ۔ جن سے اس کام میں دشواریاں پیدا ہوتی تھیں ۔ مثلاً دیندار یہودی، لوگوں سے ملنے جلنے میں بہت محتاط تھے ۔ اور ہر شخص اور ہر طبقہ سے ملتے جلتے ہوئے جھجکتے تھے ۔ سبت کے دن وہ کوئی کام کرنا خلافِ مذہب سمجھتے تھے ۔ خواہ بیماروں کی عیادت ہو ۔ یا خلق کی بھلائی کا اور کام ۔" (صفحہ ۱۱۹) ۔

"ظہورِ عیسائیت کے وقت یہودی قوم منتشر ہو چکی تھی ۔" (صفحہ ۱۲۵) .... "مادی اسباب و حالات کے لحاظ سے اِس امر کا کوئی امکان نہ تھا ۔ کہ یہود پھر کبھی آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے ۔ یا غیر ملکی فرمانرواؤں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کریں گے ۔ اس لئے قدرتاً اُن کی اُمیدیں مستقبل پر مرتکز تھیں ۔" (صفحہ ۱۲۵) ۔ "اُن کے خیال میں وہ وقت قریب آ رہا تھا ۔ جب کہ ظالمانہ بیرونی سلطنت

Marfat.com

کا خاتمہ ہو جائے گا ؛" (صفحہ ۱۲۵) ؛

"اب اِس عقیدہ کی صورت یہ ہوگئی ۔ کہ ایک نجات دہندہ آئے گا ۔ جو .... دنیا بھر میں امن و خوشحالی اور عالمگیر اخوت قائم کر دے گا ؛" (صفحہ ۹۴) ؛

"یہ وہی موعودہ سلطنت ہوگی ۔ جس کا وعدہ ابراہیمؑ اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا تھا ...... جب یہ اعجازی کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا ۔ تو وہ تمام اسرائیلی افراد زندہ ہو جائیں گے ۔ جنہوں نے بیرونی سلطنتوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے جان دی تھی ۔ اس طرح ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان معرضِ وجود میں آئے گا ...." (صفحہ ۱۲۶) ؛

ان اقتباسات سے یہودی مذہب کی تاریخ کا ایک ہلکا سا خاکہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ عیسائیت کے ظہور سے پہلے پہلے اِس مذہب کی کیفیت کیا تھی ؟

اب عیسائی مذہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے ؛

"شہنشاہ طابیریس کے عہدِ حکومت کے پندرھویں سال یحییٰؑ نے اپنی رہبانیت کے دائرہ سے قدم نکالا ۔ اور ایک رُوحانی پیغام کی اشاعت شروع کی ؛ انہوں نے لوگوں کو خبردار کیا ۔ کہ مسیح (نجات دہندہ) کی آمد قریب ہے ۔ اور آسمانی بادشاہت کا عہد شروع ہونے والا ہے ۔ لیکن اس بادشاہت میں یہودی اور غیر یہودی کا کوئی امتیاز نہ ہوگا ۔ لوگوں کو صرف اُن کے اعمال کی بنا پر جانچا جائے گا ؛ جن کے اعمال اچھے ہوں گے ۔ اُنہیں بادشاہت میں حصّہ ملے گا ۔ لیکن بدکرداروں کو اُس میں سے بالکل خارج کر دیا جائے گا ؛ یحییٰؑ نے لوگوں کو دریائے یردن کے کنارے اپنی خانقاہ میں جمع ہونے کی دعوت دی ۔ تاکہ وہ یہاں اپنے گناہوں سے توبہ کریں ۔ اور دریا کے پانی میں بپتسمہ حاصل کر کے گناہوں سے پاک و صاف ہو جائیں ؛ جوڈیا اور یروشلم کے ہزاروں لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ؛ یحییٰؑ نے اُن کی توبہ قبول کی ۔ اور اُن کو گناہوں سے پاک کیا ؛ جب ان تائبین نے یحییٰؑ سے عملی ہدایات کا سوال کیا ۔ تو یحییٰؑ نے اُنہیں ایمانداری ۔ انصاف اور برادرانہ سلوک کی تلقین کی ؛ اس تعلیم میں کوئی نئی بات نہ تھی ! اس سے پہلے بھی پیغمبروں نے اِسی قسم کی ہدایات دی تھیں ۔ اور قانون کے مقابلہ میں اخلاقی اقدار پر زور دیا تھا ۔ یحییٰؑ نے بھی وہی بات کہی ۔ کہ رسوم و شعائر اور ظواہر کے اعتبار سے اُن کی دینداری میں کوئی نقص نہیں ۔ لیکن اُن کی اخلاقیات خراب ہے ۔ اور اُن میں انسانی ہمدردی ۔ اخوت اور عدل و مساوات کا جذبہ مفقود ہے ؛"

اُس نئی تعلیم کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا گیا ؛ مسیح کی آمد کے بارے میں لوگوں کو جو توقعات

Marfat.com

تھیں۔ اُن میں ایک غیر معمولی ایقان پیدا ہو گیا۔ لاکھوں افراد بپتسمہ حاصل کرنے پر دوڑ آئے۔ یہ خبریں گلیلی بھی پہنچیں۔ اور یہاں کے زائرین میں حضرت عیسیٰؑ بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے بھی دوسروں کی طرح یردن میں بپتسمہ لیا۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلے تھے۔ اس وقت سے یہ خیال اُن کے دماغ پر طاری تھا۔ کہ یحییٰؑ کی طرح اُنہیں اپنے مشن کا آغاز کرنا چاہیئے۔ اور بہت ممکن ہے۔ اُن کی ماموری کا وقت آ گیا ہو۔ جب کہ وہ یحییٰؑ سے بپتسمہ لے رہے تھے ؛ اُن کے دل پر ایک گہری الہامی کیفیت طاری ہو گئی ؛ اُن کا یہ احساس یقین کے درجہ کو پہنچ گیا۔ کہ وہ عنایتِ الٰہی کے مورد خاص ہیں۔ اور اب اُنہیں ایک بڑی خدمت تفویض کی جانے والی ہے ؛ وہ انسانیت کی ایک عظیم نجات کا واسطہ بننے والے ہیں ؛ تجرّد اور تنہائی کے ایک مختصر عرصہ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ خدا کی طرف سے ایک نئے مشن پر مامور ہیں ؛ اب وہ پیغمبرانہ حیثیت میں آگے آتے ہیں۔ اور یحییٰؑ کے پیروؤں میں نہیں رہتے ؛" (صفحہ ۱۲۷-۱۲۸) ؛

"حضرت عیسیٰؑ کو غریبوں، مظلوموں اور پسماندہ افراد کے ساتھ بڑی محبت تھی . . . . حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں کی ظاہری مذہبی قیود کی پابندیوں کی کوئی پرواہ نہ کی ؛ انہوں نے سبت کے موسوی تصور کا احیا اس طرح کیا۔ کہ یہ دن مظلوم اور بدحال انسانوں کی خدمت کا دن ہے ؛ جب اُن کے پیروؤں نے سبت کے دن ایک باغ کے پھل توڑ کر کھا لیے۔ تو حضرت عیسیٰؑ نے اُن سے کوئی باز پُرس نہ کی ؛ اسی طرح ایک موقعہ پر سبت کے دن وہ ایک صومعہ میں وعظ کہہ رہے تھے۔ کہ ایک جذامی شخص اُن کے پاس آیا۔ اُنہوں نے مذہبی پابندیوں کا خیال کئے بغیر اُسے اچھا کر دیا۔ اس واقعہ سے فریسیوں کو طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ؛ عیسیٰؑ کی تمام تعلیمات اُن کے ظاہری پارسائی کے خلاف جا رہی تھیں ؛ دیندار طبقوں اور بالخصوص فریسیوں کا خیال تھا۔ کہ آسمانی بادشاہت میں قوانین مذہبی کی مکمل پیروی ہو گی۔ لیکن یہ رُوحانی معلم مذہب کی تفصیلی ضوابط کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس لئے فریسیوں نے رومی حکام کے سامنے اس کو نیچا دکھانا ضرور خیال کیا ؛" (صفحہ ۱۲۹-۱۳۰) ؛

"مختصراً عیسیٰؑ کا پیغام، پیغامِ محبّت تھا۔ اور آپ کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ تھا۔ کہ محبّت اچھے کردار کی صرف ایک صفت نہیں۔ بلکہ کردار کی بنیاد اور اُس کا محرّکِ اعلیٰ ہے ؛ اگر انسان کے دل میں دوسروں کے ساتھ محبّت کا جذبہ نہ ہو۔ تو اُس کی ساری مذہبیّت بیکار ہے ؛ آپ جہاں جاتے۔ آپ کی حُبِ انسانیت، مذہبی۔ معاشرتی پابندیوں کو ٹکرا کر توڑ دیتی ؛ سبت کے قواعد۔ دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے ضوابط۔ کھانے پینے کے مسلمہ اوضاع و اطوار۔ اور عبادت اور پرستش کے موروثی اشکال، غرضیکہ کوئی رسمی پابندی ایسی نہ تھی۔ جس کی آپ نے خلاف ورزی نہ کی ہو ؛" (صفحہ ۱۳۱) ؛

"یہ تعلیم ایسی نہ تھی۔ جس سے مذہبی طبقات اور سیاسی حکمرانوں کو اطمینانِ قلب حاصل ہوتا۔ اگر ایک طرف

Marfat.com

اس تعلیم کے نتیجہ میں مذہب اور مذہبی قوانین کے اجارہ داروں کی پوزیشن معرض خطر میں تھی۔ تو دوسری طرف آسمانی بادشاہت کا تصور دنیوی حکمرانوں کی عظمت اور رعب و داب کے لئے مہلک تھا ؛ اس سے پہلے حضرت یحییٰ نے بھی آسمانی بادشاہت کے تخیل سے عوام کو دنیوی حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں کا احساس دلایا تھا۔ نتیجہ یہ کہ یحییٰ کو پہلے قید اور پھر قتل کیا گیا ؛" (صفحہ ۱۳۱) ؛

"عیسیٰؑ کی شخصیت یحییٰؑ سے زیادہ ہمہ گیر اور اُن کا اثر زیادہ وسیع تھا۔ نیز اُن کی تعلیم میں غریبوں اور بیواؤں کے ساتھ ہمدردی کا جو جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور اُمرا اور دولتمندوں کی جو مذمت کی گئی تھی وہ حکمران طبقہ کے لئے خوش آیند نہ تھی۔ اس لئے مذہبی طبقات اور سیاسی اقتدار دونو کا مفاد یہی تھا۔ کہ عیسیٰؑ کو بھی یحییٰؑ کی طرح فلسطین کے منظر سیاسی سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ اُنہوں نے جو سلوک کیا۔ اُس کے نتائج بہت دوررس ثابت ہوئے ؛" (صفحہ ۱۳۲) ؛

"حضرت عیسیٰؑ کی سحر انگیز شخصیت اور اُن کے بعض روحانی تجربات نے اُن کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا۔ کہ عیسیٰؑ مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔ اور اپنی آسمانی بادشاہت کا آغاز کریں گے ؛ چنانچہ پیروؤں میں وفات مسیح کے بعد اُنہیں اس نوعیت کے بعض روحانی مشاہدات ہوئے کہ مسیح زندہ ہیں۔ حالانکہ مسیح نے اپنی حیات ثانی کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی تھی ؛" (صفحہ ۱۳۲) ؛

"حضرت عیسیٰؑ کی کسی بات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے اپنی زندگی میں مصلوب ہونے کی توقع ظاہر کی ہو۔ یا اپنے آپ کو مسیح کی حیثیت سے پیش کیا ہو۔ کیونکہ مسیح تو آنے والی بادشاہت کا فرمانروا تھا۔ اور جب تک اس بادشاہ کا قیام عمل میں نہ آتے۔ اُس وقت تک کسی شخص کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُس کا فرمانروا مسیح ہے ؛" (صفحہ ۱۳۳) ؛

بہر حال مسیح کے ابتدائی پیروؤں کا یہ عقیدہ بھی نہیں تھا۔ کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں ؛ وہ آپ کو آنے والی بادشاہت کا روحانی فرمانروا تسلیم کرتے تھے۔ اور اس امر کے متوقع تھے۔ کہ آپ کے ظہور ثانی کے بعد دنیا کی حالت بدل جائے گی۔ اور انسان عالمگیر اخوت اور عدل و انصاف کے عہد میں داخل ہوگا .... لیکن جیسا وقت گزرتا گیا۔ پیروان مسیح کی امیدیں مایوسی میں بدلتی گئیں۔ اور عیسائیوں کا عام میلان اس طرف راجع ہوتا گیا۔ کہ عیسیٰؑ نے اپنی موت سے انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے اُس کی روحانیت کا راستہ ہموار کر دیا۔ اس طرح مسیح کا یہ تصور قوی ہوتا گیا۔ کہ وہ انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔ اور اُن کے ماننے کے ساتھ ہی انسان گناہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر آسمانی بادشاہت کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے ؛" (صفحہ ۱۴۵) ؛

یہودیوں میں عام طور پر خدا کا جو تصور مروج تھا۔ اس کے تحت خدا کو انسان سے بالکل غیر اور ماورٰی قرار دیا گیا تھا۔

Marfat.com

حضرت عیسیٰؑ نے اس تصور کو بدلنے کے لئے اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو زیادہ گہرا کرنے کی غرض سے خدا کے "آسمانی باپ" کی اصطلاح استعمال کی۔" (صفحہ ۱۴۶)۔

"جب عیسائیت کی تبلیغ اُن علاقوں میں شروع ہوئی۔ جہاں بت پرستانہ اور مشرکانہ عقیدوں کا زور تھا۔ یا یونانی مذہبی تصورات کا غلبہ تھا۔ تو "آسمانی باپ" کا تصور بدلنا شروع ہوا۔ اور مسیح کی مظلومانہ موت کے تصور سے مل جُل کر یہ عقیدہ پیدا ہو گیا۔ کہ مسیح کا خدا سے وہ تعلق نہ تھا۔ جو دوسرے انسانوں کا ہوتا ہے۔ بلکہ آپ واقعتہً خدا کے بیٹے تھے جس کو خدا نے اپنے بندوں کی نجات کے لئے دنیا میں پیدا کیا تھا۔" (صفحہ ۱۴۶)۔

"...... عیسائیت نے اخلاقی زندگی اور معاشرتی زندگی کے باہمی تعلق کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی۔ اس لئے اس کے نظریۂ اخلاق میں انفرادیت کا رنگ غالب رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مذہب پسند افراد نے .... دُنیا اور معاملاتِ دُنیا سے گریز کرنا شروع کیا۔ اس طرح عیسائیت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو رہبانیت اور مرتاضیت کی طرف لے گئی۔ اور جو صلاحیتیں تعمیر و تمدن اور ارتقائے حیات کے کام میں صرف ہونی چاہیئے تھیں۔ وہ نفس کُشی اور انفرادی تزکیۂ اخلاق کی بے سُود کوشش میں ضائع ہو گئیں۔" (صفحہ ۱۵۵)۔

"مسیحیت اعمالِ صالحہ سے زیادہ عقیدہ کی صحت کو ضروری قرار دیتی تھی۔ اس لئے اس مذہب کی تاریخ میں عقائد کا اختلاف اور اُن کی بنا پر فرقہ بندی کا ظہور ایک فطری امر تھا۔ مسیحیوں کا پہلا اور ابتدائی فرقہ ایبونی کہلاتا ہے .... اُن کے دل میں یہ تصور کبھی نہ پیدا ہو سکا۔ کہ مسیح اپنی بشریت میں اُن سے کسی درجہ مختلف ہیں۔ اُنہوں نے آپ کو صغر سنی، طفولیت اور شباب کی منزلوں سے گزرتے دیکھا۔ اور اس طبعی نشو و ارتقا میں اُنہیں کوئی غیر معمولی اعجازی کیفیت نہیں نظر آئی۔" (صفحہ ۱۵۶)۔

"لیکن نصرانی فرقہ مسیح کی پیدائش میں ایک فوق الفطرت کیفیت کا قائل تھا۔ اور اُس کی نظر میں ایسے تمام لوگ ملحد تھے۔ جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش میں کوئی غیر طبعی خصوصیت نہیں محسوس کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۵۷)۔

"ڈوسیٹس فرقہ کے لوگوں کا مسیح کی الوہیت پر اعتقاد اس قدر پختہ تھا۔ کہ انہوں نے مسیح کو مسترد کر دیا۔" (صفحہ ۱۵۸)۔

"ناسٹک کے فرقوں کا عقیدہ تھا۔ کہ مسیح بالکل اچانک طور سے ایک مکمل اور جوان سال انسان کی صورت میں دریائے یرون کے کنارے ظاہر ہوئے۔ لیکن اُن کی جسمانی شخصیت ایک سرابِ نظر تھی .... وہ رُوحِ خالص تھے۔" (صفحہ ۱۵۸)۔

"سرینتھس نے جو ایشیا کا باشندہ تھا۔ ایبونی اور ناسٹک عقیدوں میں مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ مسیح کی انسانیت اور الوہیت دونو برقرار رہیں .... اُس کے پیرووں کا عقیدہ تھا۔ کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو یہودی

Marfat.com

اشرار کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور آپ کو صلیب دینے کا وقت آیا۔ تو مسیح نے اُس کے جسم کو چھوڑ دیا۔ اور عالم ارواح کی طرف پرواز کر گیا۔ اس طرح یسوع تنہا رہ گیا۔ اور تمام جسمانی اذیتیں اُسی پر وارد ہوئیں:" (صفحہ ۱۵۸-۱۵۹):

"پانچویں صدی میں جسم کی دوگونہ فطرت کے اتحاد کا نظریہ قبولیتِ عام حاصل کر چکا تھا:" (صفحہ ۱۵۹):...

..."یعنی جسم کے اندر دو شخصیتیں اضمام شدہ تھیں۔ ایک کلمۂ الٰہی اور دوسرے انسانیت:" (صفحہ ۱۶۷):

آخر کار" عیسائیت زُہد و رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی طرف روز بروز زیادہ مائل ہوتی گئی۔ حالانکہ اُس کی اصلی تعلیم یہ تھی۔ کہ انسانیت اور الوہیت کا اتحاد ممکن ہے:" (صفحہ ۲۳۲):

اب ان اقتباسات سے یہ آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اسلام کے علاوہ باقی مذاہب نے کیا کیا رنگ بدلے: چنانچہ جب ہم دوسرے مذاہب کی غیر متعصبانہ تحقیق کرتے ہیں۔ تو ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ:۔

(۱) ہندو مذہب حقیقتاً توحید پر مبنی ہے۔ لیکن اُس کی مسخ شدہ صورت بُت پرستی ہے!

(۲) زرتشت مذہب نے انسان کو ایک معبودِ حقیقی کی طرف بلایا۔ لیکن سگے رشتوں میں باہمی ازدواج نے اُس مذہب پر کلنک کا ٹیکا لگایا!

(۳) مجوسی مذہب کے پیرو ایک وقت نُور کی طاقت کو (ظلمت کے مقابلہ میں) بالادست سمجھتے تھے لیکن بعد میں بُت پرست ہو گئے!

(۴) یہودی مذہب کی بنیاد خدا کی وحدانیت پر ہے۔ لیکن بعد میں رسمی دینداری اور ظواہر پرستی کے پیچھے پڑ گئے!

(۵) عیسائی مذہب نے بھی شروع میں خدا کی وحدانیت اور انسانی ہمدردی پر زور دیا۔ لیکن آخر کار مسیح کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ اور رہبانیت کی طرف چلے گئے!

گویا ہم کو آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ اپنے اپنے زمانہ میں کوئی آسمانی دین بھی جھوٹا نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ہم مثال کے طور پر یہودیوں کے دین یا عیسائیوں کے دین کو جھوٹا کہیں۔ تو اس کا حقیقی مطلب یہ ہے۔ کہ ہم معاذ اللہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو جھوٹا کہہ رہے ہیں چونکہ ان ادیان کے بانی مبانی تو یہی دو پیغمبر ہی ہیں: لہٰذا ہم یہودیوں کے دین یا عیسائیوں کے دین کو تو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ان ادیان کے پیروؤں کے کفر اور شرک کو ضرور جھوٹا کہہ سکتے ہیں:

یہ اسلئے کہ دین الحق (یعنی موجودہ اسلام) کے آنے پر یہودیوں اور عیسائیوں کی شریعتیں ہی منسوخ ہوئی ہیں۔

Marfat.com

اِن کے ادیان کی بنیاد دینِ اسلام پر ہی ہے :۔

یہاں ایک نہایت اہم اور خاص نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ دُنیا کے ادیان کی جو اصلی بنیاد ہے۔ اُس پر اب ایک ایسی عالیشان عمارت تیار ہو چکی ہے۔ کہ اُس کی تکمیل کے بعد اب "بنیاد" کو دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی! اور یہ عالیشان عمارت "اسلام" ہے۔

اِس سلسلہ میں اسلام کی ابتدائی تاریخ کا ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں :۔ ایک دفعہ توریت کے چند صفحات حضرت عمرؓ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ اُنہیں رسولِ پاکؐ کی خدمت میں لے آئے۔ اور اُنہیں حضورؐ کو دکھایا :۔ حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہ فرمائی :۔ پھر حضرت عمرؓ نے اُن صفحات کو پڑھنا شروع کر دیا :۔ اِس پر حضورؐ جلال میں آ گئے! حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اِس موقع پر موجود تھے :۔ اُنہوں نے جب حضورؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا۔ تو حضرت عمرؓ کو اُن کی نازیبا حرکت پر سرزنش کی :۔ حضرت عمرؓ اِس پر معافی کے خواستگار ہوئے :۔

اِس واقعہ میں جو راز تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ توریت کے زمانہ میں انسانیت ابھی سکول سٹیج میں تھی۔ لیکن حضورؐ کی بعثت کے بعد اب وہ کالج سٹیج میں ہے۔ اِس لئے توریت کی شریعت اب منسوخ ہو چکی ہے۔ لہٰذا دُنیا کو اب توریت والے "نصاب" کی مطلقاً ضرورت نہیں :۔ حضرت عمرؓ چونکہ اُس وقت تک اِس راز سے آشنا نہیں تھے۔ کہ توریت میں محض "سکول سٹیج" والا نصاب ہے۔ اور اب قرآن میں "کالج سٹیج" والا نصاب ہے۔ لہٰذا اُن پر جب اِس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ تو وہ معذرت خواہ ہوئے!

تبلیغ

اب یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ دُنیا کے لوگوں کا اِس وقت مذہب کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ اِس زمانہ میں ننانوے فیصدی لوگوں کا مذہب موروثی ہے :۔ مثال کے طور پر آج کل کے مسلمان اِس لئے مسلمان نہیں ہیں۔ کہ اُنہوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہُوا ہے۔ بلکہ وہ اِس لئے مسلمان ہیں۔ کہ وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ اور اُن کا نام مسلمانوں والا ہے!

یہی حالت اِس وقت کے ہندوؤں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی ہے!

اب دُنیا کے مغربی تعلیمیافتہ طبقہ کو لیجئے۔ چونکہ یہی طبقہ اِس وقت ناطق ہے۔ اور اِنہیں کی اِس زمانہ میں دُنیا میں حکمرانی ہے :۔

دُنیا کے مغربی تعلیمیافتہ طبقہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل روشنضمیر اور دوم اوسط درجہ کے لوگ :۔ اوسط درجہ کے لوگوں کا مذہب تو وہی ہے۔ جو اُن کے ماں باپ یا ماحول کا مذہب ہے۔ لیکن اِس وقت دُنیا

Marfat.com

ہیں جو مغربی تعلیمیافتہ روشنضمیر لوگ ہیں۔ (اور میرا روئے سُخن اِس وقت صرف اِنہی کی طرف ہے)۔ وہ خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا سکھ، یہودی ہوں یا پارسی، اِن میں زیادہ تر ایک بات بالکل مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ سب اِس بات کو حقیقی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ کہ اِس پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی طاقت ہے۔ جو انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہی طاقت اِس دُنیا کی خالق ہے۔ اور اُسی کے دستِ قدرت میں انسان کا مرنا اور جینا ہے: دوسری بات جو اِن مغربی تعلیمیافتہ روشنضمیر لوگوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ سب کے سب راستگو۔ دیانتدار۔ اور اعلیٰ قسم کے نیک کردار ہیں:

اب اِس طبقہ میں جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے۔ مذہب کی رُو سے اِن میں جتنی بھی کمی ہے۔ مثلاً اُن سے کا نبی آخرالزماںؐ یا قرآن پر ایمان نہ ہونا۔ یہ سب باتیں تبلیغ کی محتاج ہیں: لہٰذا جب تک اُن میں حقیقی تبلیغ نہیں ہوتی۔ وہ لوگ محض معذور ہیں!

اب یہاں تبلیغ کے سلسلہ میں بھی چند کلمات کہنے ضروری ہیں: ہم اِس وقت تک سمجھ یہ رہے ہیں۔ کہ قرآن کا جن جن زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اُس زبان کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ ہو چکی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے: مثال کے طور پر اگر ایک کتاب لندن سے لاہور کی پبلک لائبریری میں آجاتی ہے۔ تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ اِس کتاب کی لاہور کے تمام باشندوں میں تبلیغ ہو چکی ہے: اِس کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اِس کتاب کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اور اِس کی ایک جلد لاہور کی پبلک لائبریری میں موجود ہے: کسی کتاب کی اشاعت اور مذہبی تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے!

دوسرے جب تک ہم خود مقصدِ حیات "خدا کو ایک ماننا اور نیک ہونا" ہی سمجھتے رہیں گے۔ تب تک ہم موحّد یا صالح غیر مسلموں میں کسی نئی بات کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔ چونکہ جہاں تک اِن دو صفتوں کا تعلق ہے۔ وہ تو اِن غیر مسلموں میں ایک حد تک اِس وقت بھی پائی جاتی ہیں: غیر مسلموں کو اسلام کی تعلیم تب ہی اپیل کر سکتی ہے جب ہم یہ کہیں۔ کہ مقصدِ حیات محض "خدا کو ایک ماننا اور نیک ہونا" ہی نہیں ہے۔ بلکہ "خدا کی معرفت اور خدا رسیدگی" ہے۔ اور یہ خاتم النبیینؐ کی سُنّت کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں: اور خدا کی معرفت اِس لئے ضروری ہے۔ کہ جب ایک انسان اِس منزل پر پہنچتا ہے۔ پھر اُس کے قلب سے حجاب اُٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ دُنیا میں پیدا شدہ چیزوں کو ہی نہیں دیکھتا۔ بلکہ اُن چیزوں کو بھی دیکھتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں!

غیر مسلموں کو یہ بات کبھی اپیل نہیں کر سکتی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ جب تک اُن کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ وہ نیک نہیں ہو سکتے۔ یا قرآن پر ایمان لائے بغیر اُن کا خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان معتبر نہیں: یہ اِس لئے کہ قدرت کی طرف سے ہر ایک انسان میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے۔ کہ وہ سچ بولنے کو اچھا سمجھے۔ اور جھوٹ بولنے

Marfat.com

کو بُرا؛ چنانچہ جب ایک انسان اپنی فطرتِ صحیحہ کی وجہ سے صداقت شعار ہوتا ہے۔ تو اُس کے لئے یہ بات مضحکہ انگیز ہوجاتی ہے۔ اگر اُس کو یہ کہا جائے۔ کہ جب تک اُس کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ وہ سچ نہیں بول سکتا؛

یا اسی طرح ایک سلیم الفطرت غیر مسلم جو اپنی "بصیرت" کی رُو سے توحید کا قائل ہے۔ اُس کو یہ کہنا کہ وہ خدا کو ایک نہیں مان سکتا۔ جب تک اُس کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ یہ بھی مضحکہ انگیز بات ہے؛

لیکن بدقسمتی سے آج کل ہم اسی قسم کی بے معنی باتیں اپنی تفسیروں میں لکھ رہے ہیں' اس کے ثبوت میں صرف ایک مثال کافی ہے؛

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر میں جو اُنہوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے ترجمہ پر لکھی ہے۔ دو متضاد باتیں کہی ہیں۔ مثلاً سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۹۲ کے سلسلہ میں صفحہ ۹۷ کے حاشیہ پر پہلے تو مولانا یہ فرماتے ہیں۔ کہ :-

(الف) "ف ۵ .... عقلمند آدمی جب آسمان و زمین کی پیدائش اور اُن کے عجیب و غریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط و محکم نظام میں غور کرتا ہے۔ تو اُس کو یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ ضرور کسی مختارِ کل اور قادرِ مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے؛"

جو کچھ اس اقتباس میں لکھا گیا ہے۔ وہ سو فیصدی درست ہے۔ چونکہ ایک سلیم الفطرت انسان' دُنیا کے اس محیر العقول کارخانہ کو دیکھ کر واقعی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ یہ تمام سلسلہ "ضرور کسی مختارِ کل اور قادرِ مطلق" ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ اور جب ایک انسان ایسی ہستی کا قائل ہوجاتا ہے۔ تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ایسا انسان خدا کو مانتا ہے؛

لیکن اسی تفسیر میں سورۃ ۴ النساء۔ آیت ۱۵۱ کے سلسلہ میں صفحہ ۱۳۳ کے حاشیہ پر مولانا یوں رقمطراز ہیں :-

(ب) "ف ۳؛ فائدہ؛ اللہ کا ماننا جبھی معتبر ہے۔ کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے۔ اور اُس کا حکم مانے۔ بدوں تصدیق نبی کے' اللہ کا ماننا غلط ہے۔ اس کا اعتبار نہیں۔ بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے؛"

دوسرا اقتباس پہلے اقتباس کی مکمل طور پر تردید کرتا ہے۔ ہم پہلے تو یہ کہتے ہیں۔ کہ جب ایک شخص آسمان و زمین کی پیدائش میں غور کرتا ہے۔ تو اُس کو یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہ اُس کا خالق کوئی مختارِ کل ہے۔ اور ایسے شخص کو ہم عقلمند کہتے ہیں۔ لیکن بعد میں اسی بات کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔ کہ خدا کا ماننا جب ہی معتبر ہے۔ کہ ایک

Marfat.com

انسان اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے۔ ورنہ ایسے شخص کا خدا کا ماننا بھی غلط ہے۔ اور اُس پر خدا پر یقین بھی غیر معتبر ہے!

یہاں ہم دو غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں:۔ ایک تو یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ اور نبی میں جو ایک بیّن فرق ہے۔ اُس کو نظر انداز کر دیتے ہیں:۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لئے ہم کو صرف دُنیا کی تخلیق پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان سے بھی ممکن ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس قسم کا غور از خود کر سکتا ہے۔ اُس کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں:۔

لیکن جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ نبی کی مثال حروفِ تہجی یا ہندسوں کی طرح ہے۔ گویا جب تک ہم ہر بچے کو فرداً فرداً ان کی تعلیم نہیں دیں گے۔ ہم کسی بچے سے یہ توقع نہیں کر سکتے۔ کہ وہ اُن کو از خود جان جائے گا۔ اسی طرح کسی غیر مُسلم سے رسالت پر ایمان کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کہ اُسے اُس کی صحیح طور پر تبلیغ نہ ہو:۔

لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ تبلیغ کے بغیر رسالت پر ایمان کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جہاں تک خدا پر ایمان کا تعلق ہے۔ آسمان و زمین کی پیدائش پر محض غور ہی اس بات کے لئے کافی ہے۔ کہ ایک انسان یہ جان اُٹھے۔ کہ اس پردہ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!! ان حالات میں یہ کہنا کہ بدوں تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے، بے معنی سی بات ہے:۔

اس سلسلہ میں ہم جو دوسری غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم یہ از خود فرض کر لیتے ہیں۔ کہ سب غیر مسلم اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تکذیب کر رہے ہیں:۔ مثال کے طور پر نارمن لوئیس (غیر مسلم) کی جو چٹھی صفحہ ۱۵۱ پر درج کی گئی ہے کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ رسولوں کی تکذیب کرنے والے ہیں؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ جس طرح پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ سلیم الفطرت غیر مسلم لوگ دُنیا کے تمام پیغمبروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔ اُن کا سب پیغمبروں پر ویسا ہی ایمان ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں کا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان ہے:۔ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ دُنیا کے سب پیغمبر ایک ہی پیغام لائے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک انسان خدا کو مانے اور صالح ہو:۔ یہ دونو صفتیں چونکہ اُن میں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ اور کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے:۔

یہ مسئلہ چونکہ بہت اہم ہے۔ اس لئے اس کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے:۔ جب ہم اس قسم کا استدلال کرتے ہیں۔ کہ "بدوں تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے۔" تو اس وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز

Marfat.com

کر دیتے ہیں۔ کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہدِ الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا۔ اُس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے ؛ لہٰذا ہر سلیم الفطرت انسان خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جو تھوڑا سا بھی تفکر کرے گا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہے۔ کہ دُنیا کے اس محیر العقول کارخانہ کا خالق کوئی ضرور ہے۔ اور جو شخص اس حقیقت کا قائل ہو جاتا ہے۔ وہی عقلمند اور صاحبِ فہم و فکر ہے ؛ قرآن اپنی تمام آیات میں جہنمی لوگوں کے لئے مجرم، کاذب، مفسد، متکبر، فاسق، ظالم اور جاہل وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ صاحبِ عقل و فکر کے الفاظ اُن کے لئے ہرگز استعمال نہیں کرتا ؛ لہٰذا جو شخص اپنی عقل و فکر کی بنا پر ایک خدا کا قائل ہوا ہے۔ اُس کی عقل و فکر سے پیدا شدہ ایمان کو ہم غلط اور غیر معتبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ اس قسم کی گمراہی کی بنیاد اس اور صرف اس امر میں ہے۔ کہ ہم نے عشقِ الٰہی کو بھی کسی آسمانی صحیفہ کے ایمان پر موقوف سمجھا!

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم نے قرآن کے فلسفہ کو ہی نہیں سمجھا ؛ قرآن یہ کہتا ہے۔ کہ خدا کے "حسن" پر بن دیکھے اور بغیر کسی کے کہے سُنے ہر سلیم الفطرت انسان کا عاشق ہونا یقینی امر ہے۔ لیکن عاشق ہونے کے بعد دُرِّ مقصود ملنا کس طرح ہے؟ قرآن اس اور صرف اس بات کا جواب دیتا ہے۔ اور اُس کا جواب یہ ہے۔ کہ قرآن پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ یہ صحیفہ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" ہے۔ گویا اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے

بالفاظِ دیگر ان قرآنی الفاظ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک انسان اپنی عقل و فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر تو پہنچ سکتا ہے۔ کہ اس محیر العقول کارخانہ کا خالق کوئی ضرور ہے۔ اور پھر اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکوکار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اُس خالق کی "معرفت" حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ قرآن کی ہدایت پر عمل نہ کرے گا اور مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" حاصل کرنا ہے۔ محض موحد یا صالح ہونا نہیں!

لیکن ہم نے چونکہ "خدا پر ایمان" کو بھی "قرآن کے ماننے" پر منحصر سمجھا ؛ لہٰذا ہم نے اس بات کو نظرانداز کر دیا۔ کہ خدا کو ماننے کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ انسان کا کسی آسمانی صحیفہ پر ایمان ضرور ہو۔ بلکہ عقل و فہم کی ضرورت ہے۔ روشن ضمیری کی ضرورت ہے۔ جو صرف نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے! چنانچہ نارمن لوئیس نے خدا کے ساتھ لگاؤ اور اپنی تڑپ کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے (جس کے خط کا اقتباس صفحہ ۱۵۱ پر گزر چکا ہے)۔ وہ میرے نظریئے کی ایک زندہ اور ناقابلِ تردید مثال ہے!

اس نظریئے کی مزید تائید کے سلسلہ میں ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ گذشتہ چند صدیوں میں دُنیا نے عقل و فہم کے لحاظ سے کتنی ترقی کی ہے؟ اور کس طرح بتدریج کی ہے!

آج سے چند صدیاں پہلے ایک شخص (سکندر) یونان سے اُٹھتا ہے۔ اور دریائے سندھ تک تمام ملکوں کا

Marfat.com

مال و متاع لوٹ کر واپس چلا جاتا ہے ؛ اسی طرح ایک دوسرے ملک سے چنگیز خاں اُٹھتا ہے ۔ وہ بھی یہی کچھ کرتا ہے ۔ اور کوئی کسی کا پُرسان حال نہیں ہوتا !

جب دُنیا کی سمجھ لُوٹ مار سے ذرا آگے بڑھتی ہے ۔ تو ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے باشندوں پر حکومت کرنا شروع کر دیتے ہیں ؛

اس کی ایک مثال مُغلوں کی ہندوستان پر حکومت ہے ۔ جب یہ لوگ نا اہل ثابت ہوتے ہیں ۔ تو اُس کی جگہ انگریز لے لیتے ہیں ؛

پھر محکوم لوگوں کو ہوش آنی شروع ہوتی ہے ۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے جو اس سلسلہ میں آزادی کی لڑائی لڑی ہے ۔ تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں ؛

لیکن یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ گو انگریزوں نے شروع شروع میں اس آزادی کی لڑائی میں کافی مزاحمت کی ۔ لیکن آہستہ آہستہ چونکہ تمام دُنیا کے لوگوں میں صحیح شعور پیدا ہو رہا ہے ۔ لہذا اس آزادی کی لڑائی میں اگر ہندوستانیوں نے جیل کی کوٹھڑیوں کی مصیبتیں جھیلیں ۔ تو کچھ مدت کے بعد انگریزوں نے بھی پوری فراست کا ثبوت دیا ۔ اور اُنہوں نے ملک کو خود بخود برضا و رغبت ملک کے باشندوں کے سپرد کر دیا ؛

یہ آزادی کی لہر اب تمام دُنیا پر چھائی ہوئی ہے ؛ حال ہی میں الجیریا نے فرانس سے آزادی حاصل کی ہے ؛ اور اب افریقہ کے باقی ملک باری باری آزاد ہو رہے ہیں ؛

یہی نہیں ۔ بلکہ ہر وہ ملک جس کا بادشاہ نا اہل ثابت ہو رہا ہے ۔ وہ ملک اُسے برطرف کر رہا ہے ؛ اس سلسلہ میں مصر کی مثال بہترین ہے ؛

گویا جب انسانی عقل نے اس حد تک ترقی کر لی ۔ کہ ہر ملک یہ سمجھ رہا ہے ۔ کہ کسی کو کسی دوسرے ملک پر حکمرانی کا حق ہی نہیں پہنچتا ۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے ۔ کہ نظام حکومت بھی بہترین ہاتھوں میں ہی ہونا چاہیئے ۔ تو اب ترقی کا اگلا قدم یہ ہے ۔ کہ سب یہ چاہ رہے ہیں ۔ کہ مختلف ممالک کے آپس کے جھگڑے آپس میں بات چیت سے طے کرنے چاہئیں ۔ لڑائی بے سُود اور بے معنی ہے ؛

اب مقابلہ کیجئے ۔ سکندر اور چنگیز خاں والی ذہنیت اور موجودہ دُنیا کے باشندوں کی ذہنیت کا ؛ کیا ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے ؟[1]

---

[1] اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ہندوستان پر حکومت کی مثال کو پھر ذہن میں لائیں ؛ جب محمود نے ہندوستان پر سترہ دفعہ حملہ کیا ۔ اور آخر کار فتح پائی تو اُس زمانہ میں کوئی مفتوح یہ کہہ سکتا تھا ۔ کہ لڑائی میں جیت کر کسی ملک پر قبضہ کر لینا جائز نہیں تصور کیا جا سکتا ؟ لیکن ۱۹۶۶ء میں جو ...

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۸ پر)

Marfat.com

اُور آخر کار اب یہ تجویز پیش ہو رہی ہے۔ کہ نہ صرف ملکوں کی فوجوں میں کمی ہو۔ بلکہ اسلحہ و ہتھیار دُنیا سے نیست و نابود کر دئے جائیں!

اب اِس عقل و فہم والی دُنیا میں اگر سلیم الفطرت لوگ یہ پکار اُٹھیں۔ کہ اِس محیر العقول دُنیا کے پردۂ نیلی فام کے پیچھے کوئی ماورا طاقت ہے۔ جو مختارِ کُل ہے۔ تو کیا ہمارا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم یہ کہیں کہ ایسی ہستیوں کا خدا پہ ایمان بھی غلط ہے۔ اُور اُس کا ماننا بھی غیر معتبر ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمیں اِس قسم کے سلیم الفطرت لوگوں کی مشکل کا حل سوچنا چاہیئے: اُن کی مشکل یہ ہے۔ کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے دُنیا جہان کے تمام راز معلوم کر لئے ہیں۔ اُور اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ اس وقت چاند پر چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ لیکن اُن کو یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ انڈے میں سے مُرغی کا بچّہ کس طرح پیدا ہو جاتا ہے؟ گویا زندگی کا راز کیا ہے؟ رُوح کا راز کیا ہے؟

اِن نہایت معنی خیز سوالوں کا کیا اب ہمیں جواب یہ دُینا چاہیئے۔ کہ اُن کی تمام تڑپ غلط ہے۔ اُور اُن کی تمام تلاش و تجسس غیر معتبر ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اُن کی یہ تڑپ ہی ہمیں اِس بات کا ایک سُنہری موقع دے رہی ہے۔ کہ ہم اُن کا خاتم النبیینؐ سے تعارف کروائیں۔ اُور یہی صحیح اسلامی تبلیغ ہے۔ لیکن ہم اپنی مسجدوں میں یہ تصور کئے بیٹھے ہیں۔ کہ چونکہ قرآن ہر ملک میں پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا تبلیغ کی حُجّت پوری ہو چکی ہے۔ اُور اب یہ سب لوگ جہنمی ہیں!

ہماری اِس کم فہمی کی تہ میں پھر وہی لاعلمی ہے۔ جس کا اِن اوراق میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں اِس بات کا پتہ ہی نہیں۔ کہ حضورؐ کی سُنّت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ وہ ایک انسان کو زندگی اُور رُوح کے رازوں سے آگاہ کرتی ہے: اُور یہ بات ہمارے بتانے سے ہی غیر مسلموں کی سمجھ میں آئے گی۔ خود بخود وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے: لیکن ہم اس بات پر مُصر ہیں۔ کہ چونکہ قرآن یہ خبر دے چکا ہے۔ کہ انجیل میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد ایک پیغمبر آئیگا جس کا نام احمدؐ ہوگا۔ لہٰذا (کم از کم) عیسائیوں کو خاتم النبیینؐ پر خود بخود ایمان لے آنا چاہیئے! اس سلسلہ میں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ انجیل میں تحریف ہو چکی ہے۔ لہٰذا آجکل کے عیسائیوں کو اصلی انجیل کا کس طرح علم ہو سکتا ہے؟

یہاں دوسرا نکتہ یہ ہے۔ کہ آجکل کے زمانے کے سلیم الفطرت غیر مسلم کسی بھی پیغمبر کا انکار نہیں کرتے۔ وہ سب کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں (گویا اُنکا دُنیا کے تمام پیغمبروں پر ایمان اُس قسم کا ہے۔ جیسا کہ ہمارا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷ کا)

اُور یہودیوں کے درمیان جو لڑائی ہوئی ہے۔ اُس میں یہودیوں نے جن عرب علاقوں پر قبضہ کیا ہے۔ اب اُن کے متعلق ڈنکے کی چوٹ کہا جا رہا ہے۔ کہ کسی قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ کسی دوسری قوم کے کسی علاقہ پر اپنی طاقت کے بل پر قبضہ کرلے! لہٰذا جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا ہے۔ وہ عربوں کو بغیر کسی شرط کے واپس کئے جائیں۔

Marfat.com

لیکن وہ اپنے مذہب کو چھوڑنے کو اس لئے تیار نہیں۔ کہ اُن کے نزدیک تمام مذاہب کی رُوح صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان خدا کو ایک مانے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں نیکوکار ہو۔ اور چونکہ یہ دونو صفتیں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ مذہب کی تبدیلی کی دیانتداری سے کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور اگر اُن سے یہ کہا جائے۔ کہ اُن کا خدا پر ایمان غلط اور غیر معتبر ہے۔ تو وہ ایسی بات کو نہایت دیانتداری سے مضحکہ انگیز سمجھتے ہیں۔ چونکہ اُن کے نزدیک خدا کو ایک ماننا یا نیکوکار ہونا کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ جو اُن کو مسلمانوں کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہ آ سکے ؛ البتہ ان کی مشکل بالکل دوسری ہے۔ جو اُوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ رات دن کی محنت تجسس اور تلاش کے بعد ہر مادی چیز کے راز کو تو معلوم کر سکے ہیں۔ لیکن حیات اور زندگی کے بھیدوں کو بالکل نہیں پا سکے ؛ ہم اُن کو ان بھیدوں سے تب ہی آگاہ کر سکتے ہیں۔ جب کہ پہلے ہمیں خود اس بات کا علم ہو۔ کہ خاتم النبیینؐ کی سُنّت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان رُوح کے رازوں سے آگاہ ہو سکے۔ اور دوسرے ہم خود اس منزل پر پہنچ چکے ہوں ؛ جب تک ہم خود "دانائے راز" نہیں ہوتے۔ تب تک ہم نہ صرف تبلیغ کے اہل نہیں۔ بلکہ ہماری کسی بات میں وزن ہی نہیں [illegible] ہو سکتا ؛ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے وعظوں یا تحریروں میں آجکل کوئی اثر نہیں۔ اور انہیں قابلِ [illegible] اعتنا نہیں سمجھا جاتا ؛

"چنانچہ ہماری اس وقت سب سے بڑی مصیبت یہی ہے۔ کہ اوّل تو ہمیں عام طور پر اس بات کا ہی علم نہیں کہ مقصدِ حیات خدا تک "پہنچنا" ہے۔ محض "ماننا" نہیں۔ لیکن جن کو یہ معلوم بھی ہے۔ وہ تبلیغ جیسے ذمہ دار کام کے لئے کسی اہلیت کی شرط کو ضروری نہیں سمجھتے ؛

اِس سلسلہ میں جو سب سے حیران کُن بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک ہمارے دنیوی اُمور کا تعلق ہے ہم کبھی بھی کسی نااہل انسان کو ایک ذمہ داری کا کام سپرد نہیں کرتے ؛ مثلاً کیا ہم نے کبھی یہ دیکھا ہے۔ کہ ایک شخص پانچویں یا دسویں جماعت پاس شخص کسی کالج میں پروفیسر ہو؟ یا ایک "عطار" کسی ہسپتال میں ڈاکٹری کے فرائض انجام دے؟ لیکن مذہبی امور ہی ہیں۔ جہاں ہم کسی قسم کی اہلیت کو ضروری تصور نہیں کرتے ؛

اِس سلسلہ میں "تبلیغی جماعت" کی مثال کافی ہے ؛ اُن کے ہر روز "قافلے" نکلتے ہیں۔ لیکن اُن کے سب افراد "سکول سٹیج" میں ہی ہیں۔ کیونکہ اُن کا ایمان و عمل "اِتّقا" کی حد تک محدود ہے۔ جس منزل میں تو اُن کے اکثر افراد سَو میں سے سَو نمبر لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ حضرات "خدا رسیدگی" کی منزل سے ابھی بہت پیچھے ہیں ؛ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اس قسم کے لوگوں کو "اسلام کا درد" اور "تبلیغ کی تڑپ" ہی اپنے گھروں سے نکالتی ہے۔ اور بغیر کسی سے کچھ لئے دئے وہ خاموشی سے اپنی "مہموں" پر روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسطرح وہ اپنے "دل کے درد" کا مداوا ہی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اسلام کا حقیقی مقصد تو دُنیا کے لوگوں کو خدا تک "پہنچانا" ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کام صرف اولیائے کرام ہی انجام دے سکتے ہیں۔ دوسرے کسی کے بس کا روگ نہیں لیکن ہمیں چونکہ عام طور پر اس بنیادی نکتہ کا ہی علم

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۰ اور ۱۲۰ ؛

Marfat.com

نہیں۔ لہٰذا اس وقت فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست والا معاملہ ہے ؛

اسلام کی تاریخ کی پہلی چند صدیاں اس بات کی شاہد ہیں۔ کہ یہ ذمہ داری کا کام ہمیشہ انہوں نے کیا۔ جو "دانائے راز" تھے۔ اسی لئے اسلام کی اوّلین صدیوں میں قوموں کی قومیں اسلام لائیں۔ اور ایسا اسلام لائیں۔ کہ اُن میں سے تمام سلیم الفطرت ہستیاں خود "دانائے راز" بنیں۔ اور اولیائے کرام کہلائیں ؛

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ کچھ عرصہ ہوا۔ تبلیغی جماعت کے ایک رکن سے سوال کیا۔ (اور یہ صاحب بہت مدت سے تبلیغی مہموں پر نکل رہے ہیں۔ اور وہ کلرک بھی نہیں افسر ہیں) کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** کا مطلب کیا ہے؟ وہ فرمانے لگے مجھے تو معلوم نہیں ؛

پھر ایک دوسرے موقع پر اردن وغیرہ کے دو عربی نوجوان "تبلیغی جماعت" کی ایک محفل میں شریک تھے۔ اُن کے ساتھ پاکستان کے ایک جیّد عالم صاحب بھی تھے۔ اُن کی وساطت سے میں نے اُن عربوں کو سوال کیا۔ کہ اُن کے نزدیک "متقین" کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے عربی میں نہایت معقول جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ کہ اُن کی اس لفظ کی تعریف بالکل درست ہے۔ لیکن پھر هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا کیا مطلب ہے؟ اس پر پاکستانی عالم صاحب نے فرمایا۔ کہ عربوں سے یہ سوال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ عرب تاجر پیشہ تھے۔ شاید زیادہ تعلیمیافتہ نہ ہوں گے ؛ میں نے پھر پاکستانی عالم صاحب سے گزارش کی وہی اس کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ انہوں نے جواب دینے سے اعراض فرمایا ؛

اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو قرآن کی شروع کی آیت کے راز[1] کا ہی علم نہ ہو۔ اُن سے "دانائے راز" ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا ؛ اس وقت جو جتانا مقصود ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ دنیا کی اقوام کو جو اسلام کی تبلیغ کی ضرورت ہے۔ اُس کی حقیقی وجہ تو یہی ہے۔ کہ دوسرے مذاہب کے لوگ خدا کو ایک بھی مان سکتے ہیں۔ اور صالح بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن "خدا رسیدہ" نہیں ہو سکتے۔ قرآن کے الفاظ **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ**[2] اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؛

قرآن کی اس آیت پر گذشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے ؛ وہاں یہ بتایا گیا تھا۔ کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اسلام سچا ہے۔ اور دوسرے ادیان جھوٹے ہیں۔ بلکہ اسلام کی صداقت اس بات سے عیاں ہے۔

---

[1] اس راز کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۱ ؛

[2] سورۃ ۹ التوبۃ۔ آیت ۳۳۔ دیکھیں صفحات ۱۷۱ تا ۱۷۵ ؛

Marfat.com

کہ جب اس کا دوسرے ادیان سے مقابلہ کیا جائے گا۔ تو یہ تمام ادیان پر سبقت لے جائے گا۔ یہ اس لئے کہ اس دین کے پیرو نہ صرف "خدا کو" مانتے" ہیں۔ بلکہ "خدا تک" پہنچ "بھی سکتے ہیں!

یہ فصل چونکہ تبلیغ کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا یہاں مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کو ایک اور پہلو سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ان الفاظ میں محض **مقابلہ** کا مفہوم ہی اس بات پر شاہد ہے۔ کہ اسلام اگر "صحیح ترین" ہے تو دوسرے آسمانی ادیان بھی "صحت" کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ یعنی یہ غلط در جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ "مقابلہ" ہمیشہ ایک ہی جنس کی چیزوں کا ہو سکتا ہے۔ غیر جنس سے مقابلہ بے معنی ہے: مثلاً ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ گھڑی اس گھڑی سے بہتر ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ گھڑی اس پیالہ سے بہتر ہے۔ چونکہ ان دونوں کی جنس علیحدہ علیحدہ ہے۔ اسی طرح ہم "اسلام" کا مقابلہ کم از کم "صحیح ادیان" سے ہی کر سکتے ہیں۔ "جھوٹے ادیان" یا "لادینی" سے نہیں کر سکتے۔ چونکہ ایسا کرنا ایک نہایت اعلیٰ قسم کی گھڑی کا ایک ٹوٹی ہوئی بیکار گھڑی سے مقابلہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ جو بے معنی ہے!

اس کے علاوہ مندرجہ بالا آیت میں **علی الدین کلہ** میں "**کُل**" کا لفظ دو باتوں پر دلالت کرتا ہے:

(١) اگر اس آیت میں "دین" کے لفظ کو واحد تصور کیا جائے۔ تو اس صورت میں "کُل" کا لفظ "تکمیل" کے معنوں میں ہوگا: یعنی حضرت عیسیٰ تک دین کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن رسول پاک کے وقت دین کی تکمیل ہوئی۔ اس صورت میں مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ "تکمیل شدہ دین یعنی اسلام باقی غیر تکمیل شدہ ادیان" پر سبقت لے جائیگا: لیکن

(٢) اگر لفظ "کُل" کی رعایت سے "دین" کو "ادیان" کے معنوں میں لیا جائے۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اس دنیا میں اسلام کے علاوہ "صحیح ادیان" بھی کم از کم تین ضرور ہیں۔ کیونکہ عربی میں "کُل" کا لفظ ایک یا دو کے لئے نہیں بولا جاتا۔ بلکہ کم از کم تین یا اُس سے زیادہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے: لہذا کم از کم تین "صحیح ادیان" جن کا اسلام سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہندو مذہب، یہودی مذہب اور عیسائی مذہب کی وہ صحیح کیفیت ہے۔ جس میں خالص توحید اور نیکوکاری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور جس کی تفصیل گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے: (لہذا یہاں میری مراد ان مذاہب کی وہ شکل ہرگز نہیں۔ جس میں اس وقت بُت پرستی یا تثلیث وغیرہ شامل ہے:)

Marfat.com

اِس تشریح سے یہ واضح ہوجاتا ہے۔ کہ قرآن کے الفاظ "لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" اِس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ اِسلام کے علاوہ کم اَزکم تین مذاہب ایسے ضرور ہونے چاہئیں۔ جن کے حقیقی پیرُوؤں کا اگر اسلام کے پیرُوؤں سے مقابلہ کیا جائے تو مؤخّر الذکر، اوّل الذکر پر سبقت لے جائیں ؛

ان وُجوہ کی بنا پر ہمیں اگر کچھ ثابت کرنا ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ ہر مسلمان کردار کے لحاظ سے ہر غیر مسلم سے بہتر ہے !

اندریں حالات اگر ہم حقیقت شناس ہوتے۔ تو ہم گھروں سے تبلیغ کے لئے قدم باہر نہ نکالتے۔ جب تک کہ ہم اپنے آپ کو دوسرے مذاہب کے بہترین پیرُوؤں سے بہتر ثابت نہ کرسکتے ؛ لیکن ہم نے چونکہ اِس معاملہ کو کبھی اِس نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لہٰذا ہم نے دوسرے مذاہب کی ریسرچ تو بالکل نہیں کی۔ البتہ اِن مذاہب کی غلط روایات کو اُچھالنے میں ہی اِسلام کی جیت سمجھی !

لہٰذا اِس وقت ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے۔ کہ ہم نہ صرف قرآن جو خدا کا "آخری حرف" ہے۔ اُس کی حقیقت تک پہنچیں۔ بلکہ دوسرے مذاہب کی بھی دیانتداری سے ریسرچ کریں۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو۔ کہ اُن کی بہترین تعلیمات بنی نوعِ انسان کو کس سطح پر لے جاتی ہیں۔ اور اسلام کے پاس اُس سطح سے اوپر لے جانے کے اسباب کیا ہیں ؟ اور اُن کی تبلیغ کے امکانات کیا ہیں ؟

Marfat.com

اِس سلسلہ میں ہم نے جس نہایت ضروری نکتہ کی طرف کبھی غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو غیر مُسلم اس وقت توحید پرست یا نیکوکار ہیں۔ اُن کو یہ ھدایت کس طرح نصیب ہوئی؟ یہ اُس نظرِ فیض کا نتیجہ ہے۔ جو حضورؐ "رحمتہ للعلمین" ہونے کی حیثیت سے تمام دُنیا کے افراد پر ہر دم اور ہر آن نچھاور کرتے رہتے ہیں! جو لوگ حضورؐ کے فیض کو صرف دُنیا کے مُسلمانوں تک محدُود سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے حضورؐ کی "رحمتہ للعلمینی" والی شان کا صحیح طور پر اندازہ ھی نہیں کیا!

Marfat.com

غیر مذاہب کے بارہ میں اگر ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ تو اُس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہمارے عوام اور خاص کر ہمارے علماء کا واسطہ زیادہ تر غیر مذاہب کے متعصّب لوگوں سے ہی پڑا ہے۔ اور چونکہ ہمارے عوام میں سے اکثر (اور علماء تمام کے تمام) انگریزی زبان نہیں جانتے۔ لہٰذا وہ اس زبان میں دوسرے مذاہب کے قابلِ قدر لٹریچر سے متعارف نہیں ہو سکے :

مقصودِ ما محمدؐ و آلِ محمدؐ است!

Marfat.com

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروؤں کے قابلِ قدر لٹریچر کی ایک مثال

مثال کے طور پر اب میں دو اقتباسات درج کرتا ہوں۔ جن میں غیر مسلموں کے قابلِ قدر لٹریچر کا نمونہ ملتا ہے:۔ ایک عیسائی مصنف انسان کے اندر جو "آتشِ عشق" ہے۔ اُس کے متعلق لکھتا ہے:۔

Let every man remember that the destiny of mankind is incomparable. ....And let him above all never forget that the divine spark is in him, in him alone, and that he is free to disregard it, to kill it, or to come close to God by showing his eagerness to work with Him and for Him." (*Human Destiny* by Lecomte dü Nouy. Published by the New American Library)

(یعنی ہر شخص کو یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ بنی نوعِ انسان کا انجام بالکل نرالا ہے۔ اس کا کسی سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا...... ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہیے۔ کہ عشق کی چنگاری انسان اور صرف انسان میں ہی ہے: اُس کو اب یہ اختیار ہے۔ کہ اس چنگاری کی پرواہ نہ کرے۔ اور اسے کچل کر رکھ دے۔ یا خدا کے ساتھ لگاؤ لگا کر اُس کے قریب ہو جائے۔ اور پھر اپنے ذوق سے صرف اُسی کا بن کر رہے اور اُسی کا ہو کر رہے!" ("نوعِ انسانی کا انجام") :

اسی طرح چندو گیا اُپانیشد میں اُدّالا کا اپنے بیٹے کو خدائے وحدہٗ لا شریک کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے :-

"In the beginning there was Existence, One only, without a second. Some say that in the beginning there was non-existence only, and that out of that the universe was born. But how could such a thing be? How could existence be born out of non-existence? No, my son, in the beginning there was Existence alone---- One only, without a second. He, the One...........projected the universe ....Of all the things he is the subtle essence. He is truth. He is the Self......"

(یعنی روزِ آفرینش سے پہلے، صرف ذاتِ واحد ہی تھی - وہ ایک، جس کا دوسرا نہیں :- بعض کہتے ہیں - کہ شروع میں کچھ نہیں تھا - اور نیستی سے اس دُنیا نے جنم لیا :- لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟ نیستی میں سے ہستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے ؟ نہیں، میرے بیٹے ! شروع میں صرف ایک ذاتِ مطلق تھی - اکیلی، واحد، جس کا دوسرا کوئی نہیں :-

Marfat.com

اُس ایک سے دُنیا ظہور پذیر ہوئی ؛ وہ ذات سب چیزوں کی رُوح یا عطر ہے ؛

وہ حق ہے۔ وہ آپ خود ہے ؛"

کیا یہ خیالات وجذبات آبِ زر سے لکھنے کے قابل نہیں ہیں ؟ یہ علیا ئیت اور ہندو مذہب کے متعلق

"تصویر کا دوسرا رُخ" پیش کرتے ہیں !

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچّے پیروؤں کے بارہ میں صوفیائے کرام میں سے ایک بزرگ کے خیالات

اب جہاں تک ایسے غیر مسلم اصحاب کا تعلق ہے ،

جو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اور نیکوکار بھی ہیں ۔ ان کے بارہ میں زمانہ حال کے صوفیائے کرام میں سے صرف ایک بزرگ ہیں جن کے خیالات میری نظر سے گذرے ہیں۔ اور جن کے فکر کی افتاد بالکل وہی ہے۔ جس کا ذکر ان اوراق میں کیا گیا ہے۔ ان بزرگ کا اسم گرامی ترجمانِ حقیقت حضرت محمد عمر صاحب (بیربل شریف) ہے ۔

ذیل میں جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔ وہ ادارۂ تصوف کے ماہنامہ رسالہ سلسبیل (لاہور) سے لئے گئے ہیں جس رسالہ میں یہ بزرگ ہر ماہ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہتے تھے ؛

چنانچہ "سلسبیل" بابت ماہ جولائی ۱۹۶۲ء میں ارشاد ہوتا ہے :-

"کسی مذہب اور کسی دین کی توحید سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ کسی کو گردن زدنی قرار دیا جاسکتا ہے ؛" (صہ ۳۱) ؛

"اختلافِ شریعت، حقیقی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی عبادتِ الٰہیہ، جیسے نماز، روزہ وغیرہ میں ہے معاملات میں تمام (مذاہب) متفق ہیں۔ برائیوں اور نیکیوں کا واحد معیار ہے ؛" (صہ ۲۲) ؛

"حقیقتاً توحیدی دین تمام ایک ہیں۔ اگرچہ بعض موسمی اور وقتی حالات کی وجہ سے بظاہر بعض اُمور میں مختلف نظر آتے ہیں ؛" "سلسبیل" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء، (صہ ۱۷) ؛

"اسمِ اللہ اپنے اندر بہت بڑی حقیقت رکھتا ہے صرف اللہ کا نام ہی مذہبی تخم ہے۔ اور ہر دین کا تخم یہی ہے۔ اگرچہ الفاظ الگ الگ ہوں ؛ ہر زبان میں ہر قوم کے لئے ایک ہی حقیقت، مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اور جس نام سے بھی پکاری جاتی ہے۔ وہی پسند ہے ؛" (ایضاً۔ صہ ۱۷) ؛

"ہر قوم وملّت کیلئے اپنا اپنا نام اللہ لینا، اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے ؛ مسلمان خواہ کسی مُلک کا ہو۔ اُسے اسم اللہ سے ہی پُکارنا ضروری ہے۔ تاکہ رسول رنگ اُس نام پر چڑھے ؛ جس نبی نے جو نام پیش کیا۔ اُس نام سے اُس کی اُمّت کو پُکارنے میں برکات اور فیوضات ہیں ؛" (ایضاً۔ صہ ۱۸) ؛

Marfat.com

"وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" اور ایسے کئی ٹکڑے قرآن حکیم میں بکثرت آتے ہیں۔ جن سے وحدتِ دین کا عقیدہ کامل طور پر پیدا ہوتا ہے .... یہ الگ بات ہے۔ کہ جہالت یا تعصب سے ہر قوم و ملّت نے اپنا اپنا دین الگ خیال کیا: اور اپنے دین کے سوا باقی ادیان سے دُشمنی پیدا کر رکھی ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۰)

"سکھوں کا مذہب کل کا مذہب ہے ..... اُن کے گُرو نانک کے بارہ میں اُن کے خیالات کا کبھی جائیزہ لیا گیا؟ وہ کیا کچھ اس کے بارہ میں کہتے ہیں: اور کیا اُن کے الفاظ سے شرک ٹپکتا ہے؟ وہ اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں....... وہ نانک جی میں وہ اوصاف بھرتے ہیں۔ جو اوصاف خداوندی سے ملتے جُلتے ہیں: وہ یہ نہیں کہتے، وہ خُدا ہے۔ بلکہ وہ صاف کہتے ہیں گُرو ہے۔ اللہ کا اوتار ہے۔ اور اللہ کے اوصاف سے متصّف ہے۔"

اب اگر تعصّب کے بغیر دیکھا جائے۔ تو کیا ان افکار پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جا سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ اُفتاد ہی معقولیّت کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہمارے عام عُلماء نے اس قسم کے خیالات کا کبھی اظہار کیوں نہیں کیا؟ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارا علم "اِتقا" تک محدود ہے۔ ہم "عرفان" کی منزل میں جھانک ہی نہیں سکتے۔ جس منزل پر صرف صوفیاء اور اولیاء ہی پہنچ سکے ہیں! اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم قرآن کی اُن آیات کا مفہوم تو صحیح طور پر سمجھ سکے ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سیدھے سادھے احکام آئے ہیں۔ لیکن اُن آیات کے رموز سے آشنا نہیں ہو سکے۔ جن کا تعلق "وجدان" یا "معرفت" سے ہے!

اسی وجہ سے ہم میں سے بعض نے "ذَالِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" کے راز کو ہی نہیں سمجھا[1] جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ سرسید جیسے مقتدر لوگ معجزات کے منکر رہے! لیکن جو لوگ معجزات کے قائل ہوئے، اُنہوں نے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے راز کو نہ پایا[2]!

اس کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم نے انسانوں کے صحیح "مقصدِ حیات" کو سمجھنے کیلئے مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کو ہر وقت اپنے سامنے نہیں رکھا یعنی

كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

(گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں چھُپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہٰذا میں نے دُنیا بنا دی!)

ان الفاظ سے یہ صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔ کہ انسان کا حقیقی "مقصدِ حیات" "خُدا کی معرفت" ہے۔ محض خدا کو "ماننا" نہیں!

اسی لئے لفظ "مسلم" کے دراصل معنی "عارف" کے ہیں۔ لیکن ہماری سطحی ذہنیت اس نکتہ کو سمجھ نہیں سکی۔ اس لئے ہم نے "لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" والی آیت[3] میں "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کے راز کو نہ سمجھنے کی وجہ سے "مُسْلِمُوْنَ" کے معنی "اطاعت شعار" مسلمانوں کے کئے۔ "عارفین" کے نہیں کئے۔ جو نہ صرف زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ بلکہ اپنی باطنی آنکھوں سے اُن چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا کی ہیں[4]!

---

[1]: اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۲۶۹ - ۲۷۱: [2] اس کی تفصیل کیلئے دیکھیں صفحات ۳۸ - ۴۱، ۱۰۶ - ۱۰۸ اور ۲۲۴ - ۲۲۵:

[3]: پوری آیت یہ ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۰۲)
(یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ مرو تم جب تک کہ تم صحیح "مسلم" (یعنی "عارف") نہ ہو:

[4]: اس کی پوری تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۴۱ تا ۵۲:

Marfat.com

اسی وجہ سے قرآن میں جہاں جہاں "عرفان کی سطح" والی آیات آئی ہیں ہم نے انکے صحیح معنی نہیں کیئے ؛

مثال کے طور پر قرآن میں " اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ " کے الفاظ لے لیجئے ؛ یہ واقعہ حضورؐ کی پیدائش سے پچاس روز قبل پیش آیا تھا ؛ قرآن نے اس واقعہ کے لیئے "اَلَمْ تَرَ" (کیا آپ نے نہیں دیکھا ؟) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ جن ہستیوں کو خدا کی "معرفت" حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے اور آسمان کے درمیان سے حجاب اُٹھ جاتے ہیں ۔لہٰذا وہ گذشتہ زمانوں کے حالات کو بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں ! لیکن ہم چونکہ محض "اتقا کی سطح" پر ہیں ۔لہٰذا ہم نے مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کا ترجمہ یُوں کیا ہے : "کیا آپ کو علم نہیں ؟" یعنی کیا آپ نے اصحابِ فیل جیسے مشہور واقعہ کی تفصیلات کی بابت سُنا نہیں ؟ گویا ضرور سُنا ہوگا !

اِس قسم کے ترجمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے ۔کہ ہم نے عربی کے لفظ رائی کے سیدھے سادھے معنوں کی طرف تو دھیان نہیں دیا ۔البتہ اپنی سطحی ذہنیت کی بدولت یہ فرض کر لیا ۔کہ گذشتہ واقعات کو دیکھنے کا چونکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا ۔لہٰذا یہاں " اَلَمْ تَرَ " کے معنی "کیا آپ کو علم نہیں ؟" ہی کرنے چاہئیں !

جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں بار بار واضح کیا جاچکا ہے ۔ اِس صورتِ حالات کی تہ میں صرف یہ امر ہے ۔کہ ہم نے نہ "عرفان" کو "مقصدِ حیات" کے طور پر ہر وقت اپنے سامنے رکھا اور نہ ہم "عارفین" کے مراتب کو ہی پورے طور پر سمجھ سکے !

اسی طرح سورۂ جمعہ میں حضورؐ کے بارہ میں یُزَکِّیْہِمْ کے الفاظ آئے ہیں ؛ ہم نے عام طور پر ان کا مطلب یہ لیا ۔کہ حضورؐ چونکہ ہر وقت اخلاقِ حسنہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے ۔لہٰذا صحابہ کے اعمال صالحہ کرنے کی وجہ سے اُن کے قلوب کا جو تزکیہ ہو جاتا تھا وہی یُزَکِّیْہِمْ کی تفسیر ہے ؛

اِس سے پھر واضح ہو جاتا ہے ۔کہ ہم یہاں بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے ؛ یہاں جس نکتہ کو سمجھا نہیں گیا وہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے دو[1] درجے ہیں ؛

پہلا درجہ تو یہ ہے ۔کہ اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو وہ توبہ کرے ۔ اور پھر ہمیشہ سچ بولے ؛ اس توبہ اور سچ بولنے سے وہ اپنے نفس کا تزکیہ کر لے گا ۔لہٰذا وہ "کاذب" کی بجائے "متقی" ہو جائے گا ؛

اِس سے اگلا قدم یہ ہے ۔کہ وہ "متقی" سے "عارف" بنے ؛ اس منزل پر پہنچنے کے لئے ہر سالک کے راستہ میں بعض اوقات ایسی رکاوٹیں آتی ہیں جن میں سے گزرنا آسان کام نہیں ہوتا مثلاً ایسے وساوس کا آنا جو بار بار آئیں اور دُور نہ ہوں ۔ یا ایسے مشکل مسائل کا سامنے آنا جو حل نہ ہوتے ہوں ۔ وغیرہ ۔ وغیرہ ؛ اِس قسم کی مشکلات پھر کسی ولی یا مرشد کی توجہ یا سلوک کی محتاج ہوتی ہیں ۔جو اپنی "فیضِ نظر" سے اُن کو دُور کرتا ہے ۔ اس طرح پھر وہ "عارف" اپنے "سالکین" کے نفوس کا "تزکیہ" کرتا ہے ۔جس کے نتیجہ کے طور پر وہ اِس قابل ہو جاتے ہیں ۔کہ وہ "وجدان و عرفان" کے اُن رموز کو جو انسان کی عقل سے باہر ہوتے ہیں اُن کی حکمتوں کو آسانی سے سمجھ سکیں ؛ حضرت مجدد الف ثانی کی زندگی میں اس قسم کے تزکیہ کی مثال صفحہ ۳۰۳ پر درج کی گئی ہے ؛ سورۂ جمعہ میں یُزَکِّیْہِمْ کے الفاظ اِسی قسم کے تزکیہ کے لئے آئے ہیں ۔ ان الفاظ سے پہلی قسم کا تزکیہ مراد نہیں ۔جو انسان خود کر سکتا ہے !

اسی ("اتقا" تک محدود) ذہنیت کی وجہ سے ہم نے قرآن کی اُن آیات کی بابت جن کا تعلق غیر مسلموں سے ہے ۔تفسیر درست کی لیے جس کا نتیجہ یہ ہے ۔کہ ہم نے تمام غیر مسلموں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ۔اور ہم صالح اور غیر صالح مسلموں میں تمیز نہیں کر سکے ۔ لیکن حضورؐ نے آج سے چودہ سو سال قبل اِسی نکتہ کی طرف جس حیرتناک طریقہ سے اشارہ فرمایا ہے ۔اُس کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے ! اس مسئلہ کی طرف اشارہ پہلے بھی کیا جاچکا ہے[2] لیکن اس کی مزید تشریح کے لئے اگلی فصل ملاحظہ کریں ؛

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۷ ؛

[2] دیکھیں صفحہ ۱۷۵ ؛

Marfat.com

حضورؐ کا معراج کے موقع پر غیر مذاہب کے سچے پیروؤں کو "صالحین" کے لفظ سے یاد کرنا اور قرآن کی اس سلسلہ میں تصدیق!

جس طرح پچھلے صفحات میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو معراج کے موقع پر:۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَکَاتُهٗ

کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا:۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللهِ الصّٰلِحِیْنَ

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا میں تو دُنیا کے تمام مسلمان آجاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو کسی وجہ سے رسالت کی صحیح تبلیغ نہیں ہو سکی۔ اور وہ موحد اور نیکو کار بھی ہیں۔ اُن کے بارہ میں حضورؐ نے معراج کے موقع پر اَلسَّلَامُ .... عَلٰی عِبَادِ اللهِ الصّٰلِحِیْنَ کے الفاظ ارشاد فرمائے:۔

اس لئے قرآن میں بھی اس قسم کے لوگوں کے لئے "عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں:۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ

(سورۃ ۲۱ الانبیآء۔ آیت ۱۰۵):۔

(یعنی ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے!)

انہی وجوہ کی بنا پر جب اس دُنیا میں موجودہ "مشین کے زمانہ" کے بعد "رُوحانی زمانہ" آئے گا۔ تو تمام ممالک میں یہ "صالحین" ہی "زمین کے وارث" ہوں گے! گویا اولیائے کرام کی حکومت تو دُنیا کی "مرکزی سلطنت" ہو گی۔ اور ان "صالحین" کی اپنے اپنے ملکوں میں جو حکومتیں ہوں گی۔ وہ "مقامی سلطنتیں" کہلائیں گی:۔

ان "صالحین" کی اب دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وہ جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضورؐ کی بعثت کے پہلے اس دنیا میں موجود تھے۔ ان کو تو رسالت کی تبلیغ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور

(۲) وہ جن کو حضورؐ کی بعثت کے بعد اس وقت تک کسی وجہ سے رسالت کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں ہو سکی۔ یا آئندہ نہیں ہو سکے گی!

Marfat.com

حضورؐ نے شِق (۲) کے لوگوں کو معراج کی "سلامتی" والی دُعائے میں شامل کر کے امتِ محمدیہ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ اگر حضورؐ ان "صالحین" کو اس دُعا میں شامل نہ فرماتے۔ تو جب تک ایک مسلمان تبلیغ کے فرض سے سبکدوش نہ ہوتا۔ اُس کی نجات نہ ہو سکتی؛ اور اس سلسلہ میں ہمارا اس وقت تک جو رویہ رہا ہے۔ اُس کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ ایسی صورت میں ہم سب عذاب کے ہی مستحق ہوتے!

حضورؐ کی معراج والی دعا اس امر کی بھی ایک بیّن دلیل ہے۔ کہ آپؐ کی دُعائیں صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس وقت تک ہر صالح غیر مسلم پر جاری وساری ہیں۔ اور قیامت تک اس قسم کے لوگوں پر اسی طرح جاری وساری رہیں گی! یہی حضورؐ کے رحمۃ للعلمین ہونے کا بیّن ثبوت ہے!

انسان کے "عدوٌ مبین" کی چالیں

گذشتہ صفحات میں ہمیں اس بات کا علم ہو چکا ہے۔ کہ "انسانی شعور" کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس کے مدارج کیا ہیں؟ یہ مدارج حاصل کس طرح ہوتے ہیں؟ اور زائل کس طرح؟ لہٰذا اب ہم آسانی سے انسان کے "عدوٌ مبین" کی چالوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک بچہ پانچ یا چھ سال کا ہوتا ہے۔ تو اُسے خدا اور رسولؐ یا بہشت و دوزخ کے متعلق تو کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ البتہ جو ضمیر ہر انسان کے دل میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اُس سے وہ معمولی معمولی اچھے یا بُرے کاموں کو سمجھنے کا شعور رکھتا ہے: مثال کے طور پر آپ ایک اس عمر کے بچے کو دو بسکٹ دیں۔ اور اُس سے کہیں۔ کہ ایک بسکٹ تو وہ خود کھالے۔ اور دوسرا ساتھ والے گھر میں فلاں بچے کو دے آئے: چنانچہ وہ بچہ ایک بسکٹ تو خود کھالے گا۔ لیکن جب وہ آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہوگا۔ تو اُس کے سامنے دو راستے کھلے ہوں گے۔ یا تو وہ دوسرا بسکٹ ہمسائے کے گھر میں بچہ مذکور کو دے آئے گا۔ اور یا وہ اُسے بھی خود ہی کھائے گا۔ اور آپ سے جھوٹ کہہ دے گا۔ کہ وہ اُسے دے آیا ہے: جس بچے نے اپنے ہی حصّہ کا بسکٹ کھایا۔ اس کی بابت تو "انسانی شعور" والی فصل میں ہم پڑھ آئے ہیں۔ کہ وہ روشن ضمیر ہوگا۔ اور وہ ہر معاملہ کو اُس کے اصلی رنگ میں دیکھے گا: لیکن جس نے ہمسائے والے لڑکے کا حصّہ بھی خود ہی کھا لیا۔ اور اُس کی یہ قبیح عادت پھر جاری رہی۔ تو وہ خواہ کتنی ہی جماعتیں پاس کر لے اور لکھنے پڑھنے کی کتنی ہی لیاقت یا ڈگریاں حاصل کر لے۔ وہ صاحبِ ضمیر تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ بے شعور ہی رہے گا:

لے تفصیل کے لئے دیکھیں صفحہ ۱۷۵:

Marfat.com

اب یہ بھی بے شعوری ہی ہے - جو اس دُنیا میں تمام فسادوں کی جڑ ہے - لیکن انسان کے ''عدو'' مبین'' کے پاس صرف یہی ایک نہایت کامیاب حربہ ہے - جو وہ ہر انسان پر چلاتا ہے - اور جو اس جال میں پھنس گیا - وہ توبہ کے بغیر تمام عمر اس کے بُرے نتائج سے بچ نہیں سکتا :

اسی حربہ سے انسان جھوٹا - کنجوس - تنگدل - بے انصاف - فریبی - چالاک - خود پسند - حاسد - کینہ ور - متکبّر - لالچی مادہ پرست اور بد معاش ہوتا ہے - اور اس کرّۂ ارض پر جتنا بھی فساد ہے - وہ انہی بد اطواریوں کا نتیجہ ہے :

اسی بے شعوری کی وجہ سے یا تو انسان خدا کو مانتا ہی نہیں - اور اگر مانتا ہے - تو اُس کے ساتھ یا شرک کرتا ہے - یا خدا کے متعلق اُس کا تخیل درست نہیں ہوتا !

اسی لئے انسانوں کی ذہنیّت کے اِس وقت تین درجے ہیں :- ا، ب، ج

جن لوگوں کی ذہنیّت الف درجہ پر ہوتی ہے - وہ تمام دُنیا کو ایک سمجھتے ہیں : اُن کے نزدیک دُنیا کے ممالک کے نام مختلف اس لئے ہیں - کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں - کہ فلاں لوگ ایرانی ہیں، اور فلاں فرانسیسی :

اُنکے نزدیک اِنسان کا اپنا کُچھ بھی نہیں ہوتا - چُونکہ وہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آیت الکرسی) کے قائل ہوئے ہیں[1] :

لیکن جن لوگوں کی ذہنیّت ب درجہ پر ہوتی ہے - وہ ''میرے اور تیرے'' کے چکّر میں پڑ جاتے ہیں :

یعنی فلاں مُلک رُوسیوں کا ہے - اور فلاں افغانوں کا : یہاں تک کہ زمین کے اوپر جو ''فضا'' ہے - اُس پر بھی ہر مُلک اپنا قبضہ جماتا ہے - جیسے کہ وہ ''فضا'' اُس کے '' باوا '' کی ہے ! بھارت آجکل اسی کھُلی ہوئی حماقت کے چکّر میں پھنسا ہُوا ہے[2] !

اِس سے بھی نیچے ایک ذہنیّت ج درجہ پر ہوتی ہے - اِس ذہنیّت کے لوگ ایک اچھے بھلے مُلک کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں - کہ فلاں مُلک کا فلاں حِصّہ بنگالیوں کا ہے - اور فلاں حِصّہ غیر بنگالیوں کا !

یہ ذہنیّت کا پست ترین درجہ ہے[3] !

اِنسان کے '' عدو'' مبین'' کی آجکل یہی چالیں ہیں !

---

[1] : ایسی حالت میں ایک اِنسان کو ''سونے کی انگوٹھی'' سے تشبیہ دی جا سکتی ہے !

[2] : اِس صورت میں اِنسان ''سونے کی انگوٹھی'' نہیں ہوتا - بلکہ ''چاندی کی انگوٹھی'' ہوتا ہے !

[3] : اِس صورت میں اِنسان ''چاندی کی انگوٹھی'' بھی نہیں ہوتا - بلکہ '' ملمّع کی انگوٹھی'' ہوتا ہے : یہی حالت ہے - جبکہ '' ملمّع کی انگوٹھی'' ''پھر'' چاندی کی انگوٹھی'' کو یہ کہتی سُنائی دیتی ہے کہ میں اَور، تُو اَور، میں نہ تیرے سنگ رہُوں گی !

لہٰذا اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے - کہ وہ پہلے خُود ''سونے کی انگوٹھی'' بنیں - اور پھر تمام بنی نوعِ اِنسان کو ''سونے کی انگوٹھی'' بنائیں !

نوٹ: (فرعون اور نمرود میں یہی ذہنیت کام کرتی ہے !)

Marfat.com

قرآن میں لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ کے الفاظ کو صالح غیر مسلموں کی نجات کیلئے کافی سمجھنے پر ایک اعتراض اور اسکا جواب

جن آیات میں قرآن نے لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورۃ ۴۶ الاحقاف۔ آیت ۱۳)

(یعنی بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا۔ کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس بات پر قائم رہے۔ تو اُن کو قطعاً کوئی خوف نہ ہوگا۔ اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے):

(۲) مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۱۱۲)

(یعنی جو اپنی جبین نیاز کو اللہ کے سامنے جھکا دے۔ اور نیکوکار بھی ہو تو اُس کے رب کے ہاں اُس کے لئے اجر ہوگا۔ اور نہ اُن کو خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے):

(۳) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۶۲)

(یعنی بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور وہ جو یہودی، نصرانی اور صابی ہوئے۔ اُن میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں۔ اور نیک عمل کریں۔ اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور اُن کو (آئندہ) نہ خوف ہوگا۔ اور نہ حزن و ملال):

اس کتاب میں صالح غیر مسلموں کی نجات کے لئے (جن کو رسالت کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں ہوئی) انہی قرآنی الفاظ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کو سند لیا گیا ہے:

مندرجہ بالا آیات میں قرآن نے انسان کی نجات کے لئے جو کم از کم شرط لگائی ہے۔ وہ خدا پر ایمان اور اخلاقی قوانین کی پیروی ہے[1]: لیکن اس سلسلہ میں علامہ سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں یہ اعتراض کیا ہے۔

---

[1] آیت نمبر ۱ میں اخلاقی قوانین کی پیروی کی بھی شرط نہیں۔ لیکن اللہ کو رب ماننا اور پھر اُسی پر قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نیک کرداری نہایت لازمی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ایک انسان کا خدا پر ایمان لسانی ہوگا۔ قلبی نہیں ہو سکتا:

Marfat.com

کہ اگر ایک انسان کی نجات کے لئے صرف لاخوف الخ کے قرآنی الفاظ کو ہی کافی سمجھ لیا جائے۔ تو پھر ایک محض منجر شخص کی بھی نجات ہو جانی چاہیئے۔ جو خواہ خدا اور رسالت دونو پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی لاخوف الخ کے الفاظ تو موجود ہیں۔ لیکن اس میں نہ خدا پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ نہ رسالت کی کوئی شرط ہے ؛ آیت یہ ہے :-

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

(سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲۷۴) ؛

(یعنی جو لوگ خرچ کرتے ہیں۔ اپنے مالوں کو رات اور دن چھپا کر یا علانیہ اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ نہ اُنہیں کسی قسم کا اندیشہ ہوگا۔ اور نہ غم) ؛

اب بیشتر اس کے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کی جائے۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ معترضِ موصوف کس مدرسۂ فکر کے پیرو ہیں؟ یہ اس لئے ضروری ہے۔ کہ جب کسی مسلک کے متعلق یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اُس کے فکر کی سطح کیا ہے؟ تو پھر اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ فکرِ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کا اہل بھی ہے۔ یا نہیں!

جیسا کہ ان صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے ۳، فرقوں میں سے ۲، کا مسلک صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان "خدا اور رسول پر ایمان لا کر نیک بنے۔ تاکہ وہ جنت میں جا سکے" ؛ ان تمام فرقوں کی کتابوں یا وعظوں میں "خدا کی معرفت" کا اوّل تو ذکر تک نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو بھی۔ تو برسبیلِ تذکرہ۔ یعنی اِس کو مقصدِ حیات نہیں سمجھا جاتا[1]؛ مثال کے طور پر اگر اِس مسلک کے لوگوں سے یہ سوال کیا جائے۔ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا مطلب کیا ہے؟ تو اُن کا جواب کچھ اس قسم کا ہوتا ہے :

"زمین کہیں پتھریلی ہوتی ہے۔ اور کہیں نرم۔ پتھریلی زمین میں جب بیج بویا جاتا ہے۔ تو باوجود بارش برسنے کے اس میں کچھ نہیں اُگتا۔ لیکن وہی بیج جب نرم زمین میں بویا جاتا ہے۔ تو وہ پھلتا پھولتا ہے ؛ اسی طرح "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو لوگ شقی القلب ہوں گے۔ وہ تو قرآن کی تعلیمات سے ہدایت نہیں پا سکیں گے۔ لیکن جو

---

[1] یہ نظریہ کہ انسان کا مقصدِ حیات محض خدا کو ماننا اور صالح ہونا نہیں۔ بلکہ "خدا کی معرفت" ہے۔ اس کا بہترین اشارہ قرآن کے انہی الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ اس نکتہ کی تشریح صفحات ۳۸ تا ۴۱ میں گزر چکی ہے ؛

Marfat.com

لوگ سلیم الفطرت ہوں گے۔ وہ اس صحیفہ سے ہدایت پائیں گے!

اِس سلسلہ میں مندرجہ بالا مسلک کے لوگوں نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ تو "متقین" کہلا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا قرآن کی اس آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر ہی نہیں ؛ لیکن اگر اس قسم کے لوگ توبہ کریں۔ اور سچ بولنے لگ جائیں۔ تو پھر وہ چونکہ "متقین" کہلانے کے حقدار ہیں۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے۔ کہ اس صحیفہ میں ایسے لوگوں کے لئے ہدایت ہے ؛ اب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ "متقین" تو ہوتے ہی "ہدایت یافتہ" ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو "ہدایت" کے کیا معنی؟ قرآن کا یہاں مفہوم یہ ہے۔ کہ چونکہ اس دُنیا کی تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ دُنیا کے لوگوں کو "خُدا کی معرفت" حاصل ہو۔ لہٰذا اس صحیفہ کی تعلیمات سے "متقین" خدا تک پہنچ سکیں گے۔ گویا وہ "خُدا رسیدہ" ہو سکیں گے!

صرف یہی نہیں۔ بلکہ "خدا کی معرفت" کا چونکہ اقتضا یہ ہے۔ کہ خدا کا دیدار ہو۔ اور دیدار کے لئے تجلیات لازمی ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا مختصر سے قرآنی الفاظ میں راز یہ ہے۔ کہ جو لوگ قرآن کی ہدایت سے مستفیض ہوں گے۔ ان پر جب رب العزت کی تجلیات وارد ہوں گی۔ تو وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح بیہوش ہو کر نہیں گر پڑیں گے۔ اور نہ جس زمین کے خطہ پر وہ اس وقت موجود ہوں گے۔ وہ طُور پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

گویا قرآن یہاں جس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک دُنیا "سکول سٹیج" میں تھی۔ کیونکہ تب تک "خُدا کی معرفت" کی "تکمیل" نہیں ہوئی تھی ؛ اب حضورؐ کی بعثت کے بعد چونکہ "خُدا کی معرفت" کی "تکمیل" ہو چکی ہے۔ گویا اب "نعمت کا اتمام" ہو چکا ہے۔ اور یہ اتمام "خُدا کے دیدار" کی نعمت میں مضمر ہے۔ لہٰذا اب زمانہ "سکول سٹیج" سے گزر کر "کالج سٹیج" میں پہنچ چکا ہے۔ جس کا بالفاظِ دیگر مطلب یہ ہے۔ کہ قرآن صرف "سکول کا کورس" ہی نہیں ہے۔ بلکہ "کالج کا کورس" بھی ہے!

اب اگر ہم قرآن کے اِس ادنیٰ راز کو ہی نہ سمجھ سکیں۔ تو ہم قرآن کی کسی قسم کی تفسیر کرنے کے کس طرح اہل ہو سکتے ہیں؟ اس سے ثابت ہوا۔ کہ جن لوگوں کے نزدیک انسان کا مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" نہیں ہے۔ بلکہ محض نیک ہو کر جنت میں جانا ہے۔ وہ کالج کے کورس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے!

یہاں تک تو صرف یہ بتایا گیا ہے۔ کہ علامہ موصوف جس مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس کی تفسیریں سطحی کیوں ہیں؟

Marfat.com

اب علامہ موصوف کی کتاب "الدین القیم" میں سے اُن کا ایک فقرہ درج کیا جاتا ہے۔ جس سے مولانا کے اپنے تخیل کی سطح کا آسانی سے اندازہ ہوسکتا ہے: وہ فرماتے ہیں ۔

"جو شخص صرف عقل وحواس کے بھروسہ پر وحی و نبوت سے بے تعلق ہوکر یہ کہتا ہے۔ کہ عالم کی ابتدا خدائے زندہ سے ہوئی۔ تو کیا اُس کی وہم پرستی میں کچھ شبہ ہے"؟

علامہ موصوف کا یہاں مطلب یہ ہے ۔ کہ اگر کوئی شخص کسی نبی کا قول سُن کر یہ کہے ۔ کہ اس کائنات کا خالق خدائے زندہ ہے ۔ یا کسی الہامی کتاب میں یہی بات پڑھ کر اُسے دُہرائے ۔ تو اُس شخص کے پاس ایسی بات کہنے کے لئے سند موجود ہے۔ چونکہ نبی کو وحی کے ذریعہ اِس بات کا علم ہُوا ۔ کہ اِس عالم کی ابتدا خدائے زندہ سے ہوئی : لیکن اگر کوئی شخص اِسی بات کو اپنی عقل کی بنا پر کہے گا ۔ تو یہ وہم ہی ہوسکتا ہے ۔ کیونکہ کیا ایسے شخص نے ازل کے روز خدا کو دنیا کی تخلیق کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔ کہ وہ اِس عالم کی ابتدا کو خدائے زندہ کی تخلیق سمجھ رہا ہے ؟

جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں واضح کیا جاچکا ہے ۔ اِس قسم کا استدلال کرتے وقت ہم اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہدِ الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا ۔ اُس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے ۔ لہٰذا ہر سلیم الفطرت شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جو تھوڑا سا بھی تفکر کرے گا ۔ وہ اِس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہے ۔ کہ دُنیا کے اِس محیر العقول کارخانہ کا کوئی خالق ضرور ہے ۔ اور ایسا شخص ہی پھر ذی عقل اور صاحبِ فہم کہلاتا ہے ۔ ورنہ جو شخص اپنے تفکر میں اتنی گہرائی بھی نہیں رکھتا ۔ اُس میں اور حیوان میں فرق ہی کیا ہے ؟

اِسی طرح بعض لوگ یہ کہتے بھی سُنے گئے ہیں ۔ کہ اگر ہمیں انبیاء کی تعلیم یہ نہ بتلاتی ۔ کہ سچ بولنا اچھا ہے ۔ اور جھوٹ بولنا بُرا ۔ تو ہمیں پتہ ہی کس طرح چلتا ۔ کہ اول الذکر امر ہے ۔ اور موخر الذکر نہی ! اِس قسم کے لوگوں کو اتنا بھی علم نہیں ۔ کہ ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ایک ضمیر ودیعت کی گئی ہے ۔ جو اُسے بتلاتی ہے ۔ کہ سچ بولنا اچھا ہے ۔ اور جھوٹ بولنا بُرا ! اِسی لئے اسلام لوگوں کو یہ نہیں کہتا ۔ کہ جھوٹ مت بولو ۔ بلکہ پوچھتا ہے ۔ کہ جھوٹ کیوں بولا ؟ یہ اِس لئے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر اِس وقت تک زمانہ اتنی ترقی کرچکا ہے ۔ کہ ہر بالغ شخص سے اب یہ توقع کی جاتی ہے ۔ کہ وہ یہ از خود سمجھے کہ سچ بولنا اچھا ہے ۔ اور جھوٹ بولنا بُرا : بالکل اسی طرح اسلام اب دُنیا کو یہ بھی نہیں کہتا ۔ کہ خدا کو مانو ۔ بلکہ نہ ماننے والوں کو پوچھتا ہے ۔ کہ تم کیوں نہیں مانتے ؟ اور پھر شرم دلاتا ہے ۔ کہ ہوش وحواس رکھتے ہوئے کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں ۔ کہ تم یہ سمجھو کہ اِس محیر العقول کارخانہ کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیئے ؟

اب علامہ موصوف کا سطحِ فکر ملاحظہ ہو ۔ کہ وہ ایسے ذی فہم انسان کو جو از خود توحید کا قائل ہے ۔ اُس کے فکر کو وہم تصور کرتے ہیں ! گویا اُنہوں نے اِس بات پر غور ہی نہیں کیا ۔ کہ اگر کوئی شخص ایک اچھی بات از خود کہے ۔ اور دوسرا

Marfat.com

شخص اُسی بات کو کسی دوسرے سے سُن کر کہے۔ تو دونوں میں سے کون بہتر ہے؟

جب کوئی شخص توحید کا از خود قائل ہوتا ہے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا[1]۔ گویا ہر شخص فطرت اللہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ فطرت صرف توحید ہی ہے؛ اسی لئے اگر ایک مسلمان قرآن کو پڑھ کر اس کائنات کے پیچھے کسی ماورا طاقت کا قائل ہو سکتا ہے۔ تو ایک غیر مسلم بھی صرف اپنی عقل کی رُو سے ایک خدائے زندہ کو اس دُنیا کا خالق سمجھ سکتا ہے! اِس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ ایسی بات کہنا ہی تو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے! اب اگر کوئی صاحب اس قسم کی احسن ترین بات کو ہی وہم قرار دیں۔ تو اُن کی عقل و دانش پر تعجب ناگزیر ہے!

اب اِس تمہید کے بعد اُس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں اُٹھایا ہے؛ یعنی یہ کہ اگر ایک انسان کی نجات کے لئے قرآن کے الفاظ لاخوف الخ ہی کافی ہیں۔ تو کیا ایک محض مخیّر شخص کی نجات ہو جائے گی جس کا خدا اور رسولؐ دونو پر ایمان نہ ہو۔ چونکہ مندرجہ ذیل آیت میں بھی لاخوف الخ والے الفاظ تو آئے ہیں۔ لیکن اُس میں خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کی کوئی شرط نہیں ہے؛ وہ آیت (جو پہلے بھی لکھی جا چکی ہے) یہ ہے:۔

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(سورۃ ۲ البقرۃ - آیت ۲۷۴)

(یعنی جو لوگ خرچ کرتے ہیں۔ اپنے مالوں کو رات اور دن چھپا کر یا علانیہ اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ نہ اُنہیں کسی قسم کا اندیشہ ہوگا۔ اور نہ غم)

یہاں سب سے پہلا سوال یہ ہے۔ کہ اگر رب العزت ایک مخیّر شخص کو اتنے بیّن اور غیر مبہم الفاظ میں نجات کی خوشخبری دیں۔ تو کسی انسان کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے۔ کہ وہ خدائے زندہ کی عطا یا دین پر معترض ہو؟

دوسرے جس نکتہ کو یہاں سمجھا نہیں گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اِس دُنیا میں ایک انسان کو صرف دو فرائض ادا کرنے ہیں:۔

(۱) حقوق اللہ۔ اور

---

[1] سورۃ ۳۰ الروم - آیت ۳۰

(۲) حقوق العباد

حقوق اللہ کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ایک انسان خدا کے "حسن" کی اپنے "عشق" سے "داد" دے۔ اور اسلام کی تمام عبادات، صرف اس "داد" کا ہی حق ادا کرتی ہیں :

حقوق العباد میں یہ لازمی ہے۔ کہ ایک شخص بنی نوع انسان سے اتنی ہمدردی کرے۔ کہ اس کی خدمت میں اپنا سب کچھ فی سبیل اللہ نچھاور کردے! اور اس انفاق میں بھی یہ صورت کہ جب ایک انسان کسی کو کچھ دے۔ تو دینے والے دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ احسن ترین صورت ہے :

اب عام انفاق کی صورت میں خدا تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے :-

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

(سورۃ البقرۃ۔ آیت ۲۶۱) :

[یعنی ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنا مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ ایسی ہے۔ جیسا کہ (بیج کا) ایک دانہ ہو۔ جس سے سات خوشے پیدا ہوں۔ ہر ایک خوشہ میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے۔ بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے :

گویا اگر ایک شخص اللہ کی راہ میں ایک روپیہ دے۔ تو اسے نہ صرف سات سو روپوں کی خیرات جتنا ثواب ملتا ہے۔ بلکہ جب اللہ چاہے۔ اس سے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سلسلہ میں ایک حدیث ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ اسے اتنا اجر دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے ایک پہاڑ جتنے وزن کی خیرات کی ہو: گویا اس طرح ایک روپے کے بدلہ میں ثواب کروڑ ہا روپوں کی خیرات تک پہنچ جاتا ہے :

اب معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :-

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

(سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲۷۱) :

یعنی اگر تم علانیہ خیرات کرو۔ تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر مخفی طور پر حاجتمندوں کو دو۔ تو وہ تمہارے لئے اور بھی اچھا ہے۔ (اور یہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ) اللہ تم سے تمہاری برائیاں

دُور کر دے گا۔ اَور اللہ اُن تمام باتوں سے باخبر ہے۔ جو تم کرتے ہو) ؛

یہاں دو نکتے ہیں ؛ ایک تو یہ کہ مخفی طور پر خرچ کرنا علانیہ خرچ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور دوسرا جو نہایت ہی اہم نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس خیرات سے انسان کی بُرائیاں دُور کر دی جاتی ہیں ؛

اب جب کسی شخص کی بُرائیاں دُور کر دی جاتی ہیں۔ تو پھر کیا ہوتا ہے ؟ اس کا ذکر ایک دوسری آیت کے اس ٹکڑے میں ہے :

وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۹۳)

(یعنی ہماری بُرائیوں کو ہم سے دُور کر اور نیکوکاروں کے ساتھ خاتمہ کر) ؛

قرآن کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب ایک انسان کی بُرائیاں دُور کر دی جاتی ہیں۔ تو اُس کا خاتمہ نیکوکار کے ساتھ ہو سکتا ہے ؛

اس تمام بحث کی جڑ الٰہی الفاظ میں ہے ؛ اب پیشتر اس کے کہ ہم ان الفاظ سے کوئی سبق حاصل کریں۔ پہلے جہاں سے مسئلہ شروع ہُوا ہے۔ اُس کو سامنے لائیں ؛

سوال صرف یہ ہے۔ کہ ایک ایسے مخیر شخص کی نجات کس طرح ہو سکتی ہے۔ جس کا [illegible] خدا اور رسولؐ دونو پر ایمان نہ ہو ؛

جہاں تک نبی آخر الزماںؐ پر ایمان کا تعلق ہے۔ (جیسا کہ ان صفحات میں بار بار ذکر کیا گیا ہے) اس کا انحصار تبلیغ پر ہے ؛ اگر کسی غیر مسلم کو رسالت کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں ہوئی۔ اُس سے نبی آخر الزماںؐ پر ایمان کی توقع نہیں کی جا سکتی ؛

اب باقی رہا۔ ایک غیر مسلم کا خدا پر ایمان۔ تو اس سلسلہ میں ہمارا رُوئے سخن اس وقت صرف [illegible] کی طرف ہے۔ جو مخیر ہے ؛

"انسانی شعور" والی فصل میں یہ بات پوری طرح واضح کی جا چکی ہے۔ کہ جو شخص بھی اخلاقِ حسنہ [illegible] وہ لازمی طور پر روشن ضمیر ہوگا ؛ اور جو انسان روشن ضمیر ہوتا ہے۔ اُس کی روشن ضمیری کا [illegible] ہے۔ کہ وہ اِس دُنیا کے محیر العقول کارخانہ کو دیکھ کر یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ کہ اس پردۂ [illegible] کے پیچھے کوئی ماورا طاقت ضرور ہے۔ جو اس کائنات کی خالق ہے ؛

لہٰذا ایک مخیر شخص جس کے بارہ میں قرآن اتنا مداح ہے۔ کہ اُسے صرف ایک روپے کے عوض میں [illegible] اور لاکھوں گنا اجر دینے کی بشارت دیتا ہے۔ اس سے اوّل تو یہ توقع رکھنی چاہیئے۔ کہ وہ از خود خدائے زندہ کا قائل ہے۔ لیکن اگر وہ ایسے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ جس کے افراد بُت پرست ہیں۔ تو پھر اس صورت میں بھی اُس کی [illegible]

Marfat.com

محض خیرات ہی اِس بات کی ضامن ہے۔ کہ وہ زود یا بدیر خدائے زندہ کا دل وجان سے ماننے والا ہو جائے گا۔ یہ اِس لئے کہ خیرات کی بدولت انسان سے اُس کی بُرائیاں دُور کر دی جاتی ہیں! اسی لئے قرآن نے زیرِ بحث آیت میں خدا پر ایمان کی شرط کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا!

یہی نکات ہیں۔ جن کو علامہ مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "الدّین القیّم" میں بالکل نظر انداز کیا ہے!

تقدیر و تدبیر کا مسئلہ

اب ایک اَور بات جہاں عام طور پر ہمارے انگریزی تعلیمیافتہ مسلمان ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ تقدیر و تدبیر کا مسئلہ ہے:

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے۔ کہ ایک انسان کسی مسئلہ کو صرف اُسی صورت میں صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ اُس کا اِدراک درست ہو: اور اِدراک کی درستی کے لئے۔ دو باتوں کا ہونا لازمی ہے:۔

(۱) اخلاقِ حسنہ کی پابندی: یہ اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر ایک انسان میں وہ بصیرت ہی نہیں پیدا ہوتی۔ جو کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اَور

(۲) خدا کے متعلق صحیح تخیّل:

اِن دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی ایک انسان کے اِدراک کو ناقص بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ باریک مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے: اَور تقدیر و تدبیر جیسے نازک مسئلہ کو سمجھنے میں جو لوگ قاصر رہے ہیں۔ وہ وہی ہیں۔ جن کا (اوپر کی دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کی وجہ سے) اِدراک درست نہیں:

بہرحال ان صفحات میں کوشش کی جائے گی۔ کہ اِس اَدَق اَور نازک مسئلہ کی اُلجھی ہوئی باتوں کو کچھ سُلجھایا جائے۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ[1] اس تمہید کے بعد آیئے اب اصلی مسئلہ کی طرف رجُوع کریں:

آج کل کے زمانہ میں بعض لوگ اِس بات کے قائل نہیں ہیں کہ جو کچھ انسانوں کے ساتھ اس دُنیا میں بیتتی ہے۔ وہ کسی تقدیر کا نتیجہ ہے: البتہ اس قسم کے لوگ تقدیر کے صرف اِن معنوں میں، اَور اِس حد تک، قائل ہیں۔ کہ قدرت نے ہر شے میں جو خاصیت پیدا کر دی ہے۔ وہی اُس کی تقدیر ہے: مثلاً پانی کی خاصیت یہ ہے۔ کہ وہ پیاس بُجھائے اور ڈھلوان کی طرف بہے۔ یہ گویا پانی کی تقدیر ہوئی: اسی طرح آگ کی خاصیت یہ ہے۔ کہ وہ جلائے۔ یہ گویا اُس کی تقدیر ہوئی: لیکن ایسے لوگ اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہ جو کچھ اس دُنیا میں ہو رہا ہے۔ وہ کس تقدیر کے تحت

---

[1] سورۂ ۱۱ ہود۔ آیت ۸۸: یعنی اَور میری توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے:

Marfat.com

ہو رہا ہے ؛

لہذا ایسے لوگ، مسلمانوں کی موجودہ تباہ حالی کو صرف اس بات پر محمول کرتے ہیں۔ کہ وہ قسمت کے قائل ہیں ؛ ان لوگوں کا اس سلسلہ میں کہنا یہ ہے۔ کہ آج کل کی دُنیا سخت تگ و دو کی دُنیا ہے۔ لیکن قسمت پر اعتقاد رکھنے والے لوگ، فکر و عمل سے تہی دست ہونے کی وجہ سے اس تگ و دو میں تو حصّہ نہیں لیتے۔ البتہ اپنی کاہلی کو قسمت پر محمول کر کے قوم کے انحطاط کے ذمہ دار بنے ہوئے ہیں ؛ لہذا اُن کے نظریے کا لُب لباب یہ ہے۔ کہ مسلمان صرف اس وقت ترقی کر سکتے ہیں۔ جب کہ اُن کے ذہن اس غلط عقیدہ سے بالکل پاک ہوں ؛

چنانچہ ڈاکٹر اقبال اپنی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam میں تقدیر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :-

(آزاد ترجمہ) "اگر ہم یہ سمجھ لیں۔ کہ تاریخ کے تمام واقعات پہلے سے مقدر شدہ ہیں۔ تو پھر ہمارے کردار کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی ؛ اس لحاظ سے ہمارے نزدیک لفظ خلقت کی قدر بھی اُس وقت تک ہے۔ جب تک کہ ہم یہ سمجھیں۔ کہ اپنی نیک کرداری کے موجد ہم آپ ہیں ؛ ورنہ اگر تاریخی واقعات کو ہم یوں سمجھنے لگیں۔ کہ یہ محض فوٹو کی تصویریں ہیں۔ جو کہ ہمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ تو ہماری ہستی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی ؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ تقدیر ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے ماننے والوں نے محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہماری روزمرہ کی زندگی کی آزادی فکر و عمل پر (جس کا ہم ہر وقت علی وجہ البصیرت مشاہدہ کرتے ہیں)۔ نظر ہی نہیں رکھی" ؛ (صفحہ ۷۹) ؛

اس قسم کے خیالات کی موجودگی میں یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر عقل و فکر کی روشنی میں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں ؛

اس سلسلہ میں جو سب سے پہلے سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آیا اس دُنیاوی زندگی میں انسان کی پیدائش اور موت کا کوئی دن اور وقت معین ہے۔ یا نہیں ؟

اس بارہ میں قرآن ہماری رہبری ان الفاظ سے کرتا ہے :-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِندَهُ ۖ ثُمَّ أَنتُمْ تَمْتَرُونَ (سورۃ ۶ الانعام - آیت ۲) ؛

(یعنی اللہ وہ ذات ہے۔ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کی میعاد ٹھہرا دی۔ اور وہ میعاد اُس کے ہاں مقرر ہے۔ پھر بھی تم شک کرتے ہو؟) ؛

Marfat.com

اس لئے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہر شخص کی زندگی کی میعاد مقرر ہے ؛؛ اب جب ہم ایک شخص کی زندگی کی میعاد کو مقرر شدہ تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہر شخص کی پیدائش و موت کے وقت کے تعین کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح پھر نہ صرف ایک انسان کی زندگی کا ہر لمحہ بلکہ ہر لمحہ کے ساتھ **ہر عمل** بھی مقدر شدہ ثابت ہوتا ہے ؛؛

اس سلسلہ میں اب ایک معمولی سی مثال لے لیجئے ؛؛

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک شخص بشیر، اپنے دوست عبداللہ کے ہاں ایک صبح، اچانک پہنچ جاتا ہے ؛؛ دونو کو چونکہ ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق بہت عرصہ کے بعد ہوا۔ لہٰذا وہ نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور آخر یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنا دن شالامار باغ میں گزاریں گے ؛؛ چنانچہ عبداللہ کہتا ہے۔ کہ وہ ذرا غسل کر لے۔ پھر وہ دونو اکٹھا ناشتہ کر کے شالامار باغ جائیں گے ؛؛ چنانچہ ان دونو امور سے فارغ ہو کر وہ گھر سے چل پڑتے ہیں۔ اور ایک ٹیکسی کرایہ پر لیتے ہیں ؛؛ گھر سے کچھ دور جب وہ ایک چوراہے پر پہنچتے ہیں۔ تو اُن کی ٹیکسی کی ایک دوسرے ٹرک سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عبداللہ معاً جاں بحق ہو جاتا ہے۔ لیکن بشیر کو کچھ چوٹیں ہی آتی ہیں ؛؛ بشیر کے بچنے کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ حادثہ کے وقت اُس کا ہاتھ ٹیکسی کے دروازہ کے ہینڈل پر تھا ؛؛ ٹکر کے جھٹکے سے ہینڈل دب گیا۔ اور ٹیکسی کا دروازہ کھل گیا۔ اور بشیر باہر گر پڑا۔ جس سے اُس کو چوٹیں تو آئیں۔ لیکن جان بچ گئی ؛؛

حادثہ کی وجہ بعد میں یہ معلوم ہوئی۔ کہ ٹیکسی کا ڈرائیور مخمور تھا ؛؛ بہرحال اِس حادثہ کو جس بات نے انتہائی المناک بنا دیا۔ وہ یہ تھی۔ کہ عبداللہ جو جاں بحق ہوا۔ اُس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اِس حادثہ سے اُس کی بیوی کو بے حد صدمہ ہوا ؛؛ چنانچہ بشیر نے یہ محسوس کرتے ہوئے۔ کہ عبداللہ کی موت کا وہ ایک حد تک ذمہ دار ہے۔ اُس نے کچھ عرصہ کے بعد عبداللہ کی بیوی کا صدمہ مٹانے کے لئے اُس سے شادی کر لی ؛؛

اب فرض کر لیجئے۔ کہ عبداللہ جس روز اِس دُنیا سے راہئ عدم ہوا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور صبح کے سوا نو بجے تھے ؛؛ اب دیکھنے والی بات صرف یہ ہے۔ کہ قُدرت نے اس کی مَوت کے سلسلہ میں کیا اہتمام کیا ؛؛ قدرت نے انتظام یہ کیا۔ کہ :-

(۱) بشیر عبداللہ کے گھر ایک جمعہ کے روز عین آٹھ بجے صبح پہنچے ؛؛

(۲) سوا آٹھ بجے عبداللہ غسل کرے ؛؛

(۳) ساڑھے آٹھ بجے عبداللہ اور بشیر دونو ناشتہ کے لئے بیٹھیں ؛؛

(۴) پونے نو بجے وہ دونو گھر سے روانہ ہوں ؛؛

(۵) نو بجے وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھیں۔ اور

(۶) سوا نو بجے اُن کی ٹیکسی کی ایک دوسرے ٹرک سے ٹکر ہو!

Marfat.com

چنانچہ ان تمام سلسلہ وار "بہانوں" کے بعد قدرت نے مقدر یہ کیا۔ کہ اس حادثہ میں عبداللہ تو معاً جاں بحق ہو۔ اور بشیر کو کچھ چوٹیں ہی آئیں :۔

اسی طرح بشیر کے آنے سے پہلے عبداللہ کی زندگی کے تمام واقعات کا سلسلہ اگر جوڑتے چلے جائیں۔ تو یہ سلسلہ عبداللہ کی پیدائش تک پہنچ جائے گا :۔

لہٰذا منطق کی رُو سے یہ ثابت ہوا۔ کہ ہر ایک انسان کی زندگی کے نہ صرف سب لمحات مقرر ہیں۔ بلکہ یہ بھی مقدر ہو چکا ہے۔ کہ ہر لمحہ میں کیا واقعات رُونما ہوں۔ اور ہر واقعہ میں کس کس شخص کا تعلق ہو :۔

اب اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں :۔

(۱) قدرت کی طرف سے جو مخصوص حالات لمحہ بہ لمحہ رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ اُن پر انسان کا کوئی بس نہیں! لیکن

(۲) ان حالات میں جو انسان کا عمل یا رویہ ہوتا ہے۔ اُس میں انسان کو نہ صرف مکمل آزادی فکر ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کو عمل کی بھی پوری پوری آزادی ہوتی ہے :۔

یہ اس لئے کہ بشیر کی مثال سے ظاہر ہے۔ کہ عبداللہ کے جاں بحق ہونے کی اصل وجہ :۔

اولاً۔ بشیر کا اُس کے ہاں اچانک پہنچنا تھا۔

ثانیاً۔ بشیر اور عبداللہ کا ایسی ٹیکسی میں بیٹھنا۔ جس کا ڈرائیور مخمور تھا۔ اور

ثالثاً۔ ایک چوراہے پر ایک دوسرے ٹرک کا عین اُس وقت گذرنا، جب کہ اُن دونوں کی ٹیکسی بھی وہاں سے گزر رہی تھی :۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ ان تینوں باتوں میں عبداللہ کے بس کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ لیکن اس صورتِ حالات میں عبداللہ اور بشیر کا اپنی خوشی سے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ دونوں شالامار باغ جائیں۔ پھر اپنی خوشی سے دونوں کا ایک ٹیکسی پر سوار ہونا۔ اور پھر اُس کے ڈرائیور کو ہدایت کرنا کہ وہ شالامار جائے۔ جس کے راستہ میں حادثہ والا چوراہا ضرور ہی پڑتا تھا۔ ایسی باتیں ہیں۔ جن سے ان دونوں کی مکمل آزادی فکر پر پوری روشنی پڑتی ہے :۔

لہٰذا جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ اب ہم یہ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ :۔

(۱) لمحہ بہ لمحہ حالات خدا کی طرف سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جن پر انسان کا کوئی بس نہیں۔ لیکن

(۲) ان حالات میں انسان کا جو رویہ ہوتا ہے۔ اُس میں اُس کو نہ صرف پوری آزادی فکر ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کو پوری آزادئ عمل بھی حاصل ہوتی ہے :۔

Marfat.com

اب ایک (۱) تقدیر ہے۔ اور (۲) تدبیر:۔

لیکن اس (۲) کے بھی دو پہلو ہیں۔ یعنی اس تدبیر کو بھی دو پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے:۔

اوّل۔ انسانی زاویۂ نگاہ سے۔ اور

دوم۔ خدائی زاویۂ نگاہ سے:۔

جہاں تک تدبیر کو انسانی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے۔ یہ تو ہمارے روزمرّہ کے تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے۔ کہ انسان اس دُنیا میں جو فعل بھی کرتا ہے۔ اس میں اُس کو پوری فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے:۔

لیکن جب ہم اسی تدبیر کو خدائی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو جیسا کہ عبداللہ کی مثال سے ظاہر ہے۔ ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ لَا تَتَحَرَّکُ ذَرَّۃً اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ :۔ گویا تدبیر بھی دراصل تقدیر کی ہی پیروی کرتی رہتی ہے:۔ گویا دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ کسی تقدیر کے تحت ہی ہو رہا ہے:۔

تقدیر کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے۔ کہ جونہی کوئی فرعون اپنے ظلم کی انتہا کو پہنچتا ہے۔ عین اُسی وقت (اور جگہ) ایک موسیٰؑ بھی نمودار ہو جاتا ہے:۔ گویا ایک ابراہیمؑ اپنے جوبن کو صرف اُس وقت پہنچتا ہے۔ جب کہ کوئی نمرود اُس کو آگ میں پھینکنے کے لئے تیار ہو!

اگر یہ تمام سلسلے اس طرح مقدر نہ ہوتے۔ تو حالات کچھ اس قسم کے ہوتے۔ کہ ایک صدی میں فرعون ظلم کرتا۔ تو موسیٰؑ کسی دوسری صدی میں پیدا ہوتا:۔ نہ صرف یہ، بلکہ ایک مشرق میں ہوتا۔ تو دوسرا مغرب میں:۔ گویا نہ وہ ایک دوسرے کو ملتے۔ اور نہ دُنیا میں "ہر فرعونے راموسیٰؑ" کے محاورے زبانوں میں جنم لیتے:۔

لیکن صورتِ حالات چونکہ اس طرح نہیں ہے۔ لہٰذا ہم منطق کی رُو سے اِس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں۔ کہ جب تقدیر میں کوئی بات ہوتی ہے۔ تو اُس کی بُنیاد بیسیوں سال پہلے رکھ دی جاتی ہے:۔

مثال کے طور پر فرض کر لیجئے۔ کہ مشیتِ ایزدی یہ تھی۔ کہ یکم جنوری ؁۲۰۰۰ قبل مسیح کو 'نمرود' حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکے۔ اور آگ اُن کے لئے گلزار بنے:۔ (یہاں یہ بھی فرض کر لیجئے۔ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا۔ اُس وقت نمرود اور حضرت ابراہیمؑ کی عمر بالترتیب ۹۰ اور ۵۵ سال کی تھی):۔ اب اِس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے پہلے تو قدرت نے یہ انتظام کیا۔ کہ:۔

(۱) نمرود کی ماں کو اپنے خاوند سے یکم اپریل ؁۲۰۹۱ قبل مسیح کو حمل ہو۔ اور

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی ماں کو اپنے خاوند سے یکم اپریل ؁۲۰۵۶ قبل مسیح کو حمل ہو:۔

نہ صرف یہ بلکہ دونوں کی اُٹھان اِس طرح کی ہو۔ کہ نمرود خدا کے نام سے بیزار ہو۔ اور ابراہیمؑ اُسی خدا کا عاشق ہو۔ اور پھر جب، وہ ۹۰ اور ۵۵ سال کی عمر کو پہنچیں۔ تو عین یکم جنوری ؁۲۰۰۰ قبل مسیح 'نمرود' حضرت ابراہیمؑ کو

Marfat.com

آگ میں پھینکے ۔ اور عین اُسی دن اور وقت آگ حضرت ابراہیمؑ کے لئے گلزار بنے !
اِن ناقابل تردید دلائل کے ہوتے ہوئے ایک سلیم الفطرت انسان تقدیر کا پھر کس طرح منکر ہو سکتا ہے ؟
لہٰذا ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہے ۔ کہ تدبیر انسانی (بمعہ آزادیٔ فکر و عملِ انسانی جو کہ ہر شخص کے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ایک ثابت شدہ امر ہے) ۔ درحقیقت مشیّتِ ایزدی اور تقدیر بھی ہے !
گویا جو تقدیر ہے ۔ وہی تدبیر ہے ۔ اور جو تدبیر ہے ۔ وہی تقدیر ہے :: لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ تقدیر کوئی شے نہیں' درست نہیں ۔ یہ اس لئے کہ منطق کی رُو سے ہم تقدیر کا انکار ہی نہیں کر سکتے ::

لیکن اِس مقام پر جہاں ایک سطح بین شخص لغزش کھا جاتا ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ جب وہ تقدیر کے نظریئے کو مان لیتا ہے ۔ تو پھر وہ فوراً اِس نتیجہ پر کُود پڑتا ہے ۔ کہ ایسی صورت میں انسان کی بدکرداری کا ذمہ وار خدا ہوتا ہے !
یہاں ایک نہایت اہم اور باریک نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ خدا کی ذات **حقیقتاً** بالکل پاک اور بے عیب ہے ۔ لہٰذا جب ایک انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے ۔ تو گو وہ مشیّتِ یزدی کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اُس کی ذمہ واری خدا پر اس لئے نہیں عائد ہوتی ۔ کہ جہاں تک "شر" کا تعلق ہے ۔ چونکہ قدرت نے اِسے دُنیا میں انسانوں کے امتحان کے لئے **جان بُوجھ** کر رکھا ہے ۔ لہٰذا رب العزت کو لامحالہ ایسی صورت اختیار کرنی ہی تھی ۔ کہ اُس کی اپنی ذات کا نہ تو "شر" سے تعلق ہو ۔ اور نہ وہ اُس سے ملوّث ہو ۔ اسی لئے خالقِ حقیقی نے دُنیا کی "صنعت" میں کچھ "کاریگری" ہی اِس قسم کی رکھی ہے ۔ کہ اُس کی ذات کے لئے "شر" سے ملوث ہونا ممکن ہی نہیں ! اِس نکتہ کی باریکی کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے ۔ کہ ہم ہر معاملہ کو "منتج طریقہ" یا concrete terms میں سوچیں ۔ "خیالی نظریئے" یا abstract terms میں نہیں :: مثلاً آپ شرارت سے کسی لڑکے کو تھپڑ ماریں ۔ اور پھر اِس پر غور کریں ۔ کہ آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے ۔ کہ وہ تھپڑ آپ نے خود واقعی شرارتاً مارا ہے ۔ اور اُس سرشت کی بدولت مارا ہے ۔ جو اس دُنیا میں "شر" کے نام سے موسُوم ہے ۔ اور اس کے ذمہ وار واقعی آپ خود ہیں ۔ یا آپ دیانتدارانہ طور سے یہ محسوس کرتے ہیں ۔ کہ آپ تو بالکل بے قصُور ہیں ۔ لیکن اس تھپڑ کی ذمہ وار وہ ذات ہے ۔ جس کو بالکل پاک کہا جاتا ہے ۔ اور حقیقتاً بے عیب مانا جاتا ہے ؟

اِس سلسلہ میں یہ بھی نہایت لازمی ہے ۔ کہ ہم نہ صرف دُنیا کی تخلیق کے فلسفہ کو سمجھیں ۔ بلکہ "شر" کے فلسفہ پر بھی غور کریں :: اِن دونو کے بارہ میں اجمالاً پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ یہاں اتنا دُہرانا کافی ہے ۔ کہ دُنیا کے کھیل میں رازِ ہی صرف یہ ہے ۔ کہ "حسن" (خدا) یہاں چھُپا ہوا ہے ۔ اور ہم اُسے ڈھونڈنے آئے ہیں ۔ اور وہ ملنا شرف

Marfat.com

روشن‌ضمیری سے ہے۔ جو نہ صرف صحیح ایمان اور نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے بلکہ "شر" کی کمزوری پر فتح حاصل کرنے سے ہے۔ گویا "شر" کو، مقصد کے حصول کے راستہ میں، جان بوجھ کر رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے۔ کہ کون کس حد تک اس پر قابو پاتا ہے! اسی لئے اس دنیا کی مثال ایک "دشوار گزار دوڑ" (Obstacle Race) کی سی ہے۔ جس دوڑ میں، سب انسان، حصہ لینے والے کھلاڑی ہیں:

اب ایک کھلاڑی کو کبھی یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ یہ کہے۔ کہ دوڑ لمبی ہے۔ یا اس میں رکاوٹیں زیادہ ہیں۔ کیونکہ ایک "دشوار گزار دوڑ" (Obstacle Race) میں رکاوٹیں ہی تو اس کی اصلی جان ہیں۔ اور ان رکاوٹوں پر ہی تو ہم سب نے حاوی ہونا ہے!

مثال کے طور پر اگر ایک کرکٹ کا کھلاڑی کسی میچ میں اپنی باری لیتے وقت یہ کہنا شروع کر دے۔ کہ تین وکٹیں (wickets) بہت زیادہ ہیں، وکٹ (wicket) ایک ہونی چاہیئے! یا بیٹ (bat) چوڑائی میں بہت کم ہے۔ یہ اتنا چوڑا ہونا چاہیئے۔ جتنی کہ دوسری جماعت کے طالب علموں کے لکھنے والی تختی! اور پھر گیند کے متعلق یہ کہے۔ کہ یہ بہت سخت ہے۔ اس سے چوٹ لگنے کا ڈر ہے۔ لہذا گیند ربڑ کی ہونی چاہیئے۔ اور اس کا حجم بھی معمولی گیند کی طرح نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ فٹ بال (football) جتنا بڑا ہونا چاہیئے! اور جب وہ کسی بالر (bowler) کے بال سے آوٹ (out) ہو۔ تو وہ ہمیشہ یا تو بالر (bowler) کا نقص نکالے۔ یا امپائر (umpire) کا! تو آپ اس قسم کے شخص کے بارہ میں کیا کہیں گے۔ کہ یہ کرکٹ کا کیسا کھلاڑی ہے؟ آپ کا جواب یہی ہوگا۔ کہ یہ کھلاڑی نہیں۔ بلکہ پرلے درجہ کا اناڑی ہے! یہی حالت اُن لوگوں کی ہے۔ جو اس دنیا میں "شر" کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن اپنی بدکرداری کا خدا کو ذمہ وار ٹھہرانے لگے[1]!

"شر" دراصل دنیا میں سزا دینے کا بہانہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ جان بوجھ کر اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ اس سے کون بچتا ہے؟ اور کس کامیابی سے بچتا ہے؟ اسی لئے قرآن میں آتا ہے لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا[2] (تاکہ یہ آزمایا جا سکے۔ کہ تم میں سے کون زیادہ بہتر عمل کرتا ہے؟)

لہذا جب ایک انسان سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ تو گو وہ خدا کی مشیّت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اُس کی

---

[1] اس سلسلہ میں جس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی اندھے کے متعلق یہ کوئی خوبی نہیں۔ کہ اس نے کبھی کسی غیر محرم پر نظر نہیں ڈالی: یہ خوبی تو صرف صاحبِ نظر کی ہی ہو سکتی ہے۔ جو بدکرداری کی پوری توفیق ہونے پر اور موقع بھی میسر آ جانے کے باوجود گناہ سے بچ رہا ہے۔ وہی تو یوسفِ کنعانی ہے۔ اور مستحق عطائے تمکنت و استخلاف فی الارض بھی!

[2] سورۃ الھود۔ آیت ۷:

Marfat.com

ذمہ داری انسان پر اس لئے عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ شیطان کے پھندے میں آ گیا۔ اور اُس سے بچ نہ سکا!ؔ اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (سورۃ ۴ النسا آیت ۷۹) ؛ یعنی (اے انسان!) جب تجھے کوئی بُرائی پیش آتی ہے۔ تو وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے!

لہٰذا خدا کو انسان کی بدکرداری کا ذمہ دار ٹھیرانا بالکل اُس طرح ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی لڑکے کے امتحان میں فیل ہونے کی ذمہ داری ممتحن کے سر پر یہ کہہ کر تھوپے۔ کہ نہ وہ امتحان لیتا۔ نہ لڑکا فیل ہوتا!

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ کہ ایک انسان کسی معاملہ کی باریک گتھیوں کو صرف اُسی وقت سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ اُس کا ادراک درست ہو۔ اور ادراک کا درست ہونا صرف اس بات پر منحصر ہے۔ کہ ایک انسان کا خدا کے متعلق تخیل درست ہو!

یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اور شاعر اقبال کے خدا کے تخیل میں بہت فرق ہے ؛

دیکھیں صفحات ۸۸ تا ۹۱ ؛

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ خدا کے صحیح اور غلط تخیل سے ایک ہی شخص کے ادراک میں (ایک ہی مسئلہ کے سمجھنے کے سلسلہ میں) کس طرح فرق پڑتا ہے؟ علامہ اقبال کی مثال بہت سبق آموز ہے ؛

مثال کے طور پر تقدیر کے مسئلہ کو ہی لیجئے ؛ جو لوگ تقدیر کے فلسفہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ اُن کا رتبہ اس بارہ میں دو دقتوں کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ اول یہ کہ تقدیر کو مانا ہی نہ جائے۔ لیکن اگر اس سے مفر نہ ہو۔ تو دوم اپنی کوتاہیوں کو تقدیر (بالفاظ دیگر خدا) کے سر تھوپا جائے ؛

اب ہم نے دیکھنا یہ ہے۔ کہ جب شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کا تخیل خدا کے بارہ میں درست ہوتا

لہ یہ اس لئے کہ گناہ پر قوت پانے کی توفیق بھی تو خدا ہی کی عطا کردہ ہے ؛ خدا گناہ کا خالق اُس حیثیت سے ہے۔ کہ جس حیثیت میں بچھو اور سانپ کے زہر کا خالق ہے ؛ چنانچہ مشیتِ ایزدی اس امر کی مقتضی ہے۔ کہ بچھو اور سانپ کے زہر کے نہ صرف عزت سے بچنے کی بلکہ اُس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت خداداد عقل سے حاصل کی جائے۔ اسی طرح گناہ سے بھی بصورت بچ کر رضائے خالق کو ڈھونڈنے کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (سورۃ ۷۹، النزعت۔ آیت ۴۰۔۴۱ ؛ (جس نے نفس کو خواہش سے روکا تو بیشک اس کا جنت ہی ٹھکانا ہے) ؛ اگر نفسانی خواہشات سرے سے پیدا ہی نہ ہوتیں۔ تو روکا کس کو جاتا ؟ جنت جو رضائے پروردگار کا ملنا ہے۔ وہ تو صرف انہی خواہشات کو لگام ڈالنے کا ثمرہ ہے!

ہے۔ تو پھر اِن دونو باتوں کے بارہ میں وہ کن خیالات کا اظہار کرتے ہیں؟ لیکن جب فلسفی ہونے کی حیثیت سے اُن کا خدا کے بارہ میں تخیّل غلط ہوتا ہے۔ تو پھر وہ کیا فرماتے ہیں؟

پہلے شاعر اقبال کو لیجئے: اِس حیثیت سے جب اُن کا خدا کے بارہ میں تصوّر درست ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے سوال ؎

طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟ قوتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟

کا جواب یہ دیتے ہیں۔ کہ ؎

ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!

تو پھر۔ اِس "رُوپ" میں جب تقدیر کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ تو وہ نہ صرف تقدیر کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ ایک قدم آگے جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی تقدیر کے نوشتہ کو اپنی تدبیر سے مٹانا چاہے۔ تو وہ پھر منہ کی کھاتا ہے: چنانچہ وہ اِس سلسلہ میں یہ کہتے سُنائی دیتے ہیں ؎

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!

مثلاً جب نمرُود نے حضرت ابراہیمؑ کو نیست و نابود کرنے کے لئے اُن کو آگ میں پھینکنے کی "تدبیر" کی۔ تو تقدیر نے آگ کو گلزار بنا دیا۔ اور اِس طرح نمرُود کی "تدبیر" خاک میں مل گئی!

اور جب اُن کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اس دُنیا میں ہر ایک چیز کسی تقدیر کے تحت ہو رہی ہے۔ تو پھر گُناہ کی وجہ سے ہم پر عذاب کیوں؟ تو اُس کا جواب وہ اپنی ایک اُردو کی نظم میں یوں دیتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ انسانیت کا "عدوِ مبین" حق تعالٰی کے رُوبرُو پیش ہو کر کہنے لگا۔ کہ جب اُس نے فرشتوں کے ساتھ انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ تو اُس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ چونکہ نہ سجدہ کرنا اُس کی قسمت میں مقدّر ہو چکا تھا: اِس پر اللہ جلشانہ نے اُس سے پوچھا۔ کہ تمہیں اِس تقدیر کا علم سجدے کے انکار سے پہلے ہُوا تھا۔ یا بعد میں؟ تو شیطان نے کہا بعد میں! اِس جواب پر پھر شاعر اقبال یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں ؎

پستئ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اُسے۔ کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجُود!
دے رہا ہے۔ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام۔ ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود!

لیکن یہی اقبال جب "فلسفہ دان" کے "رُوپ" میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور خدا کے تخیّل کے سلسلہ میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں:-

Marfat.com

"جب ایک انسان کے سامنے دو راستے کھلے ہوں۔ تو خدا خود اس بارہ میں نہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ اور نہ چُن سکتا ہے"۔ (دیکھو صفحہ ۸۹)۔

تو پھر جب تقدیر کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ تو وہ نہ صرف اسے محض "قیاس آرائی" قرار دیتے ہیں۔ بلکہ "شر" کے فلسفہ کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ اپنی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں لکھتے ہیں:۔

"قرآن کے نزدیک خدا صرف بھلائی ہی بھلائی ہے .... لیکن خدا کی بھلائی کا اُس بے حد شر کے ساتھ جو اس دُنیا میں بے شبہ موجود ہے۔ کس طرح تطابق کیا جا سکتا ہے"۔ (صفحہ ...)

گویا ڈاکٹر اقبال نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا۔ کہ "شر" اس دُنیا میں جان بُوجھ کر رکھا گیا ہے۔ تاکہ انسانوں کا امتحان لیا جائے۔ کہ وہ کس حد تک "شر" پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

غرض اس سے یہ بات واضح ہوگئی۔ کہ خدا کے صحیح یا غلط تخیل کا ایک انسان کے ادراک کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے اور یہ بات بھی عیاں ہوگئی۔ کہ تقدیر کے بارہ میں نکتہ چینی وہی کر سکتا ہے۔ جس کا خدا کے متعلق تصور درست نہ ہو۔ اور خدا کو انسان کی بدکرداری کا ذمہ دار بھی وہی ٹھیرا سکتا ہے۔ جس نے:۔

(۱) دُنیا کی تخلیق کا فلسفہ نہ سمجھا ہو۔ اور

(۲) نہ جس نے اس دُنیا میں "شر" کے فلسفہ کو ہی سمجھا ہو!

اس مقام پر یہ نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ کہ تقدیر کے نظریئے کو ماننے کے بعد جب ہم انسان کی بدکرداری کے لئے خدا کو موردِ الزام ٹھیراتے ہیں۔ تو ہمارا استدلال کیا ہوتا ہے؟ ہمارا استدلال یہ ہوتا ہے۔ کہ چونکہ دُنیا میں نیکی اور بدی ایک تقدیر کے تحت ہو رہی ہے۔ لہٰذا انسان کے ہر گناہ کا ذمہ دار بھی خدا کو ہونا چاہیئے۔ گویا یہ [illegible] ہماری اپنی منطق کی رُو سے ہوتا ہے۔ صداقت کی رُو سے نہیں۔ کیونکہ صداقت تو یہ ہے۔ کہ خدا [illegible] عیب ہے! اس موقع پر ایک نکتہ جو ہم اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ وہ یہ ہے۔ کہ صداقت اور منطق دو مختلف چیزیں ہیں: منطق کو صرف اسی صورت میں تسلیم کرنا چاہیئے۔ جب وہ صداقت سے مطابقت رکھے۔ کیونکہ جونہی منطق صداقت سے مطابقت چھوڑ دیتی ہے۔ وہ بالکل حماقت بن جاتی ہے۔ یہ بات [illegible] سے بخوبی واضح ہو جائے گی:

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک عمارت سو دنوں میں تیار ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی تعمیر کے لئے دس معمار روزانہ [illegible] گھنٹے کام کریں: اب منطق یہ کہتی ہے۔ کہ اگر ہم دس کی بجائے بیس معمار روز لگائیں۔ تو یہی عمارت [illegible]

Marfat.com

میں تیار ہو جائے گی۔ اور اگر بیس کی بجائے سو معمار روز لگائیں۔ تو وہی عمارت دس دن میں تیار ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ہم معماروں کی تعداد ہزار کر دیں۔ تو وہ ایک دن میں تیار ہو جانی چاہیئے۔ اور اگر ہم اس تعداد کو آٹھ ہزار تک بڑھا دیں۔ تو وہ عمارت صرف ایک گھنٹہ میں تیار ہو جانی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی منطق بے معنی ہے۔ لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ **منطق** پر صرف اُس وقت تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ صداقت کے ساتھ مطابقت رکھے۔ کیونکہ جونہی منطق، صداقت سے مطابقت چھوڑ دیتی ہے۔ تو وہ محض حماقت بن جاتی ہے۔

لہٰذا ہمیں یہ کلیہ ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ کہ صداقت یا سچائی تو **ہر وقت** صحیح ہوتی ہے۔ لیکن منطق ہر وقت صحیح نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ صرف اُسی صورت میں صحیح ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ہر لحظہ صداقت کی غلام بن کر رہے۔ اور اُس کے قدم بقدم چلے! چنانچہ تقدیر کے مسئلہ میں وہی لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ جو **منطق** پر تو انحصار کرتے ہیں۔ لیکن **صداقت** کو ہر حال میں اُس سے مقدم نہیں رکھتے! اور صداقت یہ ہے۔ کہ گو ہر اچھی اور بُری تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔ لیکن جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ جہاں تک "شر" کا تعلق ہے۔ چونکہ قدرت نے اسے دُنیا میں انسانوں کے امتحان کے لئے **جان بُوجھ** کر رکھا ہے۔ لہٰذا رب العزت کو لامحالہ ایسی صورت اختیار کرنی ہی تھی۔ کہ اُس کی اپنی ذات کا نہ تو "شر" سے تعلق ہو۔ اور نہ وہ اُس سے ملوث ہو۔ اسی لئے رب العزت نے اس دُنیا کے کارخانہ میں "صنعت تجرید" ہی یہ رکھی ہے۔ کہ اُس کی ذات کے لئے "شر" سے ملوث ہونا بالکل ممکنات میں سے ہی نہیں ہے۔ لہٰذا وہ بالکل پاک اور بے عیب ہے! اب یہ سوال کہ ایسا ہونا ممکن کس طرح ہے۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا جو باتیں ہمارے لئے بالکل ناممکنات میں سے ہیں۔ وہی خدا کے لئے بالکل ہی آسان ہیں۔ یہی **اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ** کی صحیح تفسیر ہے!

اب یہاں علامہ اقبال کے اُس خیال کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ جہاں وہ یہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر اس دُنیا میں سب باتیں پہلے سے مقدر ہو چکی ہیں۔ تو پھر ہماری ہستی کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کیونکہ (اُنہی کے الفاظ میں) "ہمارے نزدیک لفظ خلاقت کی قدر بھی اُسی وقت تک ہے۔ جب تک کہ ہم یہ سمجھیں۔ کہ اپنی نیک کرداری کے موجد ہم آپ ہیں"۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال کو جہاں مغالطہ ہوا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے انسان کی نیک کرداری کے متعلق تصور یہ قائم کیا۔ کہ یہ اُس کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ یہ نظریہ سطحیت پر مبنی ہے۔ رہروانِ محبت کا یہ وطیرہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے نیک فعل کو بھی اپنی طرف منسوب کریں۔ چونکہ اُن کا اپنا تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ اپنا سب

Marfat.com

کچھ "حسن" کی قربانگاہ پر نچھاور کر چکے ہوتے ہیں۔ اور جو نیک عمل بھی اُن سے سرزد ہوتا ہے۔ اُس کو وہ "حسن" اور صرف "حسن" کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب اُن سے کوئی لغزش ہوتی ہے۔ تو اُس کے لئے وہ اپنے آپ کو خطاوار سمجھتے ہیں:: گویا اُن کی زندگی کا مطمحِ نظر قرآن کی اس آیت میں مضمر ہوتا ہے:۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (سورۃ ۴ النسآء۔ آیت ۷۹)

(یعنی ہر نیکی منجانب اللہ ہے۔ اور بُرائی اپنے نفس کی طرف سے ہے)::

اب یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر سب قسم کی بھلی یا بُری تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔ تو پھر جب ایک انسان اپنی نیک کرداری کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ تو اپنی بدکرداری کو اپنی طرف کیوں منسوب کرے؟

جن لوگوں کے ذہن میں اس قسم کا سوال آتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ عین اسی مقام پر تو ہی ایک خوددار انسان کی **خودی** اپنا کام کرتی ہے۔ کیونکہ جب کسی خوددار انسان سے کوئی "شر" سرزد ہوتا ہے۔ تو باوجود اس بات کے جاننے کے کہ بدی کا اصلی محرک شیطان ہے۔ وہ اُس کو موردِ الزام نہیں ٹھیراتا۔ گویا اُس کی **مردانگی** اُسے اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر پر تھوپے::

لہذا ایک ایسا شخص جس کی خودداری اُس کو اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنی کوتاہیوں کے بارہ میں شیطان کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ وہ اپنی بدکرداری کو اُس ذات کی طرف کس طرح منسوب کر سکتا ہے۔ جو واقعی پاک ہے۔ اور حقیقتاً بے عیب ہے؟

چنانچہ اس مسئلہ کا مغز اسی نکتہ میں ہے:: سوال صرف یہ ہے۔ کہ ہدف اور حقیقت کیا ہے۔ کہ خدا واقعی پاک اور بے عیب ہے یا نہیں؟ اگر حقیقتاً واقعہ یہ ہے۔ کہ خدا بلا کسی شبہ کے شائبہ کے بھی واقعی پاک اور بے عیب ہے۔ تو ہمیں بغیر کسی تامل کے۔ یہ ماننا پڑے گا۔ کہ انسان کو اپنی بدکرداری کو اپنی طرف ہی منسوب کرنا چاہیئے۔ خدا کی طرف نہیں!

اب اس حقیقت کو صرف اسی صورت میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہم یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ جہاں تک "شر" کا تعلق ہے۔ قدرت نے اسے دُنیا میں **انسانوں کے امتحان کے لئے جان بوجھ** کر رکھا ہے۔ اور اس کا اصلی محرک شیطان ہوتا ہے۔ (اسی لئے اُسے انسان کا "عدوٌ مبین" کہا گیا ہے!) اور جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے۔ وہ بالکل پاک اور بے عیب ہے!

Marfat.com

اب علامہ اقبال کے متذکرہ بالا اقتباس میں سے ایک بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ :۔

" اگر تاریخی واقعات کو ہم یوں سمجھنے لگیں۔ کہ یہ محض فوٹو کی تصویریں ہیں۔ جو کہ ہمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ تو ہماری ہستی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی :"

تمام تاریخی واقعات کو " فوٹو کی تصویریں " صرف اُس صورت میں ہی کہا جا سکتا تھا۔ جب ہر انسان کو اپنی " تقدیر " کا علم ہوتا :: حقیقت یہ ہے۔ کہ صانع حقیقی نے اپنی صنعت میں " کاریگری " ہی یہ رکھی ہے۔ کہ عام طور پر کسی انسان کو اپنے " مقدّر " کا علم نہیں ہوتا۔ اور چونکہ یہ علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر انسان اس دُنیا کے " دارالاسباب " ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی تگ و دَو کرنے کے لئے مجبُور ہے۔ اِسی لئے ہر شخص اپنے ہر عمل کا خود کارندہ اور ہر تحریر کا خود مصنّف ہوتا ہے :: لیکن جُوں جُوں ایک انسان کے فکر میں صحیح ایمان اور صحیح کردار کی وجہ سے تعمّق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اُتنی ہی اُس پر یہ حقیقت بالکل عیاں ہوتی جاتی ہے۔ کہ اُس کے تمام صالح اعمال دراصل " وَمَا تَوفِيقِی اِلّا بِاللہ " ہی کی تفسیریں ہیں۔ لیکن اِس کے برعکس ایک انسان کے ایمان اور کردار میں جتنی خامی ہوتی ہے۔ اُتنا ہی وہ سطح بین رہتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ ہر فعل کا فاعل وہ صرف آپ ہی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ہر کارگزاری کی داد و تحسین چاہتا ہے!

علامہ اقبال کے بارہ میں یہاں یہ کہنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی بچپن کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی خامی نہیں تھی۔ کہ ان کو تقدیر کے مسئلہ کے متعلق اُس کے صحیح اسلامی پہلو کا علم نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے ایک خط میں جو اُنہوں نے سر سید راس مسعود کو ۱۹۳۵ء میں لکھا ہے۔ یوں رقمطراز ہیں :۔

" ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے :: اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لئے مقدّر ہو چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس کی تکمیل کے لئے ضرور ذرائع بہم پہنچا دے گا :" [1]

اس قسم کے الفاظ تب ہی لکھے جا سکتے ہیں۔ جب " تقدیر " کے متعلق عقیدہ صحیح ہو۔ لیکن اس کے برعکس جب علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل الفاظ پر غور کیا جائے۔ جو اُنہوں نے اپنے مدراس والے لیکچرز میں استعمال کئے ہیں۔ جن کا اقتباس بر صفحہ ۲۳۱ دیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ :۔

" حقیقت یہ ہے۔ کہ تقدیر ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے ماننے والوں نے محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے ہماری روزمرّہ کی زندگی کی آزادئ فکر و عمل پر (جس کا

---

[1] دیکھو " اقبال نامہ " حصہ اول۔ مجموعہ مکاتیب اقبال۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ایم۔ اے۔ (خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء۔ بنام سر سید راس مسعود)

Marfat.com

ہم ہر وقت علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کرتے ہیں) نظر ہی نہیں رکھی"؛

تو ایک انسان اس نتیجہ پر پہنچنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ علامہ اقبال کے خیالات میں یہ تبدیلی اُس "تدریجی انقلاب" کی وجہ سے ہے۔ جو کہ اُن میں مغربی فلسفہ کے مطالعہ سے پیدا ہوئی؛

چنانچہ اس خیال کی تائید علامہ اقبال کے ایک دوسرے خط سے بھی ہوتی ہے۔ جو اُنہوں نے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء کو لکھا تھا۔ اس میں وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

"اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزری ہے۔ اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائقِ اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں" [1]

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام اپنا ایک مخصوص فلسفہ رکھتا ہے۔ وہ مغربی فلسفہ کی عینک لگا کر نہیں سمجھا جا سکتا؛ یہی وجہ ہے۔ کہ جہاں تک شاعر اقبال کا تعلق ہے۔ جب اُن کا خدا اور اُس کے رسولؐ کے بارہ میں تخیل اسلامی فلسفہ کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر تو وہ اپنے کلام میں قدرت کے رموز کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے کلام میں تقدیر کے بارہ میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں ؎

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!

لیکن جونہی وہ مغربی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے خدا کے تخیل کے بارہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ وہ ذات جو تمام دُنیا کو ظلمت سے نُور کی طرف لے جانے والی ہے۔ جب انسان کے سامنے دو راستے کھلے ہوں۔ تو وہ "نہ محسوس کر سکتی ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتی ہے۔ اور نہ چُن سکتی ہے"۔ تو ساتھ ہی اُن سے اُن کا ادراک اتنا چھنتا ہے۔ کہ وہ نہ صرف "شر" کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ وہ تقدیر و تدبیر جیسے اہم مسئلہ میں ایک مبتدی کی حیثیت کو پہنچ جاتے ہیں؛

چنانچہ انہی وجود کی بنا پر شاعر اقبال کے متعلق تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُن کے کلام کا اکثر و بیشتر حصہ "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال کے اُن خیالات کا تعلق ہے۔ جن پر ان اوراق میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُن کے بارہ میں ایک انسان یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ عربی کے محاورہ "اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر" کی تصویریں ہیں؛

---

[1] دیکھو "اقبال نامہ"۔ حصہ اول۔ صفحہ ۴۷؛

Marfat.com

اب اس سلسلہ میں ایک سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بشیر اور عبداللہ کی مثال میں مؤخر الذکر کیوں جاں بحق ہؤا۔ اوّل الذکر کیوں نہ ہؤا۔ یا حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کی مثال میں اوّل الذکر کیوں خوش نصیب رہا۔ مؤخر الذکر کیوں نہ رہا؟ اس قسم کے سوالوں کے جواب کا تعلق رموزِ الٰہی سے ہے: اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم پہلے "دانائے راز" ہوں۔ پھر یہ رموز سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اور "خدا رسیدگی" جو انسانیت کی معراج مقرر کی گئی ہے۔ اُس کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ ایک انسان ان رموز سے واقف ہو۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم "دانائے راز" ہوتے۔ ہم صرف "عربی دان" یا "مغرب زدہ" ہو کر رہ گئے۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر ہم نے نہ صرف "شر" کے فلسفہ کو نہ سمجھا۔ بلکہ انسانوں کے "شر" کا خدا پر الزام دھرنا شروع کر دیا![1]

اس کی تہ میں صرف ایک ہی بات ہے۔ اور وہ یہ کہ جب ایک انسان، قرآن کی کسی آیت یا صحیح حدیث کے کسی جملہ سے اعتقاداً سرِ مُو بھی انحراف کرتا ہے۔ تو اُس کا ادراک اُس سے چھن جاتا ہے۔ اور

---

[1] اس سلسلہ میں "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۵ راکتوبر ۱۹۶۱ء میں ایک مراسلہ نگار نے "قسمت" پر بحث کرتے ہوئے جس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ وہ غور طلب ہیں: وہ رقمطراز ہے:۔

(آزاد ترجمہ)

اگر قسمت سے مراد یہ ہے۔ کہ ایک شخص کے اچھے یا بُرے اعمال خدا کی طرف سے ہیں۔ تو پھر انسان مشین بن کر رہ جاتا ہے: ایسی صورت میں انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ بلکہ اندریں حالات ایک انسان یہ کہنے کے لیئے بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ خدا شرافت سے بھی (معاذ اللہ) عاری ہے۔ کیونکہ اس طرح دنیا کا یہ ڈرامہ نہ صرف پتلی کا تماشہ بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ یہ تمام کھیل جانی بوجھی شرارت سے معمور معلوم ہوتا ہے!

اس قسم کے الفاظ لکھنے کے بعد بھی مراسلہ نگار اپنی چٹھی میں پھر یوں بھی رقمطراز ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے۔ کہ ضمیر کی آواز قدرت کی طرف سے ایک ایسی "تدبیر" ہے۔ جس سے ایک انسان یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ اپنے ہر کردار کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ کیونکہ جہاں تک اخلاقی زندگی کا تعلق ہے انسان اپنے گناہوں کا خود ہی شاہد بھی ہوتا ہے!"

ان اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ آج کل کا انسان ایک بات کو صحیح طور پر سمجھتا بھی ہے۔ اور نہیں بھی سمجھتا! یہی حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ ہمارا علم سطحی ہے۔ جو ہمیں "صداقت" اور "منطق" میں تمیز نہیں کرنے دیتا (دیکھیں صفحات ۲۳۹ تا ۲۴۰) اسی لئے ہم معاملات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے!

Marfat.com

وہ پھر کسی اہم معاملہ میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا!

غرض اگر ہم تقدیر و تدبیر کے نازک مسئلہ میں ٹھوکروں سے بچنا چاہتے ہیں۔ تو اُس کا طریقہ صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم جب بھی اس مسئلہ پر غور کریں۔ تو یا تو معاملہ کو صرف "تقدیر" کے نقطۂ نگاہ سے دیکھیں۔ اور یا صرف "تدبیر" کے نقطۂ نگاہ سے۔ گویا اُن دونو کو خلط ملط ہرگز نہ کریں ؛ کیونکہ جب ہم "تقدیر" اور "تدبیر" کے نظریوں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں۔ پھر تو اُن کے سمجھنے میں کوئی دُشواری پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جونہی ہم ایک نظریے کو دوسرے میں ملاتے ہیں۔ تو فوراً اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے ؛

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کسی چوراہے پر ٹریفک traffic گزر رہی ہو ؛ اُس وقت جب تک ایک سڑک سے تمام موٹریں وغیرہ گزر نہ جائیں۔ دوسری سڑک پر موٹروں وغیرہ کو روکے رکھتے ہیں۔ تاکہ تصادم نہ ہو ؛

اسی طرح جب ہم تقدیر کے بارہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہیں۔ تو ہماری تمام توجہ تقدیر کے مسئلہ پر ہی ہونی چاہیئے۔ تدبیر کو بیچ میں ہرگز نہیں لانا چاہیئے ؛ اور جب ہماری گفتگو تدبیر کے متعلق ہو۔ تو ہماری تمام توجہ تدبیر کی طرف ہی مرکوز رہنی چاہیئے۔ تقدیر کو بالکل بیچ میں نہیں لانا چاہیئے ؛ مثلاً مندرجہ ذیل شکل میں الف اور ب کو "تقدیر" کا خط سمجھ لیجئے۔ اور ج اور د کو "تدبیر" کا خط ؛

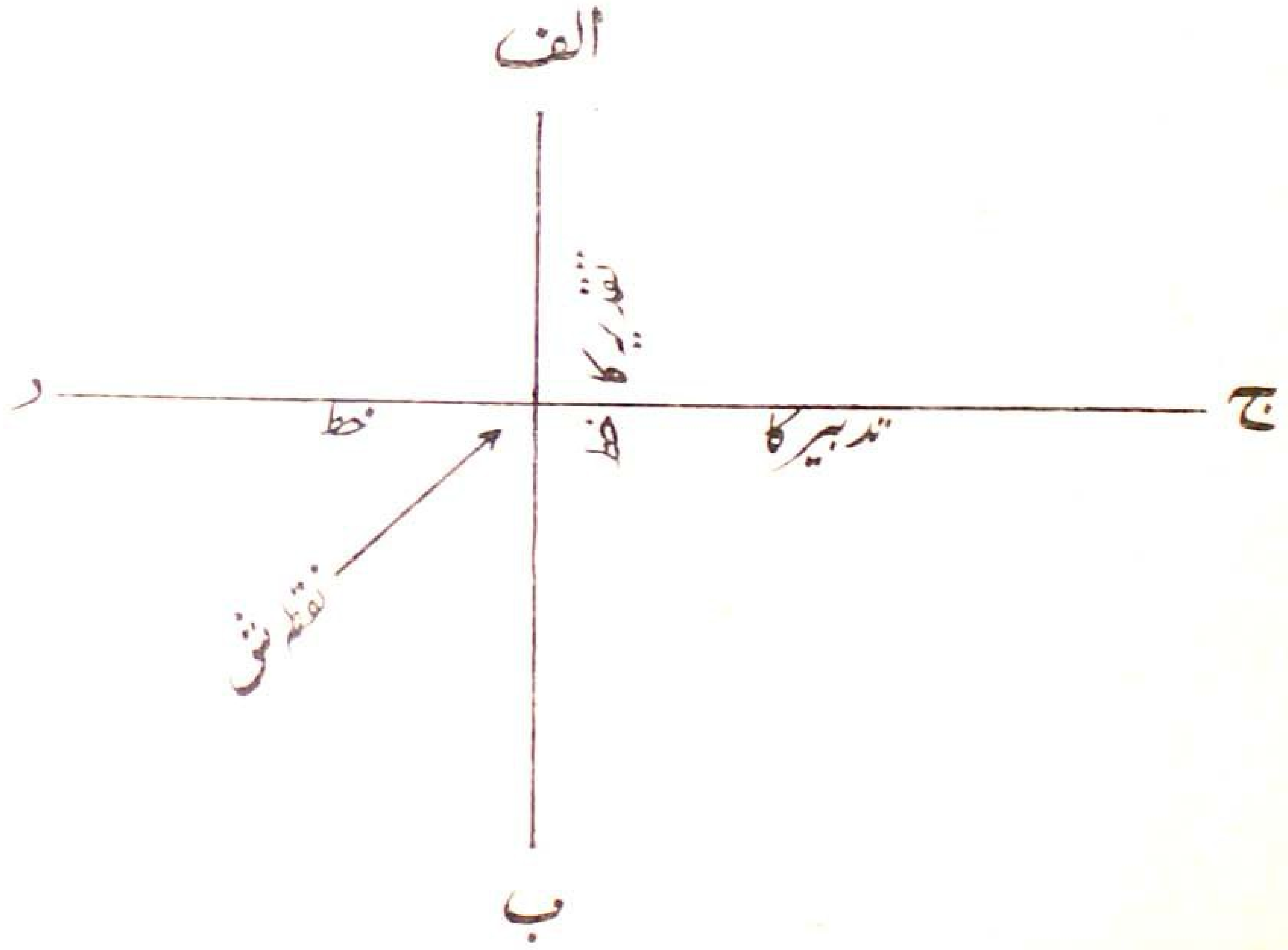

اب جب آپ غور کریں۔ تو یا تو صرف الف اور ب خط پر غور کریں۔ اور یا صرف ج اور د خط پر ؛

Marfat.com

نقطہ شک پر (جہاں الف۔ ب اور ج۔ د خطوط ملتے ہیں)۔ ہرگز غور نہ کریں۔ چونکہ یہ تصادم کا مقام ہے ؛ گویا جب "تقدیر" کے مسئلہ کو سوچیں۔ تو "تدبیر" کو ذہن میں بالکل نہ لائیں۔ اور جب "تدبیر" کی بابت سوچیں۔ تو "تقدیر" کو ذہن میں نہ لائیں۔ تاکہ تصادم نہ ہو ؛ کیونکہ "تقدیر" و "تدبیر" کے مسئلہ کو سمجھنے میں جب بھی اُلجھن ہوتی ہے۔ تو وہ دراصل اُس تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو نقطہ شک پر لازمی ہے۔ لہذا جب تک نقطہ شک سے احتراز نہیں کیا جائے گا۔ تقدیر و تدبیر کے نازک مسئلہ کو سمجھا نہیں جا سکتا! کیونکہ نقطہ شک میں "شر" اور "شیطان" ہے۔ جو جان بُوجھ کر تصادم کرواتا ہے۔ لیکن ہر سلیم الفطرت انسان کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ وہ اس "چوک" پر چوکنا رہے!

پردہ کے حکم کا فلسفہ!

ایک اور مسئلہ جس کے بارہ میں آج کل خیالات میں بہت الجھاؤ ہے۔ وہ پردہ کا مسئلہ ہے ؛ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس مسئلہ کے فلسفہ پر کما حقہٗ غور نہیں کیا گیا ؛

گذشتہ اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ ایک انسان کی حیات کا مقصد واحد یہ ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں خدا کی معرفت حاصل کرے ؛ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کے تمام احکام ایک مکمل "نصاب" کا حکم رکھتے ہیں ؛ اور "نصاب" کی خصوصیت یہ ہوتی ہے۔ کہ اُس میں آسان چیزیں پہلے ہوتی ہیں۔ اور مشکل بعد میں ؛

اس نظریئے کی تائید میں حضرت عمرؓ کا دستور العمل ہماری بہت رہنمائی کرتا ہے ؛ آپ جب قرآن پڑھتے۔ تو جب تک پہلے پڑھے ہوئے حصہ پر عمل نہ فرما لیتے۔ آگے نہ بڑھتے ؛ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن پہلے انسان کو ابتدائی منازل سے گزارتا ہے۔ اور جُوں جُوں وہ ایک پارہ کے بعد دوسرا پارہ پڑھتا ہے۔ ارتقائی منازل بڑھتی جاتی ہیں ؛ اس لحاظ سے قرآن کے مختلف احکام کی مثال حساب کی کتاب کی مانند ہے ؛ اُس کتاب میں جمع اور تفریق کے سوال پہلے آتے ہیں۔ اور ضرب اور تقسیم کے بعد میں ؛ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ ایک طالب علم ضرب اور تقسیم کے سوال سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ جمع اور تفریق کے سوال ٹھیک طور پر حل نہ کر سکتا ہو ؛

چنانچہ اگر ہم قرآن کو اس نظریئے سے پڑھیں۔ تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صحیفہ میں پہلے تو خدا پر ایمان لانے۔ نماز کو قائم کرنے۔ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے۔ فُحش سے بچنے۔ اور پاکدامن رہنے کا سبق دیا گیا ہے۔ اور بہت بعد میں پردہ کا حکم نازل ہوا ہے ؛ گویا عورتوں کے لئے پردہ کا حکم اس لئے نہیں آیا۔ کہ وہ فُحش سے بچ سکیں۔ یا پاکدامن رہ سکیں۔ جیسا کہ اس وقت عام طور پر سمجھا جا رہا ہے ؛ کیونکہ اگر منشا یہ ہوتا۔ تو پردہ کے احکام سورۃ ۴ "النسآء" میں ہوتے ؛ لیکن پردہ کی بابت سب سے پہلا حکم سورۃ ۲۴ "نور" میں

Marfat.com

آیا ہے۔ اور سب سے آخری حکم سورۃ ۳۳ "الاحزاب" میں ہے:۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک فحش سے بچنے کا تعلق ہے۔ اِس کی بابت احکام، سورۃ ۴ "النسآء" سے پہلے اور اُس کے بعد بھی آتے ہیں:۔ لہٰذا معلوم ہُوا۔ کہ پردہ کا فلسفہ دراصل پاکدامنی سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ اور وہ یہ کہ قدرت کا منشا یہ ہے۔ کہ لوگوں کا خدا پر صرف ایمان ہی نہ ہو۔ بلکہ اُن کا رشتہ خدا کے ساتھ جُڑ جائے۔ یعنی وہ "خدا رسیدہ" بھی ہوں، اور یہ مقصد مرد اور عورت دونو کے لئے ہے! اور جیساکہ اِن صفحات میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔ قرآن کی تمام آیات شروع سے لے کر آخر تک صرف اِسی ایک مقصدِ عظیم کے لئے نازل ہوئی ہیں:۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا۔ کہ فحش سے بچنے کے احکام جو سورۃ "نُور" تک آتے رہے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے۔ کہ عورتیں پہلے اپنے آپ کو پاکدامن ثابت کریں۔ اور جب وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے ثابت کر چکیں گی۔ اور اُس کے بعد وہ پردے کے احکام پر بھی عمل کریں گی۔ پھر وہ اس کی اہل ہوں گی۔ کہ وہ خدا رسیدگی کی اعلیٰ منازل کی طرف بڑھ سکیں!

اِس لحاظ سے پردے کے احکام دراصل اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ[1] کی صحیح تفسیر بھی ہیں:۔ وہ اس طرح کہ میری دانست کے مطابق تمام قرآن میں صرف پردے کے احکام ہی ہیں۔ جو دوسری الہامی کتابوں سے زائد ہیں:۔ کیونکہ جہانتک نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ کا تعلق ہے۔ اُن کی بابت احکام کسی نہ کسی صورت میں تمام پہلی الہامی کتابوں میں بھی موجود ہیں:۔ مثلاً پہلی سماوی کتب میں نماز کے طریقے، روزوں کی تعداد، حج کے ارکان، اور زکوٰۃ کے نصاب میں تو فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن کی فرضیت کسی زمانے میں بھی مفقود نہیں ہوئی:۔ اسی طرح حلال وحرام میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے کوئی چیز حلال یا حرام نہ ہو۔ لیکن اب وہ حلال یا حرام ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ چیزوں کا حلال وحرام ہونا بھی حضرت آدمؑ کے وقت سے ہی رائج ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن جہاں تک پردہ کا تعلق ہے۔ یہ ایک خالص شرعِ محمدیؐ کا حکم ہے:۔ وہ بھی اس لحاظ سے کہ جہانتک حیاداری اور پاکدامنی کے حکم کا تعلق ہے۔ وہ تو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام مذاہب میں بدستور قائم رہا۔ لیکن چادر سے گھونگٹ نکالنا۔ یا عورتوں کا گھروں کی چار دیواری میں اپنے آپ کو محدود رکھنا خالص قرآنی احکام ہیں:۔

لہٰذا حضرت عیسیٰؑ اور رسول پاک کی شریعتوں میں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور حلال وحرام وغیرہ کے بارہ میں جو فرق ہے:۔

(۱) وہ فرق۔ یہ ہے

---

[1] سورۃ المائدہ۔ آیت ۳ (یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی:۔)

Marfat.com

(۱۱) پردے کے احکام کے

یہ وہ دو اجزا ہیں۔ جو "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" [1] کی صحیح تفسیر ہیں؛ یعنی ان دو اجزا سے نہ صرف دین کی تکمیل ہوئی۔ بلکہ انہی اجزا کی بدولت اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ [2] کی بشارت دی گئی!

ہم یہ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ کہ امتِ محمدیہ پر جو "اتمامِ نعمت" ہوئی ہے۔ وہ "خدا کی معرفت" میں مضمر ہے۔ اور یہ "معرفت" ممکن نہیں جب تک کہ مرد و عورت دونو پردہ کے احکام پر عامل نہ ہوں! اس سے پردہ کے احکام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے؛

لیکن جہاں تک ہمارے عوام یا "عربی دان" علماء کا تعلق ہے۔ اُن کے فہم کی رسائی صرف یہاں تک ہوئی۔ کہ جو عورتیں آج کل پردہ نہیں کر رہیں۔ وہ سب بے شرم بے حیا اور بے غیرت ہیں؛ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جس طرح مردوں میں بدمعاش لوگ ہیں۔ اسی طرح عورتوں میں بھی فاحشہ قسم کی عورتیں ضرور ہیں۔ لیکن ہر شریف گھرانے کی بے پردہ عورت کو بے شرم۔ بے حیا اور بے غیرت جیسے الفاظ سے یاد کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر پردے والی آیات نازل ہونے سے پہلے پہلے تمام عورتیں چونکہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ لہذا وہ سب کی سب بے شرم۔ بے حیا اور بے غیرت ہی تھیں!

آیئے! ہم اب اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہ اس وقت کی بے پردگی مسلمان عورتوں میں کس طرح آئی؟

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمان مرد مغرب گئے۔ اور وہاں سے:۔

(۱) اپنے لئے وہ کرزن فیشن۔ انگریزی قسم کے بال اور کوٹ پتلون لائے۔ اور

(۲) اور عورتوں کے لئے آزادی کے خیالات!

اب یہ قصور کس کا ہے؟ مردوں کا یا عورتوں کا؟ نہ مرد اپنا حلیہ بدلتے نہ عورتیں متاثر ہوتیں!

اب جب تک مردوں کا مغربی حلیہ قابلِ اعتراض تصور نہیں کیا جائے گا۔ عورتوں کی روش کو بھی برداشت کرنا پڑے گا!

مردوں کے حلیہ کو قبول کرنا۔ لیکن اس کے "لازمی لوازمات"، پر ناک بھوں چڑھانا، گھونٹ کھانا اور گلگلوں

---

[1] سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۳ (یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا)

[2] ایضاً (اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی؛)

سے پرہیز والا معاملہ ہے ؛

اس مسئلہ کا ایک دوسرا ذرا دردناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم نے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ[1] کا مفہوم بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھا ؛ ہم عام طور پر ان الفاظ کا مطلب یہ لیتے ہیں ۔ کہ مرد "آقا" ہے۔ اور عورت "غلام" ؛ (اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کو نباہا اس طرح ۔ کہ عورت کی حیثیت ایک "جُوتی" کی سی ہے۔ کہ ایک اُتار دی اور دوسری پہن لی !) مرد اور عورت کا دراصل محلِ کار علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور اپنے اپنے محلِ کار میں ان کی حیثیت دو رفقائے کار کی سی ہے۔ جن میں ترتیب کے لحاظ سے ایک مقدم ہے۔ اور دوسرا مؤخر[2] ؛

اب "مقدم" ہونے کی حیثیت سے اسلام نے جب مرد کے "آقا" ہونے پر زور دیا ہے۔ تو اس سے یہ جتانا مقصود ہے۔ کہ مرد کی "ذمہ داری" زیادہ ہے۔ نہ کہ صرف "آقائی" ؛ مثلاً کل اگر مسلمانوں پر اس بات کی وجہ سے عذاب آئے۔ کہ اُن کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ تو جن حالات میں اس زمانہ میں بے پردگی شروع ہوئی ہے۔ اُن کو مدِنظر رکھتے ہوئے، مردوں کو عذاب زیادہ ہوگا۔ عورتوں کو کم ! کیونکہ جس طرح اوپر واضح کیا گیا ہے۔ بے حجابی کے رُجحانات مرد مغرب جا کر لائے۔ عورتیں شروع میں وہاں نہیں گئیں۔ لہٰذا اَلْبَادِیُ اَظْلَمُ کی رُو سے مرد عورتوں سے زیادہ مجرم ہیں !

اب یہ واضح کرنے کے لئے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ جب "غضِ بصر" کا حکم نازل ہُوا۔ تو چونکہ یہ حکم مردوں اور عورتوں دونو کے لئے یکساں ہے۔ **مردوں کو یہ حکم پہلے** دیا گیا اور **عورتوں کو بعد میں** ! اب یہ اصولاً غلط ہے۔ کہ مرد خود تو "غضِ بصر" نہ کریں۔ لیکن عورتوں سے یہ توقع کریں۔ کہ وہ "غضِ بصر" بھی کریں۔ اور پردہ بھی ! لہٰذا اصولی نقطۂ نگاہ سے مرد جب مجموعی حیثیت سے "غضِ بصر" کر چکیں۔ پھر وہ عورتوں سے بھی اس معاملہ میں اطاعت کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے نہیں ! کیونکہ "غضِ بصر" کا حکم مردوں کو **پہلے** ملا ہے۔ اور عورتوں کو **بعد** میں !

آیئے ! اب پردہ کے احکام کے فلسفہ پر غور کریں ؛ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات سمجھنی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پردہ کے حکم کے بہت سے اجزا ہیں ؛ اب یہ دیکھنے کے لئے کہ اس حکم کے پہلے جُزو کے نازل ہونے پر مرد نے کیا کیا ؟ اس کا ردِعمل عورت پر کیا ہُوا ؟ اس ردِعمل سے مرد کس طرح متاثر ہُوا ؟ اور آخر کار حالات

---

[1] سورۃ ۴ النساء۔ آیت ۳۴ ؛ (مرد عورتوں پر حاوی ہیں)

[2] اس نقطۂ نگاہ سے کہ ترتیب کے لحاظ سے مرد "مقدم" (senior) ہیں۔ اور عورتیں "مؤخر" (junior) ان الفاظ کی تشریح آگے آئیگی ؛

Marfat.com

نے کیا صورت اختیار کی ؟ یہ تمام باتیں یہاں ڈرامہ کی صورت میں کنایۃً لکھی جارہی ہیں ۔ تاکہ اس حکم کے فلسفہ کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے صحیح طور پر سمجھا جاسکے :۔

یہاں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا چاہیئے ۔ کہ ہر سلیم الطبع مرد فطرتاً (خدا کا) "**فرمانبردار**" زیادہ واقع ہوا ہے ۔ اور سلیم الطبع عورت فطرتاً "**خوددار**" زیادہ ! چنانچہ جب مرد کو خدا کی طرف سے "غضِ بصر" کا حکم آیا ۔ اُس نے تو اپنی فطری "فرمانبرداری" کی وجہ سے عورت کو دیکھتے ہی فوراً آنکھیں نیچی کر لیں :۔ لیکن چونکہ عورت کی جبلّت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے ۔ کہ وہ یہ چاہتی ہے ۔ کہ مرد اُس کی طرف دیکھے ۔ اور اُس نے جب یہ دیکھا ۔ کہ مرد نے "غضِ بصر" کرنا شروع کر دیا ہے ۔ تو اُس کی فطرتی "خودداری" نے اُس کو مجبور کیا ۔ کہ وہ نہ صرف مرد کی طرف نہ دیکھے ۔ بلکہ اوٹ میں ہو جائے ۔ اور مرد کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ ہو ! اب جب مرد نے دیکھا ۔ کہ اُس نے اپنی فطری "فرمانبرداری" کی وجہ سے "غضِ بصر" تو کر لیا ۔ لیکن عورت اب اوٹ میں ہوگئی ہے ۔ اور اُس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے ۔ (چونکہ وہ فطرتاً نہایت "خوددار" واقع ہوئی ہے) ۔ تو اُسے سخت قلق اور صدمہ ہوا :۔ مرد اور عورت کی چونکہ حضرت آدمؑ کے وقت سے آپس میں بے حد محبّت تھی ۔ لہٰذا مرد اس بات کے لئے سخت بےچین رہا ۔ کہ وہ خدا سے جھوٹا بھی نہ ہو ۔ یعنی "غضِ بصر" کو بھی قائم رکھے ۔ لیکن اپنی ازلی محبوبہ سے اُس کی راہ و رسم بھی جاری رہے !

چنانچہ اس بےچینی نے مرد کو اس بات پر مجبور کیا ۔ کہ جب وہ گھر سے باہر نکلتا ۔ تو اِدھر اُدھر نہ دیکھتا ۔ بلکہ اُس کی نظر کسی گہری سوچ میں زمین پر گڑی رہتی :۔

اب رب العزت جو سمیع بصیر ہونے کی حیثیت سے یہ سب "ڈرامہ" دیکھ رہے تھے ۔ وہ مرد اور عورت کی ان خلوص بھری "اداؤں" سے بہت خوش ہوئے :۔ چنانچہ اللہ جلشانہٗ جب پہلے :۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ[1]

والی آیت نازل فرما چکے تو بعد میں نہ صرف :۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ[2]

والی آیت نازل فرمائی ۔ بلکہ مرد کے "غضِ بصر" والے حکم کی پیروی پر جب عورت کی "خودداری" کو دھچکا لگا ۔ اور وہ جان بوجھ کر اوٹ میں ہوگئی ۔ تو رب العزت کو اُس کے بعد :۔ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ[3]

---

[1] سورۃ ۲۴ النور ۔ آیت ۳۰ :۔ (یعنی مسلمان مردوں کو حکم دیجئے کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں) :۔

[2] سورۃ ۲۴ النور ۔ آیت ۳۱ :۔ اور مسلمان عورتوں کو حکم دیجئے ۔ کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں ۔

[3] سورۃ ۳۳ الاحزاب ۔ آیت ۵۳ ۔ پردے کے پیچھے سے :۔

Marfat.com

اور اُس کے بھی بعد :-

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ[ل]

والی آیات بھی اُتارنی پڑیں !

چنانچہ اس تمام روئداد میں ، وہ " مرد " جس نے رب العزت کے " غضِ بصر " والے حکم کی ذرا تعمیل کی وہ تو سرورِ کائنات ﷺ ہیں ۔ اور جس " عورت " نے اپنی " خودداری " کی بنا پر نہ صرف " غضِ بصر " کیا ۔ بلکہ اوٹ میں بھی ہو گئی ۔ وہ " مفروضہ " ہے ۔ جو پردے کے فلسفہ کو سمجھانے کے لئے یونہی فرض کر لی گئی تھی !

پھر وہ " مرد " بھی رحمۃ للعلمین ہی ہیں ۔ جنہوں نے " غضِ بصر " کے حکم پر عمل کرنے کے بعد گھر سے باہر نکلتے وقت نہ صرف اِدھر اُدھر دیکھنا گوارا نہ کیا ۔ بلکہ سڑکوں پر چلتے وقت اپنی نظر کو زمین پر گاڑے رکھا ۔ اور یہ سب کچھ اس غم میں تھا ۔ کہ آدمی کی وہ غمگسار جو حضرت آدمؑ سے لے کر مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ کی آیت نازل ہونے تک چلنے پھرنے میں آزاد تھی ۔ اب مقیّد کر دی گئی ہے !

چنانچہ چلتے پھرتے وقت ، اپنی نظر کو زمین پر گاڑے رکھنا ، اُس " غم " کی یاد میں ہے ۔ جو انسان کی ازلی رفیقہ کو گھر کی چار دیواری میں محدود رکھنے کے باعث حضورؐ کو ہوا ۔ اور آپ کی یہ " ادا " اب قیامت تک کے لئے مردوں کے لئے سُنّت ٹھیری !

اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا ۔ کہ مرد اور عورت کا رشتہ خدا کے ساتھ جُڑ جائے ۔ یعنی وہ دونو خدارسیدہ ہوں !

یہ ظاہر ہے ۔ کہ انسان کو خدا کے ساتھ جوڑنے والی سب سے پہلے نماز ہے :- اب ایک مرد تو نماز ہمیشہ کے تیس دن متواتر پڑھ سکتا ہے ۔ لیکن عورت ، خلقی طور پر چند دن کے لئے معذور ہے ! اس وجہ سے مرد " مقدم " (senior) ٹھہرا ۔ اور عورت " موخر " (junior) ! لیکن عورت کا چند دن کے لئے نماز سے معذور ہونا چونکہ اس کے اپنے بس کا روگ نہ تھا ۔ لہٰذا اس کمی کی وجہ سے اُس کی " خدارسیدگی " میں فرق نہیں آتا ۔ یعنی اگر مرد خدارسیدہ ہو سکتا ہے ۔ تو عورت بھی خدارسیدہ ہو سکتی ہے ! لیکن ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے ۔ تو وہ یہ ہے ۔ کہ مرد کو خدارسیدہ ہونے کے لئے جو فیض پہنچتا ہے ۔ وہ اپنے مرشد سے " سینہ بہ سینہ " پہنچتا ہے ۔ لیکن عورت کو چونکہ پردہ کا حکم ہے ۔ اور وہ کسی غیر محرم کے سامنے نہیں ہو سکتی ۔ لہٰذا اُس کا مرشد عام طور پر اُس کا **محرم** ہوتا ہے ۔ یعنی باپ وغیرہ اس لئے عورت کو فیض پہنچنے کا طریقہ صرف " لب بہ لب " ہے ۔ (یعنی دُو بدُو گفتگو کے ذریعہ !) :- لیکن اگر اُس کا مرشد خاوند ہے ۔ تو پھر اُس کو فیض پہنچنے کا طریقہ " سینہ بہ سینہ " " لب بہ لب " دونوں ہیں !

[ل] سورۃ ۳۳ الاحزاب ۔ آیت ۵۹ :- اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں :-

Marfat.com

اب یہاں اس مسئلہ کا حل باقی رہ جاتا ہے۔ کہ سورۂ "نُور" اَور سورۂ "الاحزاب" میں جو پردے کے احکام آئے ہیں۔ اُن میں فرق کیا ہے؟

سورۂ "نور" میں خدارسیدگی کے سلسلہ میں **کم ازکم** احکام درج ہیں۔ اَور سورۂ "الاحزاب" میں **زیادہ سے زیادہ**:

عورتوں کے لئے **کم ازکم** احکام یہ ہیں:۔

(۱) وہ مرد کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کریں:

(۲) وہ باوقار طریقہ سے رہیں:

(۳) وہ اپنی زینت کو صرف اس حد تک ظاہر کریں۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو:

(۴) وہ اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سینہ کو ڈھانپے رکھیں:

(۵) وہ اپنی زینت کو سوائے اپنے خاوند (یا باپ وغیرہ) کے اَور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں:

(۶) وہ اپنے پاؤں کو ایسے زور سے نہ ماریں۔ کہ چھپی ہوئی زینت کا اظہار ہو:

البتہ سورۂ "الاحزاب" میں اُوپر کے احکام کے علاوہ عورتوں کے لئے مندرجہ ذیل احکام **زائد** آئے ہیں:۔

(الف) اُن کی آواز میں کسی قسم کا "ناز و نخرہ" نہ پایا جائے:

(ب) عام طور پر وہ اپنے آپ کو گھروں میں محدود رکھیں:

(ج) جہالت کے زمانہ کے بناؤ سنگار نہ کریں:

(د) اگر کوئی مرد اُن سے کوئی چیز مانگے۔ تو وہ پردہ کے پیچھے سے دیں:

(س) جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو چادر کو اپنے اُوپر اوڑھ لیں:

پہلی سورۃ میں "کم ازکم" اَور دوسری سورۃ میں "زیادہ سے زیادہ" احکام دینے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی (i) غریب اَور (ii) امیر:

غریبوں کو اپنی روزی کمانے کی وجہ سے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن امیروں کو اس قسم کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی: اب اس امر کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ غریب عورتیں (جن کو روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کے بغیر چارہ نہیں) خدارسیدگی کی نعمت سے محروم نہ رہ جائیں۔ اُن کے لئے پردے کے **کم ازکم** احکام جاری کئے گئے ہیں۔ یعنی اُن کے لئے زینت ظاہر کرنے کے سلسلہ میں کسی سخت قسم کی قید نہیں لگائی گئی۔ بلکہ "اِلَّا مَا ظَهَرَ" کے الفاظ سے ایک لچک پیدا کر دی گئی ہے۔ تاکہ جس کو جس حد تک زینت ظاہر کرنے کے بغیر چارہ نہ ہو۔ وہ اُسے ظاہر کرسکتی ہے۔ لیکن یہ شرط ضرور رکھی۔ کہ سینہ پر اوڑھنی ضرور رہو:

مثلاً جو عورتیں گوبر کے اوپلے بیچ کر اپنا گزارہ کرتی ہیں۔ وہ سر پر ٹوکرا اٹھاتے وقت اپنے سینہ پر اوڑھنی تو لے

سکتی ہیں۔ لیکن نہ وہ اپنے چہرہ کو چھُپا سکتی ہیں۔ اور نہ ہاتھوں کو۔ کیونکہ جب تک وہ ایسا نہ کریں۔ وہ اوبلوں کا ٹوکرا سر پر اُٹھا کر اِدھر اُدھر چل پھر نہیں سکتیں۔ لہذا قرآن نے "اِلَّا مَا ظَهَرَ" کے الفاظ سے ایسی عورتوں کی حرکات و سکنات کو خاصی حد تک آزاد رکھا ہے ؛

یہاں یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض عوام کا یہ خیال کہ چونکہ مرد، عورتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لہذا عورتوں کو جو پردے کا حکم ملا ہے۔ وہ اس لئے ملا ہے۔ کہ مردوں کو اپنے "غضِ بصر" کا حکم بجا لانے میں دِقت نہ ہو، کم فہمی پر مبنی ہے ؛ اگر لاہور جیسے شہر میں ایک ہزار عورتیں ایسی ہوں۔ جو کہ اپنی روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کے لئے مجبور ہوں۔ اور وہ سب کی سب بے حد حسین بھی ہوں۔ اور جوان بھی۔ تو مرد، اُن عورتوں کو، یہ کہہ کر گھر میں بیٹھنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ کہ اُن کو اپنے "غضِ بصر" کا حکم بجا لانے میں دِقت محسوس ہو رہی ہے! مردوں کو ہر حالت میں "غضِ بصر" کرنا ہوگا ؛ عورتوں کو پردے کا حکم مردوں کی "سہولت" کے لئے نہیں ملا۔ جیسا کہ بعض لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے سمجھ رہے ہیں ؛

لیکن اس کے برعکس امیر عورتوں کو جن کو روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے لئے یہ قید لگائی گئی۔ کہ وہ نہ صرف جہالت کے زمانہ کا بناؤ سنگار نہ کریں۔ بلکہ اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محدود رکھیں۔ اور جب باہر جائیں۔ تو چادر ضرور اوڑھیں۔ بلکہ اُن کی بول چال پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے ؛

اِس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سورۃ الاحزاب میں جو پردے کے احکام آئے ہیں۔ وہ "خواص" کے لئے ہیں ؛ گویا جتنا خوشحال گھرانہ۔ اُتنی ہی اُن کی عورتوں پر زیادہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس غریب عورتوں کے لئے گھر کی چار دیواری میں محدود رہنے کی قید بھی نہیں لگائی گئی ؛

اب اِسی سے صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ قرآنی احکام میں کتنے تعمق سے کام لیا گیا ہے۔ اور وہ کتنے فطری ہیں!

اس سلسلہ میں ایک اور بات سمجھنی بھی لازمی ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کا منشا یہ نہیں ہے۔ کہ پردہ کے احکام کو اِس درجہ سنگین بنا دیا جائے۔ کہ عورتیں گھر کے سامان کی ایک "گٹھری" سی بن کر رہ جائیں۔ یعنی وہ اس طرح جئیں۔ اور پرورش پائیں۔ کہ اُن کو دُنیا و مافیہا کے متعلق کچھ خبر نہ ہو ؛ مثلاً اگر وہ ریلوے سٹیشن پر پہنچیں۔ اور اُن کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے۔ تو جب تک اُن کا پھر دوبارہ پوری طرح ساتھ نہ دیا جائے۔ وہ "گٹھری" کی طرح اپنی جگہ پر ہی پڑی رہیں۔ نہ اُن کو اپنے اسباب کی ہوش ہو۔ نہ اس بات کی۔ کہ کسی ڈبہ میں بھی بیٹھنا ہے۔ یہاں تک کہ جس گاڑی میں سفر کرنا ہو۔ وہ خواہ گزر ہی جائے ؛ یا اگر کوئی ڈاکٹر اُن کے کسی عزیز کو ایک گولی۔ ایک پڑیا اور ایک خوراک دینے کی ہدایت لکھ کر دے جائے۔ تو ان کو کچھ پتہ نہ ہو۔ کہ مریض کو کون سی دوائی دینی ہے۔ اور کس وقت دینی ہے؟

Marfat.com

تربیت کی اس قسم کی خرابی پھر عورتوں کو اس بات کا اہل نہیں بنا سکتی۔ کہ اگر ملک میں لڑائی چھڑ جائے۔ تو وہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر سکیں۔ جیسا کہ اسلام کی سرگزشت ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اس قسم کی خدمات تاریخی واقعات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یونہی افسانہ نہیں ہیں ؛

اب یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام نے معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت کیا رکھی ہے ؟

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق رسول پاکؐ کا ارشاد ہے :-

اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ [1]

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اسلام نے :-

(i) ازدواجی زندگی

(ii) عورتوں کی صحیح تربیت۔ اور

(iii) معاشرہ میں عورتوں کے بلند درجہ

پر کتنا زور دیا ہے۔ کہ جنت کو اُن کے قدموں کے نیچے بتایا ہے ؛

اسی طرح مردوں کی توقیر کے بارہ میں رسول پاکؐ کا ارشاد ہے۔ کہ اگر آپ کا بس چلتا۔ تو وہ عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں ! (گویا آپ نے ایسا حکم اس لئے نہ دیا۔ کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں)۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسول پاکؐ نے خاوندوں کی اتنی توقیر کیوں چاہی ؟ کیا یہ اس لئے، کہ خاوند روزی کماتے ہیں ؟

جہاں تک مادی خدمت کا تعلق ہے۔ جو خدمت خاوند بیوی کی کرتا ہے۔ یا عورت خاوند کی کرتی ہے۔ اس میں اتنا زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے۔ کہ عورت ساجد ہو۔ اور مرد مسجُود !

اس سلسلہ میں جو نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدا مسجُود کیوں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ صرف اپنے بے عیب ہونے کی وجہ سے ؛ اسی طرح جب رسول پاکؐ نے خاوند کی اتنی توقیر چاہی۔ تو اس خواہش کی تہ میں یہ بات تھی۔ کہ رسول پاکؐ ایک خاوند سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ نیک کرداری کے لحاظ سے ایسا پاکباز اور فرشتہ سیرت ہو کہ بیوی اُس کو سجدہ کرنے میں فخر محسوس کرے ! گویا رسول پاکؐ کے نزدیک ایک خاوند کی سیرت کا معیار اس قدر بلند اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ وہ اُسے اس توقیر کا حقدار سمجھتے تھے !

لہٰذا آج کل کے خاوند اب اپنے بارہ میں خود فیصلہ کرلیں۔ کہ کیا وہ سیرت کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام رکھتے

---

[1] جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے !

Marfat.com

ہیں۔ کہ وہ اپنی بیویوں کے مسجُود بن سکیں ؟

اِس لحاظ سے اگر انصاف سے دیکھا جائے۔ تو عورتیں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اپنے بچوں کی پرورش اِس تن دہی سے کرتی ہیں۔ کہ اولاد کو کہا گیا ہے۔ کہ وہ جنّت کو اُن کے قدموں میں ڈھونڈے ؛ لیکن اس کے مقابلہ میں مرد سیرت کے لحاظ سے اِس وقت ایسے بلند مقام پر نہیں ہیں۔ کہ وہ عورتوں کے مسجُود بننے کے لائق تصور کئے جائیں ؛ لہٰذا اِس وقت مردوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہے !

اِسی موضوع کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ احادیث میں عورتوں کو جو" ناقص العقل" قرار دیا گیا ہے۔ یا قرآن جہاں کہیں" عقلؔ" کے لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ تو ایسی تمام جگہوں پر یہ لفظ" عقلمندی"، "بصیرت" اور" دانائی" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جن صفات کا تعلق اِنسان کی رُوح اور قلب سے ہے ؛ قرآن و حدیث میں یہ لفظ عام" سمجھ بُوجھ" یا اُس" عقل" کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ جو انسانوں کے دماغ میں ہوتی ہے۔ اور جو آجکل کے دُنیوی عُلوم پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ آجکل کی دُنیا کائنات کی" مادی تسخیر" کر رہی ہے۔ اور جو" عقل" اِنسانوں سے آجکل چاند پر چھلانگیں لگوا رہی ہے۔ کیونکہ اسلام کی رُو سے یہ تمام ترقی" اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر" کی تفسیر ہے۔ اور اسی لئے یہ" دجّال" کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے ؛ (اِس سلسلہ میں دیکھیں صفحات ۱۳۲ تا ۱۵۰) ؛

لـہ : مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہُوا ہے :

ذَالِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ [سورۃ ۶ الانعام۔ آیت ۱۵۱ ؛ یعنی یہ وہ باتیں ہیں جن کا خُدا نے تم کو حکم دیا ہے۔ تاکہ (اُن پر عمل کرنے سے) تمہیں عقل حاصل ہو]

" عقل" کی دراصل دو قسمیں ہیں :

(۱) " مادی عقل" اور

(۲) " رُوحانی عقل" ؛

" مادی عقل" اِنسان کے دماغ میں ہوتی ہے۔ اُس کی معراج آجکل چاند پر چھلانگیں لگانے کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے ؛

" رُوحانی عقل" اِنسان کے قلب میں ہوتی ہے۔ اُس کی معراج یہ ہے۔ کہ ایک" عارف" زمین پر بیٹھے بیٹھے چاند کو شق کرے ؛

قرآن یا حدیث میں جہاں کہیں" عقل" کا ذکر آیا ہے۔ وہاں" رُوحانی عقل" مُراد ہے۔" مادی عقل" نہیں ؛ روزمرّہ کی زبان میں "مادی عقل" کو" عام سمجھ بُوجھ" یا محض" عقل" کہتے ہیں۔ اور" رُوحانی عقل" کو" عقلمندی"، " بصیرت" اور" دانائی" سے تعبیر کیا جاتا ہے ؛ اِس کی تشریح کے لئے اب متن دیکھیں ؛

Marfat.com

چنانچہ عورتوں کو احادیث میں جو"ناقص العقل" قرار دیا گیا ہے۔ وہ انسان کی عام "سمجھ بُوجھ" کے لحاظ سے نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اگر عورتوں میں عام "سمجھ بُوجھ" کی بھی کمی ہوتی۔ تو وہ آجکل کے میڈیکل کالجوں میں ڈاکٹری وغیرہ کے مُشکل ترین امتحانوں میں کبھی کامیاب نہ ہوسکتیں۔ اور نہ وہ بڑے بڑے مُلکوں کے وزیرِاعظم جیسے ذمہ دار عہدوں کے فرائض انجام دے سکتیں ؛

اَب یہ بات کہ عورتیں "عقلمندی"، "بصیرت" اور "دانائی" کے لحاظ سے "ناقص" کیوں ہیں ؟ اُس کی وجہ گذشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے۔ یعنی یہ کہ اِن صفات کا تعلق جسم کی "پاکیزگی" اور خاص کر "نماز" سے ہے۔ اور عورتیں فطری طور پر ہر ماہ اس قسم کی "طہارت" اور "عبادت" سے معذور ہیں !

اِس کے برعکس "عربی دان" حضرات جب اس مسئلہ کی تشریح فرماتے ہیں۔ تو وہ عام طور پر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جن سے عورتوں کی محض "غلامی" ثابت ہو۔ اور اِس طرح اُن کی "ہتک" ہو ! ظاہر ہے۔ کہ حضورؐ کے ارشادات میں اِس قسم کا مقصد نہیں ہوسکتا !

پردہ کے احکام کے سلسلہ میں ایک اَور نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اَور وہ یہ کہ ہر مذہب میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے ؛ اسلام نے غیر محرم مرد اَور عورت کے درمیان سلام کا جو طریقہ مقرر کیا ہے۔ وہ وقار کے لحاظ سے نہایت ہی انوکھا ہے۔ اَور وہ یہ ہے۔ کہ جونہی کوئی نامحرم مرد اَور عورت ایک دوسرے کو دیکھیں۔ تو وہ فوراً اپنی اپنی آنکھوں کو نیچی کرلیں ؛ گویا دونو مرد اَور عورت کی مژگاں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ادب سے جُھک جائیں۔ اَور جب تک یہ ایک دوسرے کے پاس سے پوری طرح گزر نہ جائیں۔ وہ اُسی طرح جھکی رہیں۔ گویا ایک غیر محرم مرد اَور عورت کی مژگاں ایک دوسرے کو خاموشی سے "سلام" کر رہی ہیں کیا وقار کے لحاظ سے اِس سے کوئی بہتر طریقہ ہوسکتا ہے ؟

اِسی وقار کے طریقہ کو ہم نے پہلے خود سیکھنا ہے۔ اَور پھر تمام دُنیا کو سکھانا ہے !

Marfat.com

اب کیا اِس وقت کوئی اِس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ کہ موجودہ دُنیا میں ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے۔ جب مغربی ممالک کے باشندے اِس قسم کا اسلامی پردہ کریں گے؟

اِسلام اِس بات کا دعویٰ کرتا ہے!

لیکن کس بل بوتہ پر؟ اِس سوال کے جواب کے لئے ابھی کچھ صفحات کا اَور انتظار کیجئے!

"دین" کے لفظ کا صحیح مدّعا!

ان صفحات میں جو کچھ ابھی تک لکھا گیا ہے۔ اُس کے صحیح مفہوم کو صرف اُسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ہم "دین" کے لفظ کا صحیح مدعا اَور منشا سمجھیں: میرے نزدیک "دین" کے معنی "دُھن" کے ہیں: ایک انسان کو جس بات کی حقیقی "دُھن" ہے۔ وہی اُس کا "دین" ہے: مثلاً اگر ایک انسان کو روپیہ اکٹھا کرنے کی "دُھن" ہے۔ تو یہی اُس کا "دین" ہے یا ایک دوسرے کو اگر "یہ دُھن" ہے۔ کہ وہ مختلف عورتوں سے آشنائی کرے۔ تو اُس کا "دین" وہ ہے: لیکن چونکہ ایک انسان کے لئے بہترین "دُھن" یہ ہے۔ کہ وہ "تلاشِ حق" میں مشغول و منہمک رہے۔ لہٰذا قرآن نے "خدا کی معرفت" کی "دُھن" کو "دین الحق" یا "دینِ اسلام" کے نام سے پکارا ہے: چنانچہ اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ[1] ہی نہیں۔ بلکہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ[2] یعنی جو "خدا کی معرفت" کی "دُھن" کے علاوہ کسی اَور "دُھن" میں زندگی گزارے گا۔ وہ قبول نہ ہوگی: اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص کو "تلاشِ حق" کی "دُھن" ہوگی۔ وہ تو مقبول ہوگا۔ لیکن جس کو "غیر خدا" کی "دُھن" ہو لی۔ وہ مقبول نہیں ہوگی: اسی لئے قرآن میں "لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ[3]" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کیونکہ "خدا کی دُھن" کے علاوہ دُنیا میں سینکڑوں اَور ہزاروں "دُھنیں" اَور بھی ہیں!

اب ہر "دُھن" کے حصول کے لئے ایک انسان کوئی نہ کوئی روش اختیار کرتا ہے۔ اَور ہر روش میں کچھ نہ کچھ محنت بھی کرنی پڑتی ہے: لہٰذا ہر "دُھن" کی روش کو "مذہب" سمجھ لیجئے۔ اَور ہر روش میں جو محنت کرنی پڑتی ہے۔ اُس کو عبادت کہ لیجئے:

اِس لحاظ سے اگر ایک انسان کو "تلاشِ حق" کی دُھن ہے۔ تو "خدا کی معرفت" اُس کا "دین" ہوگا۔ اُس کے

---

[1] یعنی تحقیق اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے: (سورۃ ۳ آلِ عمران۔ آیت ۱۹):

[2] اَور جو کوئی اسلام کے سوا دین چاہے گا۔ وہ ہرگز اُس سے قبول نہ کیا جائے گا: (سورۃ ۳ آلِ عمران۔ آیت ۸۵)

[3] تمہارے لئے تمہارا دین۔ اَور میرے لئے میرا دین: (سورۃ ۱۰۹ الکٰفرون۔ آیت ۶):

Marfat.com

حصول کے لئے جو وہ رویّہ یا روش اختیار کرے گا۔ وہ اُس کا "مذہب" ہوگا۔ اور اُس مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو وہ تگ و دَو کرے گا۔ وہ اُس کی "عبادت" ہوگی ؛

اب اِس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس وقت ہمارا " دین ومذہب" کیا ہے ؟ اور اُس مذہب کی "عبادت" کیسی ہے ؟

اگر ہمیں یہ " دُھن " ہے۔ کہ ہمیں " خدا کی معرفت " حاصل ہو۔ پھر تو ہمارا دین و مذہب بھی درست اور عبادت بھی درست۔ لیکن اگر ہمیں " دُھن " اس کے علاوہ کچھ اور ہو۔ تو پھر نہ ہمارا دین و مذہب صحیح اور نہ عبادت صحیح ؛

اب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کی معراج " معرفتِ الٰہی " ہے۔ اور یہ محض زبانی دعوٰی ہی نہیں۔ بلکہ اسلام کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے۔ کہ وہ خدا رسیدہ لوگوں کو معرضِ وجود میں لائے۔ تو اُس کے لئے لازمی ہے۔ کہ موجودہ دَور کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی ظہُور میں آئے۔ کہ جس میں انہی ہستیوں کا دَور دَورہ ہو ؛ چنانچہ اس کتاب کے اگلے باب میں انہی ہستیوں کا ذکر آتا ہے ؛

اِس موقع پر یہ کہنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر لوگ اِس دُنیا میں " دیدارِ الٰہی " کے قائل نہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک یہ موقوف بہ محشر ہے ؛ اگر یہ واقعی ایسا ہے۔ تو قرآن میں قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى[1] کے الفاظ استعمال کرنے کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی ؟ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى[2] کہنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی ؟ اِسی طرح اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى[3] کے الفاظ کیوں استعمال کئے گئے ؟ جو لوگ ان صریح الفاظ کے معنی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ " فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً[4] " کے مقابلہ میں " فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً[5] " کی تشبیہ کی نزاکت کس طرح سمجھ سکتے ہیں ؟ اِن دو جملوں میں نکتہ یہ ہے۔ کہ جب ہم خود اِس بات کے قائل ہیں۔ کہ " دیدارِ الٰہی " ضرور ہوگا۔ اور اُس کے لئے قرآن " فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً " کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو وہی قرآن جب " فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً " کے الفاظ استعمال کرے۔ تو کیا اِس بات کی طرف اشارہ نہیں۔ کہ

---

[1] گویا اللہ تعالیٰ کے جلوے اور محبوبؐ میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا ؛ (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۹) ؛

[2] یعنی دل نے جھوٹ نہ کہا۔ جو دیکھا (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۱۱) ؛

[3] تو کیا تم اُن سے اُن کے دیکھے ہوئے پر جھگڑتے ہو ؟ (سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۱۲) ؛

[4] دُنیا میں بھلائی (سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲۰۱) ؛

[5] آخرت میں بھلائی (ایضاً) ؛

Marfat.com

انسانیت کی معراج اس میں مضمر ہے۔ کہ ہر شخص اپنے اندر ایسا جوہر پیدا کرے۔ کہ خدا کی تجلیات اُس کے دل پر وارد ہوں۔ تاکہ جو کچھ آخرت میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ اِسی دُنیا میں نصیب ہونا شروع ہو جائے؟ یہی دراصل زندگی کا حقیقی مقصد ہے! اور یہی "فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ" کا صحیح فلسفہ ہے!

اِس سلسلہ میں ایک اَور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ ایک انسان کی آنکھیں اِس بات کی اہل ہی نہیں۔ کہ وہ خدا کا دیدار کر سکیں۔ تو یہ بات باور کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک انسان کی رُوح کے متعلق اِس قسم کا خیال رکھنا مضحکہ انگیز ہے۔ چونکہ رُوح تو نہ صرف "مِنْ اَمْرِ رَبِّی"[1] ہے۔ بلکہ "مِنْ رُّوْحِہٖ"[2] بھی ہے! یہ بات درست ہے۔ کہ ہر ایک انسان کی رُوح ابتدائی حالاتِ زندگی میں "حجابوں" میں ہوتی ہے۔ اور یہ "حجابات" صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان لانے اور آپ کی سُنّت پر صحیح طور پر عمل کرنے سے ہی اُٹھتے ہیں۔ لیکن جب یہ "حجابات" اُٹھ جاتے ہیں۔ تو پھر کیا اِس قسم کی رُوح کسی بات میں بھی "کوتاہ" رہ سکتی ہے؟ تمام پیغمبروں کے معجزات اور تمام اولیاؤں کے کشف و کرامات اُسی قسم کی رُوحوں کے کرشمے تو ہیں۔ جن کے "حجابات" اُٹھ چکے ہوتے ہیں! اور اِن "حجابات" کے اُٹھنے کی صورت بھی نہایت ہی تدریجی رہی ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ میں ذیل کا شعر بہترین طریقہ پر حقیقت آرائی کرتا ہے۔ یعنی ؎

موسیٰؑ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات تو عین ذات می نگری در تبسمے!

غرض اِس تمام بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے۔ کہ اِس وقت اسلام کو **سمجھنے** کی ضرورت ہے۔ اِس کو نئی صورت میں **تشکیل** کرنے کی ضرورت نہیں!

چنانچہ اگر ہم بگڑتے ہوئے حالات کو سُدھارنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ "تقدیر" منطق کی رُو سے ثابت شدہ امر ہے۔ یہ نہیں کہ یہ یونہی "قیاس آرائی" ہے!

یہ کہنا ہوگا۔ کہ "شر" ہمارے امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں۔ کہ نہ "شر" پیدا کیا جاتا اور نہ لوگ شریر ہوتے!

یہ جاننا ہوگا۔ کہ دُنیا ایک "کھیل" ہے۔ اِس میں ہر شخص کو ایک اعلیٰ کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے حصہ لینا ہے؛ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا، یا فواحش میں خود مُبتلا ہونا۔ اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا، یا ڈاڑھی والوں کی پھبتیاں اُڑانا۔ یا مصائب سے اتنا گھبرانا کہ خودکشی کر لینا۔ یہ کھیل میں حصہ لینا نہیں۔ بلکہ فرار کی صورت ہے!

---

[1] یعنی میرے رب کے حکم سے ایک چیز؛ (سورۃ ۱۷ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵)؛

[2] یعنی اپنی طرف کی رُوح؛ (سورۃ ۳۲ السجدۃ۔ آیت ۹)؛

Marfat.com

یہ تسلیم کرنا ہوگا۔ کہ زندگی کا مقصد "معرفتِ الٰہی" ہے۔ صرف "ذرّات کا تجزیہ" نہیں! کیونکہ سائنس کی لیبارٹری (Laboratory) میں "مادے کی معرفت" تو حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان "خدا رسیدہ" نہیں ہو سکتا! اس کے لئے سُنّت کی پیروی، لازمی اور لابُدی ہے!

یہ ظاہر ہے کہ دُنیا نے جب بھی خدا کے احکام سے رُوگردانی کی۔ تو قدرت نے ہمیشہ طُوفان اور زلزلوں سے انتقام لیا۔ لہٰذا موجودہ زمانہ، قدرت کے تھپیڑوں سے مستثنیٰ نہیں ہے!

لہٰذا اگر نیل کا دریا چلتا چلتا تھم سکتا ہے۔ تو یہ ریل دَوڑتی دَوڑتی رُک سکتی ہے۔ اور ہوائی جہاز اُڑتا اُڑتا ٹھہر سکتا ہے! اس لئے موجودہ سائنس کی ترقی، اس قدر انحصار کے قابل نہیں۔ جتنی کہ ہم اِس وقت سمجھ رہے ہیں!

رسولِ پاک صلعم کا معراج۔ حضرت عیسیٰؑ کا آسمان پر اُٹھائے جانا۔ حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا کی تسخیر، اور اس قسم کے بیسیوں اور واقعات ہمیں یہ بتاتے ہیں۔ کہ قُدرت کے کارخانے میں ترقی کی راہیں صرف مادی ہی نہیں ہیں۔ بلکہ رُوحانی بھی ہیں۔ اور رُوحانی دَور میں، مادی ترقی خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا گھونسلا، شاخِ نازک کی بجائے مضبوط تنے پر بنانا چاہیئے۔ تاکہ تُند ہواؤں کے وقت ہم پریشان نہ ہوں!

اسی لئے اسلام کے "steel frames" (آہنی ڈھانچے) اولیائے کرام ہیں۔ سائنسدان۔ فلسفی۔ یا شعرا نہیں!

لہٰذا ہماری اصلی ڈھال "براہیمی ایمان" ہے۔ سائنس کی تھیوریاں theories نہیں!
کل کو دُنیا میں "اِتمامِ نُور" ہونا ہے!

"مادی ترقی کا اِتمام" مقصود نہیں!

لہٰذا ہمیں اپنے آپ کو اسلام کے فلسفہ کے مطابق ڈھالنا چاہیئے۔ اسلام کو مغربی فلسفہ کے مُطابق ڈھالنے کی بے سُود کوشش نہیں کرنی چاہیئے!

جن لوگوں نے اپنے آپ کو اسلام کے فلسفہ کے مُطابق ڈھالا۔ قرآن گواہ ہے۔ کہ گزشتہ زمانے میں وہ انبیا کہلائے؛ چنانچہ اِس وقت بھی جو اپنے آپ کو اس طرح ڈھال چکے ہیں۔ وہ "اولیاء" ہی کہلاتے ہیں۔ اور جو آئندہ اپنے آپ کو اس طرح ڈھال لیں گے۔ وہ بھی "اولیاء" ہی کہلائیں گے!

گذشتہ انبیاء اور اولیا کی کہانی ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ موجودہ اور آئندہ اولیا کی سرگزشت اب اگلے باب میں پڑھیئے!

(آئندہ باب کو پڑھتے وقت اِس بات کو ذہن میں رکھیں۔ کہ اُس میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ کوئی پیشین گوئی نہیں ہے۔ بلکہ وہ موجودہ دَور کا ایک قسم کا "ردِّ عمل" اور قدرتی "نتیجہ" ہے! لہٰذا آئندہ گذارشات کو آپ ایک قسم کا مستقبل کا "قطعی قیاس" سمجھ لیں۔ جس کو انگریزی میں "intelligent forecast" کہتے ہیں!)

Marfat.com

باب پنجم

رُوحانی زمانہ

"طائرانِ حرم کا دَور دَورہ!" آیئے۔ اب ہم اس دَور کو تھوڑا سا بے نقاب کریں۔ جب محفلِ ہستی میں "طائرانِ حرم" کا دَور دورہ ہوگا!

جس طرح جتنی رات تاریک تر ہوتی ہے۔ اتنی ہی سحر قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ اُسی طرح موجودہ زمانہ کے آثار و قرائن یہ بتا رہے ہیں۔ کہ "طائرانِ حرم" کے ظہور کا وقت اب قریب آگیا ہے!

ان کے ظہور کی پہلی نشانی اقبال ہے! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اقبال اس دُنیا میں پاکستان کے متعلق پیش گوئی کرنے آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر اقبال کو تو سمجھ گئے۔ لیکن اُنہوں نے شاعر اقبال کو بالکل نہیں سمجھا!

میرے نزدیک شاعر اقبال کی آمد کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ اُس "مردِ کامل" کے ظہور کی بابت دُنیا کو اطلاع دیں۔ جس کی معیّت میں "طائرانِ حرم" کا ظہور مقدر ہو چکا ہے! گویا اُن کی آمد کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ دُنیا کو اُس دَور اور اُس زمانہ کی بابت مطلع کریں۔ جس میں اسلام نے ایک دفعہ پھر اپنے عُروج کو پہنچنا ہے۔ اور اپنے پورے جوبن پر آنا ہے!

جیسا کہ ان صفحات میں ایک سے زائد مرتبہ کہا جا چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کی گردش جب اُس کو نقطہ ع پر لے جائے گی۔ (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ٨١)۔ تو اُس وقت غیب سے اُس "مردِ کامل" کا ظہور ہوگا۔ جس کے متعلق اقبال نے "آئی وبصد ناز آئی" کی صدا لگائی تھی!

یہ "ظہور" کس صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اس کے بارہ میں چند ایک اشارات باب سوم میں کئے جا چکے ہیں: ان "نشانیوں" کے بعد "مردِ کامل" اور اُن کے رفقا یعنی "طائرانِ حرم" (گویا اولیائے کرام) باری باری ایک ایک ملک کی طرف متوجہ ہوں گے:

جس ملک کی طرف وہ رجوع کریں گے۔ وہاں کی مشینیں پھر ہمیشہ کے لئے رُک جائیں گی: لوگ پھر سب کام اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نہ بے روزگاری ہوگی۔ اور نہ دولت چند محدود ہاتھوں میں جمع ہوگی:[1]

---

[1] اس سلسلہ میں دیکھیں فصل اسلامی معیشت (باب ششم):

Marfat.com

ہر ملک میں پھر رفاہِ عام کے لئے تین قسم کی سکیموں کو رواج دیا جائے گا:-

(۱) مفت طبّی امداد (جو کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرز پر ہوگی[1]) :

(۲) رسل و رسائل کے مفت انتظامات (جو حضرت سلیمانؑ کی طرز پر ہوں گے) : اور

(۳) مفت تعلیم (جو کہ "سینہ بہ سینہ" خاتم النبیینؐ کی طرز پر ہوگی) :

چونکہ اُس وقت مقصدِ حیات صرف یہ ہوگا۔ کہ لوگ پہلے کفر سے ایمان کی طرف آئیں۔ اور پھر ایمان سے عرفان کی طرف۔ لہٰذا "طائرانِ حرم" مختلف ممالک کی چند ایک چیدہ چیدہ ہستیوں کو جو دارِ فانی کو سدھار چکی ہیں۔ پھر زندہ کریں گے!

ان ہستیوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا مقصد یہ ہوگا۔ کہ وہ اپنے اپنے ملک کے باشندوں کو "آپ بیتی" سنائیں! اس طرح دُنیا کے لوگوں کو نہایت احسن طریقہ سے یہ سمجھ میں آجائے گا۔ کہ مَوت کے "آہنی پردہ" کے پیچھے انسانیت کو کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاکہ دُنیا کے لوگوں کو یہ ذہن نشین ہو سکے۔ کہ مذہب جن باتوں کے متعلق دُنیا کو متنبہ کرتا ہے۔ وہ "اساطیر الاولین" (یعنی پُرانے زمانہ کی دقیانوسی کہانیاں) ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے حقایق ہیں۔ جن سے انسانیت کو بالکل مفر نہیں!

اس قسم کی تبلیغ سے لوگ پھر خود بخود حق کی طرف کشاں کشاں کھچے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ان حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے "طائرانِ حرم" پہلے یہ کوشش کریں گے۔ کہ اُن کی فیضِ نظر سے پہلے لوگ باشعور ہوں۔ پھر دانا۔ اور آخر میں دانائے راز! لہٰذا پہلے وہ لوگوں کے کردار کی طرف متوجہ ہوں گے۔ تاکہ وہ یاوہ گوئی سے خاموشی کی طرف آئیں۔ اور پھر خاموشی سے صداقت اور سخن شناسی کی طرف۔ تاکہ وہ روشن ضمیر ہوں!

پھر وہ دُنیا کے لوگوں کو اس طرف مائل کریں گے۔ کہ وہ فاطر السمٰوٰت والارض کے "حسن" کے پہلے قائل ہوں۔ اور پھر گھائل۔ یہ دانائی کے راستہ میں پہلا قدم ہوگا!

اس کے بعد "طائرانِ حرم" اُن کا تعارف اُس ہستیؐ سے کروائیں گے۔ جس کی سُنّت کی پیروی انسان کو "دانائے راز" بناتی ہے!

غرض حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے پہلے پہلے اولیائے کرام کی طرف سے کائنات کی ہر اُس "رُوحانی تسخیر" کا ظہور ہوگا۔ جس "تسخیر" کا کہ حضرت عیسیٰؑ کے وقت ظہور ہوا تھا: صرف یہی ایک بات دُنیا کے عیسائیوں کی غلط

---

[1] اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دُنیا بھر کے لوگوں میں جو اندھے ہوں گے۔ اُن کو آنکھیں مِل گی۔ جو بہرے ہوں گے۔ وہ سننا شروع کر دیں گے۔ اور گذشتہ بڑی جنگوں وغیرہ میں جن جن لوگوں کے جو اعضا بھی ضایع ہوتے ہوں گے۔ ہر ایک کو وہ اعضا ملیں گے! یہی نہیں، بلکہ ہر سلیم الفطرت شخص آپ اپنا "عیسیٰ" ہوگا!

فہمی دور کردے گی۔ کہ کائنات کی جس "تسخیر" کے بارہ میں اُن کا یقین تھا۔ کہ صرف "خدا کا بیٹا" ہی کر سکتا ہے۔ حضور کے ادنیٰ جاں نثار اُس معیار سے بھی بہت اونچے درجہ پر پہنچ چکے ہوئے ہیں!

اس طرح جب لوگوں کے دل موہے جا چکیں گے۔ تو اُن کو آزادی دی جائے گی۔ کہ اسلام کے بارہ میں جو اُن کو شکوک ہیں۔ اُن کو وہ رفع کروائیں:

اُس وقت اسلام کے تین مسائل پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا جائے گا:۔

اوّل جانوروں کی قربانی کا فلسفہ کیا ہے؟

دوم پردہ کے حکم کا فلسفہ کیا ہے؟

سوم خاتم النبیینؐ کی شریعت' حضرت عیسیٰؑ کی شریعت سے بہتر کس طرح ہے؟

پہلا سوال ہندوؤں کی طرف سے ہوگا: دوسرا سوال دُنیا کے تمام باشندوں کی طرف سے' اور تیسرا سوال عیسائیوں کی طرف سے ہوگا:

تیسرے سوال کے بارہ میں تو عیسائیوں سے کہہ دیا جائے گا۔ کہ ابھی "کارِ جہاں دراز ہے"۔ لہٰذا وہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا انتظار کریں!

دوسرے سوال کے بارہ میں چونکہ ان صفحات میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لہٰذا یہاں اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں: البتہ اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ جب دُنیا پر یہ راز کھلے گا۔ کہ انسان کا اصل مقصدِ حیات صرف خدا کو ماننا ہی نہیں۔ بلکہ "خدارسیدگی" ہے۔ تو عورتوں میں سے سلیم الفطرت طبائع خود بخود جاننا چاہیں گی۔ کہ اُن کے لئے خدارسیدگی کس طرح ممکن ہے؟ چنانچہ "طائرانِ حرم" اپنی فیضِ نظر کا رُخ جب اُن کی طرف کریں گے۔ تو نہ صرف مغرب کی عام عورتیں۔ بلکہ وہ خواص' جو اِس وقت صرف "عُریانی" کو ہی زندگی کا اصلی مشغلہ سمجھ رہی ہیں۔ اور اِس وقت "عُریاں بستیوں" میں اپنی زندگی گزار رہی ہیں۔ اُن پر موجودہ رَو کا ردِّ عمل شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اپنے حرم میں رہنا اپنے لئے فخر سمجھیں گی۔ کیونکہ "دانائے راز" ہونے میں وہ اتنی چاشنی پائیں گی۔ کہ اُن کو اپنی موجودہ آزادی کو قربان کرنا ایک ہیچ سی قربانی منظور ہوگی!

اب پہلا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی جانوروں کی قربانی کا فلسفہ: اِس سلسلہ میں مسئلہ کے جس پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا جائے گا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اگر اللہ جل شانہٗ کو قربانی ہی منظور تھی۔ تو وہ لوگوں سے اُن کے اپنے بچوں اور بچیوں کی قربانی مانگتے۔ تو کچھ سمجھ میں آ سکتا تھا۔ لیکن بے زبان جانوروں کو ہدفِ مشق کیوں بنایا گیا؟

اس کا سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے۔ کہ ربّ العزت نے ایک موقع پر ایک بوڑھے باپ[1] سے اُس کے اپنے بیٹے[2] کو قربان

---

[1] حضرت ابراہیمؑ

[2] حضرت اسمٰعیلؑ

Marfat.com

کرنے کے لئے اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ قصّہ پوری طرح مشہور و معروف ہے۔ اس لئے اُس کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں :: لیکن غیر مسلم اقوام اِس قصّہ کو محض سُن لینے سے جانوروں کی قربانی کی قائل نہیں ہو سکتیں :: لہٰذا اُس موقع پر اس واقع کی عملی مثال پیش کی جائے گی :: [1]

اِس عملی مثال سے یہ لوگ اِس بات کے قائل ہوں گے۔ کہ مسلمان اگر دُنبوں کی قُربانی کرتے ہیں۔ تو یہ کسی بُزدلی کی وجہ سے نہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں کو خدا کی راہ میں قربان نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک "مُسلم" کی چھُری اُس کی اولاد پر کارگر ہی نہیں ہوتی !

"براہیمی سُنّت" کی یہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہوگی !

یہاں جانوروں کی قربانی کے فلسفہ کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے :: سورۂ انعام میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انسانوں کی اُمّتیں ہیں۔ اُسی طرح جانوروں کی بھی اُمّتیں ہیں :: جو جانور اپنی طبعی موت مریں گے، وہ تو دوسروں پر اپنے ظُلم وغیرہ کی سزا پاکر ختم ہو جائیں گے۔ لیکن جو ذبح کئے جائیں گے، وہ بہشت میں جائیں گے! اس طرح اُن کو اپنی جان قُربان کرنے کے صِلے میں وہ تمام راحتیں نصیب ہوں گی، جو انسانوں کے حِصّے میں آئیں گی! اِس لحاظ سے قُربانی کے حُکم میں جانوروں کی اپنی ہی بہتری مُضمر ہے!

غرض جب دُنیا نہ صرف جانوروں کی قربانی کے فلسفہ کو سمجھ لے گی۔ بلکہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے گی۔ کہ "طائرانِ حرم" میں اتنی طاقت ہے۔ کہ اُنہوں نے بعض "اکابرِ زمانہ" کو بھی زندہ کیا ہے۔ تو اُس وقت وہ پھر "وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا [2]" کی تفسیر ملاحظہ کرے گی۔ اور تعجب کرے گی۔ کہ کس طرح "آناً فاناً" سے

پاسباں مِل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے!

غرض اِن تمام حالات سے متاثر ہو کر جب ایشیائی دُنیا اسلام لے آئے گی۔ تب پھر وقت آجائے گا۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کو اُن کے نزُول کے بارہ میں اشارہ کیا جائے !

چنانچہ وہ دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر تشریف لائیں گے :: اُن کو "خوش آمدید" کہنے کے لئے "امام مہدیؑ" مینار پر موجود ہوں گے! اُس وقت "امام مہدیؑ" پھر حضرت عیسیٰؑ کا خاتم النبیینؐ سے تعارف کروائیں گے، جن کی نبوت کا ذکر انجیل میں پہلے سے ہی موجود ہے! حضرت عیسیٰؑ حضورؐ پر فوراً ایمان لے آئیں گے :: اور مینار سے اُتر کر جب نماز کا وقت آئے گا۔ تو "امام مہدیؑ" حضرت عیسیٰؑ سے فرمائیں گے۔ "قَدِّمْ" (یعنی وہ بڑھ کر نماز پڑھائیں)۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ فرمائیں گے۔ "اَنْتَ اِمَامُھُمْ" (یعنی آپ ہی اِس وقت

---

[1] یہاں اِس عملی مثال کی تشریح جان بُوجھ کر حذف کردی گئی ہے، تاکہ قارئین کرام بھی اِس مسئلے پر از خُود غور و خوض کر سکیں!

[2] اور لوگوں کو تم دیکھو گے کہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہیں :: (سورۃ ۱۱۰ النصر۔ آیت ۲) ::

Marfat.com

دُنیا کے امام ہیں۔ لہذا آپ ہی امامت کرائیں):

چنانچہ جب اول الذکر جماعت کرائیں گے۔ تو حضرت عیسیٰؑ اُن کے مقتدی ہوں گے!

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کی نبوّت کا تعلق ہے۔ اُس کے فرائض تو اُسی وقت ختم ہو گئے۔ جب وہ آسمان کی طرف اُٹھائے گئے۔ البتہ اُن کی "شریعت" برقرار رہی: لیکن جس وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شروع ہوئی۔ اُس وقت سے حضرت عیسیٰؑ کی "شریعت" بھی ختم ہو گئی!

البتہ اُن کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کا اقتضا یہ ہے۔ کہ جب تک وہ وہاں رہیں گے۔ اُن کی زندگی خالص رُوحانیت کی زندگی ہوگی۔ لیکن جُونہی وہ دمشق کی مسجد کے مینار پر قدم رکھیں گے۔ معاً اُس وقت سے اُن کو بشریت کے تقاضے شروع ہو جائیں گے!

اس دُنیاوی زندگی کو دوبارہ بسر کرتے وقت چونکہ وہ ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہوں گے۔ (گو اُن کی عمر اُس وقت تقریباً دو ہزار سال کے قریب ہوگی)۔ لہذا اس بلوغت و پاکیزگی کا معصومیت کے ساتھ مل کر اثر یہ ہوگا۔ کہ وہ خاتم النبیینؐ کی سُنّت پر صرف ایک دن عمل کرنے سے اُتنی ترقی کر جائیں گے۔ جتنی بہتر سے بہتر ترقی ایک انسان خاتم النبیینؐ کی سُنّت پر ایک سال عمل کرنے سے کر سکتا ہے۔ لہذا وہ چالیس دن میں چالیس سال کے برابر ترقی کر جائیں گے۔ اس عرصہ کے بعد اُن کی ترقی طبعی طریقہ پر ہوگی۔ کیونکہ پھر وہ "طائرانِ حرم" کی "سطح" پر آ چکے ہوں گے!

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ حضرت عیسیٰؑ اُس وقت "ہر رہگذر پہ نقشِ کفِ پائے یار دیکھ" کے اصول پر تن، من، دھن سے پابند ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ سُنّت کی پیروی کے شوق میں جب شادی کروانا چاہیں گے۔ تو اس موقع پر بھی وہ اس بات پر اصرار کریں گے۔ کہ اُن کی شادی کسی بیوہ سے ہو۔ کیونکہ حضورؐ کی پہلی شادی ایک بیوہ سے ہوئی تھی: (اسی اصول کے تحت اُن کی دوسری شادی کسی "صدیق" کی بیٹی سے ہوگی۔ اور تیسری شادی کسی "عمر" کی بیٹی سے۔ اس سے دُنیا کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دُہراتی ہے!)

اس سُنّت کی پیروی کا اثر یہ ہوگا۔ کہ حضرت عیسیٰؑ خود اس بات کو محسوس کریں گے۔ کہ اُن کی اپنی "شریعت" اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے کتنا نمایاں فرق ہے؟

اسی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ پھر خود عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مشرقی دُنیا کی مانند مغربی دُنیا بھی اسلام لے آئے گی!

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ عیسائی دُنیا اس وقت جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مان رہی ہے!

Marfat.com

تو وہ صرف اِس وجہ سے ہے۔ کہ وہ آپ کے مختلف معجزات سے "مرعوب" ہے! لیکن یہی عیسائی لوگ جب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔ کہ نہ صرف "مردِ کامل" اور اُن کے رُفقاء نے چاند کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ بلکہ مختلف ملکوں کے چیدہ چیدہ " اکابرِ زمانہ" کو دوبارہ زندگی بھی بخشی ہے۔ اور اس کے باوجود سب اپنے آپ کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ اور حقیر غلام ہی سمجھتے ہیں۔ تو اُن کی آنکھیں کُھل جائیں گی!

حضرت عیسیٰؑ کو اِس طرح دوبارہ دُنیا میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ کہ دُنیا کے لوگ اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں۔ کہ خدا کی نظر میں معجزوں اور کرامات کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ بلکہ قدرت اُن کو محض بازیچۂ اطفال تصوّر کرتی ہے۔ لہٰذا انسان نہ ان سے خدا بن جاتا ہے۔ اور نہ خدا کا بیٹا!

اُس وقت عیسائی دُنیا پھر اِس بات کی معترف ہوگی۔ کہ ایک ایک سُنّت کی پیروی میں کتنا اعجاز مضمر ہے۔ (اگو موجودہ زمانہ کے مستشرقین کو سُنّت میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی)!

چنانچہ اِس معجز نما سُنّت کی پیروی کے شوق میں جب آہستہ آہستہ دُنیا کے اکثر و بیشتر لوگ "دانائے راز" ہو جائیں گے۔ یعنی انسانوں کا تعلق باللہ ہو جائے گا۔ اور وہ خدا رسیدہ ہو جائیں گے۔ تو اُس وقت ایک ایسا واقعہ رُونما ہوگا۔ کہ دُنیا دنگ رہ جائے گی۔ اور وہ واقعہ یہ ہوگا۔ کہ سُورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلُوع ہوگا!

اِس کے متعلّق اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ اُس وقت انسانیت کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یعنی لوگوں سے توبہ قبول نہیں ہوگی!

اِس معمّہ میں راز یہ ہے۔ کہ چونکہ اُس موقع پر "طائرانِ حرم" کی تربیت کی وجہ سے دُنیا کے عوام ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچ جائیں گے۔ کہ وہ انسانیت کے "رقیب" کے "ہر کید" اور فریب سے نہ صرف پوری طرح آگاہ ہو جائیں گے۔ بلکہ "شر" پر وہ اتنی قدرت حاصل کر لیں گے۔ کہ اُن سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوں گے۔ (گویا ان حالات میں چونکہ گناہ سے معافی مانگنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی)۔ لہٰذا جب انسانیت شرافت و نجابت کے اِس اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گی۔ تو پھر سورج کو اِشارہ کیا جائے گا۔ کہ وہ مغرب سے طلُوع ہو!

یہ وہ زمانہ ہوگا۔ جب انسانیت اپنے "عدوٌ مبین" پر کامل طور پر فتح حاصل کرے گی! یہ انسانیت کی کامیابی و کامرانی کا انتہائی عروج کا زمانہ ہوگا! یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اور یہی اُس کے "عشق" کی کہانی کا "انجام"!

اُس وقت ربّ العزت نہ صرف سب انسانوں کو بلکہ تمام کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو اپنی تجلّیات سے نوازیں گے! یہ "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ"[1] کی تفسیر ہوگی! انسانیت اُس وقت پھر اپنی کامرانی و خوش نصیبی

[1] اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے! (سورۃ ۶۱ الصف۔ آیت ۸)!

Marfat.com

پر جتنا بھی فخر کرے گی۔ وہ بجا ہوگا!

اُس وقت دُنیا پھر "اِنّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ[1]" کی تفسیر سمجھیگی! اُس وقت دُنیا پھر جانے گی۔ کہ یہ مٹی کا پُتلا اگر ایک طرف ظلم و فساد کر کے درندوں سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ تو دوسری طرف اس میں عشق کی اتنی حرارت ہے۔ کہ وہ فرشتوں کا مسجود ہونے کے بھی قابل ہے!

اُس وقت پھر فرشتے بھی اِس بات کے معترف ہوں گے۔ کہ رب العزت نے "اِنّیٓ اَعۡلَمُ" کے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ اُن میں راز کیا تھا؟

اب یہ کامیابی و کامرانی کا دَور کتنا عرصہ رہے گا۔ اس کی بابت غالباً کسی کو ابھی علم نہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے۔ کہ جب فرشتے خود اِس بات کی گواہی دیں گے۔ کہ انسانیت نے واقعی اپنے "عدوٌ مبین" پر نہ صرف کامل بلکہ شاندار فتح حاصل کر لی ہے۔ تو پھر سورج کو اجازت دے دی جائے گی۔ کہ وہ معمول کے مطابق پھر مشرق سے طلوع ہو!

اُس وقت انسان کے "عدوٌ مبین" کو ایک مرتبہ اور موقع ملے گا۔ کہ وہ اپنا آخری حملہ بھی بول لے۔ چنانچہ جو لوگ انسانیت کے "رقیب" پر قابو پا چکے ہوں گے۔ وہ تو اِس حملہ سے بھی متاثر نہیں ہوں گے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ قدرت بھی غضبناک ہو جائے گی! اُس وقت پھر اس قدر ہولناک بھونچال آئیں گے۔ کہ لوگ دہل جائیں گے۔ یہاں تک کہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ اور خوف کی وجہ سے معصوم بچوں کے چہروں پر بوڑھوں جیسی جھریاں پڑ جائیں گی! آخر کار پھر ایک صُور پھونکا جائے گا۔ جس سے تمام دُنیا یکدم تہس نہس ہو جائے گی! دُنیا کا کھیل پھر اس طرح ختم ہو جائے گا۔ اور "یوم حشر" شروع ہوگا!

غرض دُنیا کی اس اَلَمناک اور اَلَم انگیز کہانی کو صرف ایک مصرعہ پر ختم کیا جا سکتا ہے ؎

ڈرو اُس وقت سے جو ہے آنیوالا!
ڈرو اُس وقت سے جو ہے آنیوالا!!

---

[1] سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۳۰ ؛ مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے!

Marfat.com

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے!
صنم کدہ ہے جہاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ!!

(اقبال)

Marfat.com

باب ششم
متفرقات

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کی تفسیر

قرآن میں ایک تو اس قسم کے احکام اور واقعات کا ذکر ہے

جن کے بارے میں ایک انسان کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی: مثلاً قرآن راستگوئی اور عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ بظاہر ہے۔ کہ ان احکام کے ماننے میں کسی کو بھی کسی قسم کا تردد نہیں ہو سکتا:

اسی طرح قرآن کہتا ہے۔ کہ جب بارش ہوتی ہے۔ تو مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ اور اُس میں سے ہر قسم قسم کی چیزیں اُگتی ہیں: اس سے بھی کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی:

لیکن اس قسم کی باتوں کے علاوہ قرآن میں ایسے واقعات کا ذکر بھی آتا ہے۔ جو بظاہر ناممکن الوقوع معلوم ہوتے ہیں: مثلاً جب حضرت ابراہیمؑ کو نمرود نے آگ میں پھینکا۔ تو اُن کے لئے آگ گلزار بن گئی۔ یا حضرت موسیٰؑ اور اُن کی قوم کے لئے تو بحرِ قلزم پھٹ گیا۔ جس میں سے وہ سب صحیح و سلامت گذر گئے۔ لیکن فرعون اور اُس کے ساتھیوں نے جب تعاقب کیا۔ تو پانی پھر مل گیا۔ اور وہ سب کے سب اُس میں غرق ہو گئے۔

ایسی باتیں پڑھ کر ایک انسان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اس قسم کے حادثات ممکن الوقوع بھی ہیں۔ یا نہیں؟

" ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ [1] " کے الفاظ صرف انہی قسم کے واقعات کے بارے میں آئے ہیں: تاکہ عوام الناس ان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کریں: اب جو لوگ ایسے واقعات کو نہیں مانتے۔ اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ کہ اُن کا قرآن پر ایمان ہے۔ اُن کا یہ رویہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ معجزات کو نہیں مانتے۔ یا کائنات کی "روحانی تسخیر" کے قائل نہیں۔ انہوں نے مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کے راز کو ہی نہیں سمجھا!

---

[1] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲: یعنی اس کتاب میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں:

Marfat.com

گذشتہ اَوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن، معجزات کو خدا کی "نعمتیں" کہتا ہے؛ اور رسولِ پاکؐ کے زمانے میں اِن نعمتوں کا "اِتمام" ہُوا ہے؛ چنانچہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کا ثبوت اِس سے ملتا ہے۔ کہ نہ صرف چاند انگلیوں کے اشاروں سے شق ہُوا۔ بلکہ سورج کو بھی اِدھر سے اُدھر کیا گیا۔ اِن واقعات سے قدرت کو جتانا یہ مقصود تھا۔ کہ یہ محیر العقول دُنیا "عشق" کے لئے یونہی "بازیچۂ طفلاں" ہے!

لہٰذا اگر ہم اِس وقت آئندہ آنے والے "رُوحانی زمانہ" کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہماری نظر صرف گذشتہ تین چار صدیوں تک محدود ہے؛ دُنیا کی تاریخ اُس وقت سے شروع نہیں ہوتی۔ جب سے "مشین کا زمانہ" شروع ہُوا ہے؛ اِس کی تاریخ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب "حسن" نے "عشق" کی تخلیق کی!

اگر ہم تاریخ کا اُس وقت سے مُطالعہ کریں۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ہزار، ڈیڑھ ہزار سال کے بعد دُنیا میں ایک "حادثۂ عظیم" رونما ہوتا رہا ہے! پے در پے "حادثاتِ عظیمہ" ہمیں یہ سبق دیتے ہیں۔ کہ جب بھی دُنیا کے لوگ انسان کے "عدوِ مبین" کے ہاتھوں "کٹھ پُتلی" بنے۔ تو اُن کا رویّہ انسانیت کے لئے "قہر" ثابت ہُوا۔ لیکن جب وہ آسمانی ہدایت کو سامنے رکھ کر اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوئے۔ تو پھر اِن کا رویّہ انسانیت کے لئے "معراج" ثابت ہُوا!

اِسی لئے حضرت نوحؑ کے زمانہ کا طوفان، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں فرعون اور اُس کی فوج کا بحرِ قلزم میں غرق ہونا، اور اسی قسم کے دوسرے عذاب، انسانیت کی "شکست" ہیں! اس کے برعکس حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اُڑنا، حضرت عیسیٰؑ کا مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دینا، اور رسولِ پاکؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج، انسانیت کی فتح اور کامرانی کا ثبوت ہیں!

یہ تمام "حادثاتِ عظیمہ" گو بالکل مختلف ہیں۔ لیکن ان کی نوع ایک ہی ہے!

اب ہم چونکہ خدا کے "آخری حرف" کے حامل ہیں۔ لہٰذا یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے۔ کہ ہم یہ دیکھیں۔ کہ آئندہ اِس دُنیا نے کون سا "موڑ" مُڑنا ہے۔ اور اُس وقت پھر کس قسم کا "گُل کھلنا" ہے؟ تاکہ جب موقع عین سر پر آن پہنچے۔ تو اُس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں نہ پھولنے لگیں۔ بلکہ ہمیں علم ہو۔ کہ اونٹ نے کس کروٹ بیٹھنا ہے؟ اور ہم میں سے ہر فرد، دُنیا کے لوگوں کو یہ کہہ سکے۔ کہ "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[1]!"

یہ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب ہمیں "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[2]" کا فلسفہ

---

[1] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰؛ یعنی مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے۔

[2] سورۃ ۴۸ الفتح۔ آیت ۲۳؛ اور ہرگز تم اللہ کا دستور بدلتا نہ پاؤ گے۔

Marfat.com

معلوم ہو! " عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ[1] " کی تفسیر کا علم ہو!! اور " ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ[2] " کے الفاظ میں جو راز ہے۔ ہم اُس راز سے آشنا ہوں!!!

اِن آیات اور احادیث میں راز صرف یہ ہے۔ کہ قرآن کی "معجزات والی کہانی" ختم نہیں ہوگئی۔ بلکہ اِس کہانی نے ابھی کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے رُوپ میں رُونما ہونا ہے۔ تاکہ ہر سلیم الفطرت شخص آپ اپنا "سلیمان" اور آپ اپنا "عیسیٰ" ہو! لہٰذا موجودہ زمانہ دُنیا کے ڈرامہ کا آخری سین نہیں ہے۔ بلکہ آخری سین نے ابھی آنا ہے۔ جو "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[3]" کی تفسیر ہوگا۔ اور وہی "عشق" کی کہانی کا "انجام" ہوگا!
قرآن کے الفاظ "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ[4]" دراصل نہ صرف اس نظریے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بلکہ اِس کا حتمی ثبوت بھی ہیں!

قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۱)

قرآن میں بعض آیات ایسی بھی ہیں۔ جن میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے: مثلاً قرآن میں ایک جگہ آتا ہے:۔ "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ[5]"۔ لیکن دوسری جگہ آتا ہے:۔ "تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ[6]" ایسے تمام موقعوں پر یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ اس قسم کی بظاہر متضاد آیتیں دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور دونو بالکل درست ہیں!

مثلاً پاکستان کے نئے پیسے والے سکہ پر ایک طرف چاند تارا نظر آتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک کا ہندسہ ہے: ایسی صورت میں ہم یہ نہیں کرتے۔ کہ ہم پیسہ والے سکہ کو تسلیم ہی نہ کریں۔ کہ اس کی ایک طرف کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف کچھ اور، بلکہ دونو رُخوں کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ دونو اپنی اپنی جگہ پر موزوں اور درست ہیں! یہی

---

[1] میری امت کی علما بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہیں:
[2] سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۲: یعنی اس کتاب میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں:
[3] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۳۰: یعنی مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے:
[4] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲: یعنی اس کتاب میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں:
[5] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۸۵: یعنی ہم کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے: چونکہ سب رسول ہم پایہ ہیں:
[6] سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۵۳: یہ رسول ہیں۔ کہ ہم نے اُن میں ایک کو دوسرے پر فضل کیا:

Marfat.com

بظاہر متضاد آیتوں کے تضاد کا جواز ہے ؛

اب اِس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ دونو مندرجہ بالا آیتوں کی آپس میں مطابقت کس طرح ہوتی ہے؟ اس کی مثال کسی عمارت میں اینٹوں کے استعمال کی سی ہے ؛ کچھ اینٹیں بنیاد میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اِن کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ اِن کی کوئی تعریف کرتا ہے۔ لیکن جو اینٹیں عمارت کے نقش و نگار میں کام آتی ہیں۔ اُن کو دُنیا دیکھتی بھی ہے۔ اور تعریف بھی کرتی ہے ؛ اب جہاں تک کہ اینٹوں کے کارآمد ہونے یا اُن کی افادیت کا تعلق ہے۔ ہر اینٹ اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے۔ کسی کو غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ وہ بنیاد میں لگی ہو۔ یا نقش و نگار والی جگہ پر لگی ہو ؛ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ میں افادیت اور اہمیت کے پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کہ کسی رسول کی افادیت اور اہمیت سے بھی انکار کیا جا سکتا ؛ لیکن جس طرح تعریف صرف اُنہی اینٹوں کی ہوتی ہے۔ جو نقش و نگار میں کام آتی ہیں۔ اور بنیاد والی اینٹوں کا کبھی کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اُسی طرح رسولوں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت ہے فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کے الفاظ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ؛

قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۲)

بالکل اسی طرح قرآن میں ایک جگہ آتا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى[1] اور دوسری جگہ آتا ہے۔ "فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ[2]" گویا ایک جگہ تو یہ کہا گیا ہے۔ کہ ایک انسان کی کامیابی کا راز صرف اُس کی اپنی کوشش میں مضمر ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہے ہدایت دے دیتا ہے ؛ یہاں بھی دونو آیات کو اپنی اپنی جگہ درست سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے روزمرّہ کے تجربہ کی بنا پر دیکھیں۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ انسانی سعی کے بغیر کوئی کام بھی دُنیا میں چل نہیں سکتا۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے ؛ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی اتنا ہی سچا ہے۔ کیونکہ اگر ذرا تعمق کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ اس دُنیا کا کھیل ایک خاص پروگرام کے مُطابق چل رہا ہے ؛ مثال کے طور پر جس زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ اور جس ملک میں آپ نے پرورش پائی۔ عین اُسی زمانہ اور اُسی ملک میں نمرود کا ہونا کیا ظاہر کرتا ہے؟ صرف یہ کہ "ہر فرعونے را موسیٰ"! اگر یہ دو قسم کے کیریکٹر (character) علیحدہ ایک ہی وقت اور ایک ہی مقام پر نہ ہوتے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ دُنیا کا کھیل "ڈرامہ" کی صورت اختیار ہی نہیں کر سکتا

---

[1] سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۳۹ ؛ یعنی ایک انسان کو کچھ حاصل نہیں۔ مگر اس کی کوشش کے مطابق ؛

[2] سورۃ ۳۵ فاطر۔ آیت ۸ ؛ اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہے !

Marfat.com

گویا دُنیا کے کھیل کی جو اُفتاد ہے۔ اُس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ جہاں فرعون ہو۔ وہاں موسیٰؑ ضرور رہو۔ اسی طرح نمرود و ابراہیمؑ کا بیک وقت ہونا بھی ضروری ہے:

اب یہ بات کہ فرعون، موسیٰؑ کیوں نہ بنا؟ یا ابراہیمؑ، نمرود کیوں نہ بنا؟ قرآن میں اسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ کہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ گویا اس دُنیا میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں! اس مسئلہ کی تفصیل "تقدیر و تدبیر" والی فصل میں گذر چکی ہے۔ لہٰذا یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں: یہاں صرف اتنا بتانا مقصود تھا۔ کہ بظاہر دو متضاد آیتیں، حقیقت میں، اپنی اپنی جگہ، کُلّی طور پر درست ہوتی ہیں!

أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[1] کی تفسیر: حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "نُور" ہیں۔ یا "بشر"؟ اس مسئلہ پر اکثر بحث رہتی ہے: حقیقت یہ ہے۔ کہ حضورؐ کی ذات "دوہری شخصیت" کی حامل ہے۔ جسے انگریزی میں "Dual Personality" کہتے ہیں: گویا آپ کی ایک تو "نُورِ مصطفویؐ" والی کیفیت ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اُس حدیث سے ملتا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:-

أَنَا مِنْ نُّورِ اللهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِيْ

(یعنی میں اللہ کے نُور سے ہوں۔ اور تمام دُنیا میرے نُور سے ہی بنائی گئی ہے!)

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس دُنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ اُس کا "خمیر" نُورِ مصطفویؐ ہی ہے۔ لہٰذا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہے۔ اور رحمۃ للعلمین بھی ہے۔[2] اس کی تفصیل چونکہ باب اوّل میں گزر چکی ہے۔ لہٰذا اُس کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں:

یہاں حضورؐ کی دوسری یعنی "بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" والی شخصیت کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

حضورؐ کی "بشریت" والی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں: ایک پہلو تو یہ ہے۔ کہ آپؐ کی ولادت عام انسانوں کی طرح ہوئی۔ اور زندگی بھر، تمام تقاضے بھی ساری بنی نوعِ انسان کی طرح ہی رہے: اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ جس ذاتؐ نے تمام دُنیا کے لئے نمونہ بننا تھا۔ اُس کے لئے لازمی تھا۔ کہ وہ انسانی زندگی کے تمام صعُود و ہبُوط عام انسانوں کے تقاضوں کے مُطابق ہی گزارے۔ تاکہ حضورؐ کو ذاتی طور پر احساس ہو۔ کہ بنی نوعِ انسان پر کیا گزرتی ہے؟ کس طرح گزرتی ہے؟ اور سب قسم کی دُشواریوں کا پھر مداوا کیا ہے؟

لہٰذا آپؐ کی زندگی، کٹھن سی کٹھن منازل سے گزری: مثلاً بچپن، ماں باپ کی محبت بھری نظروں کے بغیر

---

[1] سورۃ ۱۸ الکھف۔ آیت ۱۱۰: میں تم جیسا بشر ہوں۔

[2] دیکھیں حاشیہ بر صفحہ ۲۷۷:

Marfat.com

گذرا ! اور پھر تنگی ترشی میں بھی گذرا ! کسی مدرسہ میں یا اُستاد سے تعلیم بھی نہیں پائی !

جب دُنیا میں تشریف لائے۔ تو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ باپ کا سایہ پیدائش سے پہلے ہی اُٹھ چکا ہُوا ہے۔ نہ یہ علم ہُوا۔ کہ اُنہوں نے دُودھ مائی حلیمہ کا پیا۔ وغیرہ۔ وغیرہ ؛

لیکن جب ہوش سنبھالی۔ تو ایک بات خاص طور پر پائی گئی۔ وہ یہ کہ طبیعت میں نہ بچوں والی شرارت، شوخی یا چنچل پن تھا۔ اور نہ کھیل کُود کی طرف رغبت ! صرف یہی چیز حضوؐر کو ایک دوسری شاہراہ پر لے گئی ؛

یہ ایک نفسیاتی کُلیّہ ہے۔ کہ ایک انسان جتنی سُلجھی ہوئی اور تمیز والی زندگی گزارتا ہے۔ اتنا ہی وہ روشنضمیر ہوتا ہے ؛ چنانچہ یہی روشنضمیری آپؐ کو اُس طرف لے گئی۔ جس طرف ہر سلیم الفطرت انسان جانے کے لئے مجبور ہے ؛ یعنی دل میں اس قسم کے خیالات آنے شروع ہو گئے۔ کہ یہ دُنیا کیا ہے ؟ کیوں بنی ہے ؟ کس طرح بنی ہے ؟ اس کا خالق خود کہاں ہے ؟ اس قسم کے خیالات آخرکار ایک انسان کو "تلاشِ حق" کی لگن لگا دیتے ہیں ! پھر وہ بیکل سا رہتا ہے ! بے چین سا رہتا ہے ! بیقرار سا رہتا ہے ! کسی چیز میں دل نہیں لگتا ! علیحدگی چاہتا ہے ! یکسوئی چاہتا ہے !

چنانچہ دل کی یہ جلن حضوؐر کو غاروں میں لے گئی ! اب خود تھے۔ یا اندر سُلگنے والی آگ تھی ! آہیں تھیں، یا آنسو تھے ! یہ ابتدا تھی !

جگر نے ایک انسان کی اسی قسم کی حالت کو نہایت ہی خوبصورت لفظوں میں باندھا ہے۔ کہتا ہے ؎

آغازِ محبت ہے، آنا ہے، نہ جانا ہے !

اس دُنیا میں کٹھن ترین منزل وہی ہوتی ہے۔ جب کہ محبوب کے ہاں ابھی رسم و راہ نہ پیدا ہوئی ہو ! یہ انسان کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔ اور انسان کے سب بل نکال کر رکھ دیتی ہے !

چنانچہ خدا خدا کر کے آخر کار جب "تلاشِ حق" یا جدائی کی منزل کامیابی سے طے ہو گئی۔ اور دُوسری منازل کی مشکلات سامنے آئیں۔ تو پھر قرآن نے پہلی منزل کی طرف بڑے پیارے لفظوں میں اشارہ کیا ہے ؛ قرآن، نئی منازل کی مشکلات کا مقابلہ کرنے، اور حوصلہ دینے کے لئے کہتا ہے۔ کہ محبوبؐ گھرائیے نہیں ! پہلی جدائی کی کٹھن منزل یاد نہیں ؟ جب "نہ آنا جانا تھا" ! تو کس طرح "آنا جانا ہو گیا تھا" ؟

دیکھئے ! قرآن نے "نہ آنے جانے والی کیفیت" سے "آنے جانے والی کیفیت" میں تبدیلی کا کن الفاظ میں ذکر کیا ہے ! ارشاد ہوتا ہے :

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ۝[1]

---

[1] سورۃ ۹۳ الضحٰی۔ آیت ۷، ؛ تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا۔ تو اپنی طرف راہ دی ؛

Marfat.com

قرآن نے "ضَلّ" کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے :- جب وہ اس لفظ کو کُفّار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ پھر تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ گمراہ کے۔ یعنی جن کا دین وایمان کوئی نہ ہو :- لیکن جب وہ اسی لفظ کو مومنوں کے حق میں استعمال کرتا ہے۔ تو پھر اس کے معنی ہوتے ہیں ایسے لوگ جو آستانۂ محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ گویا وہ جنہیں دُرِّ مقصود ابھی ہاتھ نہ آیا ہو۔ یا بالفاظِ دیگر وہ جو ابھی " رہروانِ راہِ محبت" ہوں!

جس طرح ابھی کہا جا چکا ہے۔ ایک انسان کے لئے کٹھن ترین منزل یہی ہوتی ہے! اسی لئے داغؔ اس راہ پر گامزن کو کیسی اچھی دُعا دیتا ہے۔ کہتا ہے ؎

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہو!

کیوں؟ اس لئے کہ ؎

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں!

غرض یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا۔ کہ حضورؐ کی "بشریت" کا ایک پہلو تو وہ ہے۔ جب "آغازِ محبت" تھا! اور آپ ابھی" رہروِ راہِ محبت" تھے! اُس وقت تو آپ کے حصّہ میں صرف بیکلی۔ بے چینی اور بے قراری ہی تھی! لیکن جب یہ منزل خدا خدا کر کے طے ہو گئی۔ اور" دُرِّ مقصود" ہاتھ آ گیا۔ اس وقت پھر حضورؐ کی کیفیت کیا تھی؟ یعنی" فَهَدٰى" کی تفسیر کیا ہے؟ اس حالت کو ایک خاتون نے اپنے ایک مصرعہ میں ایک انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

وصالِ یار کی مسعود ساعتیں؟ مت پوچھ!

اب یہاں نہایت اہم نکات پیدا ہوتے ہیں :-

جب تک آپؐ "بشریت" کی پہلی منزل میں تھے۔ اُس وقت تو آپؐ کو علم نہیں تھا۔ کہ آپؐ :

"مِنْ نُوْرِ اللّٰه" ہیں![1]

نہ آپؐ اس کیفیت سے آگاہ تھے۔ کہ

"اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ"![2]

---

[1] حضورؐ اللہ کے نُور سے ہیں :-

[2] اللہ نے سب سے پہلے جو پیدا کیا وہ میرا نُور ہے :-

Marfat.com

اور نہ آپؐ اس حقیقت سے آشنا تھے۔ کہ

کُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُوْرِیْ[1]

لیکن جب آپؐ نے "بشریت" کی دوسری منزل میں قدم رکھا۔ اور آپؐ کو مندرجہ بالا حقائق کا علم ہوا۔ تو پھر ایک سلیم الفطرت انسان خود ہی یہ سوچ سکتا ہے۔ کہ ایسی حالت میں ایک انسان کیا کچھ نہ جاننا چاہے گا۔ اور اُس سے پھر کون سی بات چھپی رہ سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہر پیغمبر آیت الکرسی کے الفاظ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ کے ہمیشہ تحت آتا ہے۔ اور جو ہستیاں ان الفاظ کے تحت آتی ہیں۔ اُن کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ "عِلْمِہٖ" کے کچھ حصہ سے سرفراز ہوں! اب "عِلْمِہٖ" سے کیا مُراد ہے؟ اس سے دنیوی علم مُراد نہیں۔ بلکہ اس سے تمام خدائی علم مُراد ہے۔ جس میں رُوح کا علم، معرفت کا علم، لدنی علم اور غیب کا علم شامل ہیں!

جب ایک انسان ان علوم سے سرفراز ہوتا ہے۔ تو پھر وہ بشر کی صورت میں رہ کر بھی سر تا پا نُور ہی نُور ہو جاتا ہے! اور یہی حضورؐ کی کیفیت تھی! اسی لئے حضورؐ کو "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے!

اب ہم نے دیکھنا یہ ہے۔ کہ تمام انبیاءؑ کی رُوحانی ارتقا کس صورت میں ہوئی ہے؟ اور کس حد تک ہوئی ہے؟

اب میں صرف دو مثالیں دوں گا۔ تاکہ معاملہ کچھ واضح ہو سکے:

ہم سب یہ جانتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے ایک دن پُوچھا۔ کہ وہ مُردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں پرندوں والا قصہ مشہور ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عیسٰیؑ نے خود مُردہ زندہ کئے! یہاں یہ فرق ملاحظہ ہو کہ حضرت ابراہیمؑ نے مُردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ لیکن حضرت عیسٰیؑ نے خود مُردہ زندہ کئے!

اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ کہ رَبِّ اَرِنِیْ یعنی میں آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک ہی تجلی سے نہ صرف حضرت موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلکہ طور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا! لیکن اس کے مقابلہ میں جب حضورؐ کی باری آئی تو "قابَ قوسَین" تک نوبت پہنچی!

---

[1] تمام مخلوق میرے نُور سے ہی پیدا کی گئی ہے۔

اِس قسم کی رُوحانی ترقی دیکھ کر ایک عام شخص قدرتی طور پر حیران ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کے عوام اِس قسم کی ترقی کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن حضورؐ کے دہنِ مُبارک سے "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کے الفاظ کہلوا کر عام دُنیا کے لوگوں کو یہ حوصلہ دلایا گیا ہے۔ کہ وہ گھبرائیں نہیں۔ سُنّت کی پیروی کرنے سے اُن کے حجاب بھی اُٹھ سکتے ہیں۔ پھر وہ بھی اپنی باطنی آنکھوں سے نہ صرف وہ چیزیں جو اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہیں' اُن کو دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ربّ العزّت کی ذات کو بھی بلا تشبیہ اور بغیر کیفیت کے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضورؐ بھی ہماری طرح بشر ہی تھے۔ عام انسانوں کی طرح اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے۔ اور چلتے پھرتے تھے۔ گویا اُنہیں تمام تقاضے انسانوں کی طرح ہی تھے۔ لہٰذا اب دُنیا والوں کو مژدہ ہو۔ کہ وہ "نرگس" جو ہزاروں سال اپنی "بے نوری" پر روتی رہی ہے۔ اب اُس کی مشکلیں آسان کر دی گئی ہیں۔ اب جہان میں نہ صرف "دیدہ ور" پیدا ہو سکتے ہیں۔ بلکہ پیدا ہو بھی چکے ہیں۔ اور آئیندہ پیدا ہوتے بھی رہیں گے! یہ اس لئے کہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ"!

رسُولِ پاکؐ کی غیب دانی

رسُولِ پاکؐ کی غیب دانی پر بھی اکثر بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے:

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنی لازمی ہے۔ کہ (جس طرح گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے)۔ حضورؐ کی ذات "دوہری شخصیت" کی حامل ہے۔ جسے انگریزی میں "Dual Personality" کہتے ہیں: گویا ایک تو حضورؐ کی "نورِ مصطفویؐ" والی کیفیت ہے۔ اور دوسری بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ والی شخصیت!

جہاں تک کہ اوّل الذکر کیفیّت کا تعلق ہے۔ اس پر بحث تو باب اوّل میں تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔ یعنی یہ کہ "نورِ مصطفویؐ" دُنیا و مافیہا کی ہر چیز کا "خمیر" ہے۔ لہٰذا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر[1] بھی ہے۔ اور "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" بھی۔ لہٰذا اسے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں: یہاں ہمیں صرف اُس غیب دانی کے متعلق بحث کرنی ہے۔ جس کا تعلق حضورؐ کی "بشریّت" والی شخصیت سے ہے:

اِس بارہ میں ایک نہایت ضروری نکتہ جو عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس

---

[1]: "حاضر" اس لئے کہ اس دُنیا میں جہاں "حُسن" (خُدا) ہے۔ وہاں "عشق" (نُورِ مصطفویؐ) بھی موجود ہے۔ اور "ناظر" اس لئے کہ "عشق بھی "نور" ہی ہے" ("ظلمت" نہیں ہے): البتہ "عشق" کی فطرت میں چونکہ "عبدیت" ہی "عبدیت" ہے۔ لہٰذا "نُورِ مصطفویؐ"، "عبدیت" کی حیثیت میں ہی "ناظر" ہے۔ اور کسی حیثیت سے نہیں:

Marfat.com

دُنیاوی زندگی میں بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن میں اگر انسان کو ایک بات کا پتہ نہ ہو۔ تو وہی اس کا کمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر اُس کو اُس کا علم ہو جائے۔ تو کمال، کمال ہی نہیں رہتا!

مثال کے طور پر سکول میں سالانہ امتحان سے پہلے اگر ایک لڑکے کو اُس کے امتحان کا پرچہ بتا دیا جائے۔ اور پھر وہ اچھے نمبروں میں پاس ہو۔ تو اُس میں اُس کا کوئی کمال نہیں گنا جائے گا۔ البتہ کمال اُس کا گنا جائے گا۔ جس کو امتحان کے پرچہ کا بالکل علم نہ ہو۔ لیکن پھر بھی وہ اوّل نمبر پر آئے!

مثلاً اگر زید (ایک استاد) اپنے بیٹے بکر کو امتحان سے پہلے اُس کا پرچہ اُسے بتا دے۔ اور وہ سو میں سے نوّے نمبر لے۔ لیکن ایک دوسرا لڑکا عمرو جس کو اس پرچہ کا علم نہ ہو۔ وہ صرف ستر نمبر لے۔ تو اوّل نمبر عمرو کو ہی گنا جائے گا! بکر کو اُلٹا طعن کیا جائے گا۔ کہ اُسے چونکہ اُس کے باپ زید نے پہلے سے پرچہ بتا دیا تھا۔ لہذا عمرو کے مقابلہ میں اُس کی کوئی وقعت نہیں!

بالکل اسی طرح اِس دُنیا میں ہر شخص کا امتحان ہوتا ہے۔ اور پیغمبر بھی اِس امتحان سے خالی نہیں! پیغمبروں کو سب کچھ بتا دیا جاتا ہے۔ لیکن اُن کے اپنے امتحان کا پرچہ اُنہیں نہیں دکھایا جاتا۔ بلکہ اگر دکھایا بھی جائے۔ تو وہ چشم پوشی کر لیں گے۔ لہذا اُن کی کامیابی کا کمال اُن کے اِس پرچہ کے نہ جاننے میں ہی ہے! اگر اُن کو اپنے امتحان کا پرچہ پہلے سے دکھایا جاتا۔ تو پھر اُن کے اوّل نمبر پر آنے میں کمال ہی کیا تھا؟

چنانچہ رسول پاکؐ کو جب معراج کے موقع پر دُنیا و مافیہا کا علم ہُوا۔ تو آپ نے اپنا "امتحان کا پرچہ" دیکھنا پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ اُن کو اپنے "امتحان کے پرچہ" کا علم نہ ہونا ہی آپ کے کمال کی دلیل ہے!

اب یہ بات کہ حضورؐ کو اپنے "امتحان کے پرچہ" کا علم نہیں تھا۔ اس کی دو تین مثالیں دی جا سکتی ہیں:۔

(۱) جب حضورؐ کو پہلی وحی کے بعد چند ماہ وحی نہ آئی۔ تو حضورؐ کو قدرتی طور پر بیحد بیچینی لاحق ہوئی۔ کُفار نے بھی اِس سلسلہ میں طعن شروع کر دی۔ لیکن وحی کا نہ آنا "حسن" کی "اداؤں" میں سے ایک "ادا" تھی۔ اِنہی "اداؤں" سے تو "حُسن" اپنے کُشتگان کا امتحان لیتا ہے!

(۲) حضورؐ نے چاہا۔ کہ "بیت المقدس" کی بجائے "بیت اللہ" مسلمانوں کا کعبہ ہو جائے! اس خواہش کی تکمیل میں کچھ دیر لگی! حضورؐ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ لیکن حکم نہ آتا! یہ تاخیر بھی "حسن" کی "اداؤں" میں سے ایک "ادا" تھی!

(۳) "بیعتہ الرضوان" سے پہلے جب یہ خبر مشہور ہوئی۔ کہ حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے ہیں۔ تو

Marfat.com

حضورؐ نے صحابۂ کرام سے بیعت لی۔ کہ اگر لڑائی ہوئی۔ تو کوئی شخص فرار نہیں ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے تھے ؛ اب باوجود اس بات کے کہ خدا تعالیٰ کو اس امر کا علم تھا۔ کہ اس بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے اس بیعت کو سراہا ہے!

بالکل اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہت دکھائی۔ لیکن آپ کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ جب اُن کو آگ میں پھینکا جائے گا۔ تو آگ گلزار بن جائے گی ؛ اگر اُن کو اس بات کا علم ہوتا۔ تو پھر اُن کا امتحان ہی کس بات میں ہوتا؟

اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔ کہ جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کے گلہ پر چھری پھیر لیں گے۔ تو چھری کارگر نہ ہوگی ؛ اگر یہی بات اُن کو پہلے سے واضح ہو جاتی۔ تو پھر اِن کا امتحان کس بات میں ہوتا؟

بالکل اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ اُن کے گلے پر چھری کارگر نہ ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ ؛

عین اسی طرح رسول پاکؐ کو افک والے معاملہ میں حضرت عائشہ کے بارہ میں کچھ علم نہیں تھا۔ یہ اس لئے کہ قدرت نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے۔ کہ قافلہ چلا جائے۔ اور حضرت عائشہؓ پیچھے رہ جائیں۔ اور پھر ایک نوجوان اُنہیں بعد میں اکیلا اپنے اونٹ پر بٹھا کر قافلہ کے سامنے ملائے ؛ ان حالات میں اوّل اُس نوجوان کا امتحان تھا۔ پھر حضرت عائشہؓ کا امتحان تھا۔ اُس کے بعد رسول پاکؐ کا امتحان تھا۔ اور اس کے بھی بعد تمام صحابۂ کرام اور منافقین کا امتحان تھا ؛ اس امتحان میں تمام باحسن وجوہ کامیاب ہوئے۔ سوائے منافقین کے ؛ اور قدرت کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ اس قسم کے مخصوص حالات پیدا کر کے سب کا امتحان لیا جائے ؛

یہ تمام امتحانات ایک انسان کی رُوح کی کامرانی کے لئے ہوتے ہیں ؛ جب رُوح ان میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تو پھر انعام کے طور پر انسان کو تمام اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا ہے ؛ [له]

له مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے سورۂ نور کی تفسیر کرتے وقت (دیکھو تفہیم القرآن صفحہ ۸۱) "افک" کے واقعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ رسول مقبولؐ "غیب دان" نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کے الفاظ یہ ہیں :-

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۰ پر)

اسی لئے اُوپر کہا گیا ہے۔ کہ حضورؐ کو دُنیا ومافیہا کا تمام علم تھا۔ سوائے اپنے امتحان کے پرچہ کا۔ اُور اِس علم کا نہ ہونا ہی کمالِ انسانی ہے!

گویا یہاں جو نکتہ سمجھانا مقصود تھا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہر شخص کی رُوح شروع میں حجابات میں ہوتی ہے: انسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ کا)

"تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی۔ کہ نبی صلعم غیب دان نہیں ہیں۔ جو کچھ اللہ بتاتا ہے۔ وہی کچھ جانتے ہیں:

اِس کے ماسوا آپ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے۔ کبھی خادمہ سے پوچھتے۔ کبھی ازدواج مطہرات سے۔ کبھی حضرت علیؓ سے اُور کبھی حضرت اسامہؓ سے: آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ توبہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے۔ تو توبہ کرو۔ اُور نہیں کیا۔ تو اُمید ہے۔ اللہ تمہاری بے گناہی ثابت کر دے گا: اگر آپ غیب دان ہوتے۔ تو یہ پریشانی اُور یہ پُوچھ گچھ اُور یہ تلقینِ توبہ کیوں ہوتی؟ البتہ جب وحی خداوندی نے حقیقت بتا دی۔ تو آپؐ کو وہ علم حاصل ہو گیا۔ جو مہینہ بھر تک حاصل نہ تھا: اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجربہ اُور مشاہدہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اُس غلو اُور مبالغے سے بچانے کا انتظام فرما دیا۔ جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملہ میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے: بعید نہیں۔ کہ مہینہ بھر تک وحی نہ بھیجنے میں اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو: اوّل روز ہی وحی آجاتی۔ تو یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکتا:"

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے۔ کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اِس نکتہ پر غور نہیں کیا۔ کہ اِس دُنیا میں ہر شخص کا امتحان ہوتا ہے: اُور جب کسی کا امتحان ہوتا ہے۔ تو امتحان سے پہلے اُس کا پرچہ اُسے ہرگز نہیں دکھایا جاتا! بالکل اِسی طرح رسولوں کا بھی امتحان ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اِسی لئے رسولِ پاکؐ کو بھی "افک" والے معاملہ میں حضرت عائشہؓ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ کیونکہ اگر اُن کو اِس بات کا علم ہوتا۔ تو پھر اُن کا امتحان کس بات میں ہوتا؟ لیکن اِس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ اگر پیغمبروں کو وقتی طور پر اُن کے اپنے "امتحان کے پرچہ" کا علم نہ ہو۔ تو باقی باتیں بھی اُن سے چھپی رہتی ہیں! مندرجہ ذیل مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی:

یہ ایک عام دستور ہے۔ کہ گورنمنٹ کے ہر مستقل ملازم کی بابت اُس کے اعلیٰ افسر ایک سالانہ خفیہ رپورٹ لکھتے ہیں۔ کہ اُس نے گذشتہ سال کام کیسا کیا؟ چنانچہ پنشن سے پہلے جب میں ملازمت میں تھا۔ تو میری اپنی سالانہ خفیہ رپورٹ تو میرے پاس موجود نہ ہوتی تھی۔ لیکن افسر انتظامیہ ہونے کی حیثیت سے باقی تمام عملہ کی خفیہ رپورٹیں میرے پاس موجود ہوتی تھیں۔ لہٰذا ہر شخص کے حالات کے بارہ میں مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی!

یہی صورت تمام پیغمبروں کی بھی ہے۔ یعنی اگر اُن کو اپنے ذاتی معاملات کا تو کچھ علم نہ ہو۔ لیکن دُنیا جہان کی باتوں کا اُنہیں علم ہو۔ تو اِس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں!

Marfat.com

کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ وہ اپنے ایمان وعمل سے اِن حجابات کو اُٹھنے کا موقع دے۔ یہاں تک کہ وہ "خدا کی معرفت" حاصل کر لے!

اب ہمیں جس بات سے اُلجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ایک انسان کو غیب کا علم کس طرح ہو سکتا ہے؟
اس سلسلہ میں جس نکتہ پر عام طور پر غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ غیب کا علم دراصل انسان کے دماغ یا قلب کے گوشت کے لوتھڑے کو نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی "روح" کو ہوتا ہے۔ اور انسان کی "روح" نہ صرف "مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ"[1] ہے۔ بلکہ "مِنْ رُّوْحِہٖ"[2] ہے!!!
اب "مِنْ رُّوْحِہٖ" کی متعلق گمان کرنا۔ کہ جب اس سے حجاب اُٹھ جائیں۔ تو پھر بھی وہ "محجوب" ہی رہتی ہے۔ کس قدر مضحکہ انگیز اور بے معنی سی بات ہے؟
اسی لئے رسولِ مقبول صلعم کے جتنے حجاب اُٹھے۔ وہ آج تک نہ کسی کے اُٹھے ہیں۔ اور نہ قیامت تک کسی کے اُٹھ سکیں گے:۔ اسی وجہ سے جتنا غیب کا علم حضورؐ کو تھا۔ یا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا!
غرض حضورؐ کی "نور" والی کیفیت اور "بشر" والی شخصیت میں فرق یہ ہُوا۔ کہ:۔

(۱) حضورؐ کا "نور" جو صرف عشق ہی عشق ہے۔ اور کائنات کے ذرہ ذرہ کا "خمیر" ہے۔ وہ تو ہر وقت تسبیح میں مشغول ہے۔ تاکہ جب اس دنیا میں خدائی "نور کا اتمام" ہو۔ گویا "حسن" آشکار ہو۔ تو کائنات کا ذرہ ذرہ "حسن" کی تاب لا سکے۔ اور وہ طور پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ اور

(۲) حضورؐ کی "بشر" والی شخصیت اس دنیا میں روح اور جسم کی صورت میں نمودار ہوئی:۔ ہوش سنبھالنے پر حضورؐ نے اپنے ایمان وعمل سے تمام حجابات دُور کئے۔ اور اس قدر دُور کئے۔ کہ "قَابَ قَوْسَیْنِ" تک نوبت پہنچی! لہذا اس وقت حضورؐ کی ذات انسانوں کی روحوں سے (اُن کے اپنے ایمان وعمل کے مطابق) حجاب اُٹھانے میں مشغول ہے۔ تاکہ خدائی نور کے "اتمام" کے وقت دنیا کے لوگ حضرت "موسیٰؑ" کی طرح بیہوش ہو کر نہ گر پڑیں:۔

---

[1] اللہ کے حکم سے

[2] سورۃ ۳۲ السجدہ۔ آیت ۹:۔ اپنی طرف کی روح

Marfat.com

اِس سے ثابت ہُوا۔ کہ "نُورِ مصطفوی" کی صورت میں چونکہ حضورؐ خود دُنیا و مافیہا کا "خمیر" ہیں۔ لہذا حضورؐ کا ذرّہ ذرّہ میں موجود ہونا یا حاضر و ناظر ہونا ایک بدیہی امر ہے! اور بشریّت کی صورت میں واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر اللہؐ "ربّ العٰلمین" صرف اُسی صورت میں کہلا سکتا ہے۔ جب کہ وہ دُنیا و مافیہا کے ذرّہ ذرّہ کا "ربّ" ہو۔ تو حضورؐ "رحمۃ للعلمین" بھی صرف اُسی صورت میں کہلا سکتے ہیں۔ جب کہ وہ تمام کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر ہر وقت اور ہر آن اپنی رحمت کو نچھاور کر سکیں!

اَب کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ جنؐ کے "نُور" کے خمیر سے تمام کائنات معرضِ وجود میں آئے۔ اور وہ ذاتؐ جو "رحمۃ للعلمین" بھی ہو۔ اُسی ذات کو پتہ ہی کچھ نہ ہو!

اندریں حالات جس کسی کو حضورؐ کی غیب دانی میں شک ہے۔ وہ محض اُس کی اپنی بے علمی کی دلیل ہے!

مولانا ابوالاعلیٰ مودُودی صاحب کی بہترین تحریر جو میری نظر سے گزری

صاحب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریرات میں سے سب سے بہتر تحریر جو میری نظر سے گزری ہے۔ وہ یہ ہے:-

(از تفہیم القرآن۔ صفحہ ۱۳۱) : "یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی ہے۔ جو اللہ کے نُورِ مطلق کے اِدراک کرنے اور اُس کے فیض سے بہرہ مند ہونے کے لئے درکار ہیں: .... اور نعمتِ حق دینے کے معاملہ میں جو کچھ اللہ دیکھتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آدمی کے دل میں اُس کی محبّت، اور اُس سے دلچسپی، اور اُس کا خوف، اور اُس کے غضب سے بچنے کی خواہش، موجود ہے .... یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کہ آدمی کو اللہ کے نُور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب اللہ دینے پر آتا ہے۔ تو اتنا دیتا ہے۔ کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ اُس کی دین کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں ہے:"

اِس کے برعکس جب ایک انسان مولانا کی اُس تحریر کو پڑھتا ہے۔ جو کہ صفحات ۱۰۵-۱۰۶[1] پر درج کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا کے نزدیک "رُوحانی لحاظ سے" ایک انسان تمام عمر زیادہ سے زیادہ "عطّار" کی حیثیت سے ہی رہ سکتا ہے۔ "طبیب" بننا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں۔ تو مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر ایک انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کہ مولانا "اللہ کے نُورِ مطلق کے اِدراک کرنے اور اُس کے فیض سے بہرہ مند ہونے" سے کیا مُراد لیتے ہیں؟

سوال صرف یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی زندگی کا مقصدِ واحد "معرفتِ الٰہی" ہے۔ (اور ایک "عارف" کی تصویر مولانا کے الفاظ میں یہ ہے۔ کہ نہ اُس میں کوئی غیر معمولی طاقت ہوتی ہے۔ نہ غیب و شہادت اُس پر روشن ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھو صفحات ۱۰۵-۱۰۶:

Marfat.com

نہ نفع وضرر پر اُس کو اقتدار ہوتا ہے۔ نہ کائنات کی کوئی قوت اُس کے تابع ہوتی ہے۔ اَور نہ وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت وضلالت کو دُور کر سکتا ہے ! ۔ تو پھر ایسے انسان کی خدا کے " فیض سے بہرہ مندی " کس امر میں تصور کی جاسکتی ہے ؟

" معرفت " کے عام معنی یہ ہیں ۔ کہ ایک انسان کسی شے کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو :: مثلاً اگر ایک شخص یہ جانتا ہے ۔ کہ پانی دراصل آکسیجن اَور ہائیڈروجن دو گیسوں کے ملنے سے بنا ہُوا ہے ۔ اَور ان گیسوں کا تناسب ۲:۱ ہے :: صرف اتنا ہی نہیں ۔ بلکہ وہ پانی کو پھاڑ کر نہ صرف دونو گیسوں کو علیحدہ کر سکتا ہے ۔ اَور ان دونو کو علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھ سکتا ہے ۔ بلکہ ان دونو گیسوں کو ۱:۲ کے تناسب میں ملاکر دوبارہ پانی بنا سکتا ہے ۔ تو اُس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے ۔ کہ اُسے پانی کی " معرفت " حاصل ہے !

لیکن اگر کوئی شخص صرف یہ جانتا ہو کہ پانی پیاس بجھانے اَور نہانے کے کام آتا ہے ۔ اَور یہ طشتریوں میں سے ہے ۔ تو اُس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ۔ کہ اُسے پانی کی " معرفت " حاصل ہے ::

آج کل کی سائنس کیا ہے ؟ اِس نے " مادہ " کی " معرفت " حاصل کی ہوئی ہے ۔ اَور اِس کا نتیجہ یہ ہے ۔ کہ ریل دَوڑ رہی ہے ۔ موٹر بھاگ رہی ہے ۔ ہوائی جہاز اُڑ رہا ہے ۔ لاسلکی کے ذریعہ پیغام رسانی ہو رہی ہے ۔ منٹوں اَور سیکنڈوں میں دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر خبر پہنچ رہی ہے ۔ یہاں تک کہ اس وقت فضا کے بھیدوں کو جاننے کی بھی کوشش کی جارہی ہے !

بالکل اسی طرح جب ایک انسان خدا کی " معرفت " حاصل کر لیتا ہے تو پھر اُس کی ظاہری آنکھوں کے علاوہ باطن کی آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں :: ظاہری آنکھوں سے وہ زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے ۔ اَور باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں ۔ اُن کو دیکھتا ہے :: پھر اُس کے قلب سے حجاب اُٹھا دیئے جاتے ہیں ۔ تو وہ اللہ کی ذات کو بلا تشبیہ اَور بغیر کیفیت کے مشاہدہ کرتا ہے :: جن ، انسان اَور فرشتے غرض سب طرح کی مخلوق اُس کی خدمت کے واسطے کمربستہ رہتی ہے :: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُس کے کان آنکھ ہاتھ اَور پاؤں ہو جاتا ہے جس سے وہ سُنتا ، دیکھتا ، پکڑتا اَور چلتا ہے ! ایسا انسان پھر اللہ کا " نائب " یا " خلیفہ " کہلاتا ہے ۔ اِس سے کم درجہ کے انسان کو نہ اللہ کا " نائب " یا " خلیفہ " کہا جا سکتا ہے ۔ اَور نہ " عارف " !

لہٰذا مولانا کے " عطار " والے نظریئے کو اگر سامنے رکھا جائے ۔ تو پھر اُن کا خدا کے " فیض سے بہرہ مند ہونے والا فلسفہ صرف دُنیاوی نعمتوں کی حد تک ہی سودمند سمجھا جاسکتا ہے ۔ اَور اُن کے الفاظ :-

" جب اللہ دینے پر آتا ہے ۔ تو اتنا دیتا ہے ۔ کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو ۔ تو دوسری بات ہے ۔

Marfat.com

ورنہ اُس کی دین کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں ہے"

کے زیادہ سے زیادہ معنی جو لئے جا سکتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ ایک انسان خدا کی تمام صفات کو جو قرآن میں بتائی گئی ہیں۔ اُن کو صحیح طور پر سمجھے اَور خدا کی یاد سے وہ نہایت اطمینان والی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ پھر اُسے صالح اولاد دے۔ بے حد عزت اَور دولت دے۔ چوبیس گھنٹے اُس کے ہاں مسکینوں وغیرہ کے لئے لنگر جاری ہو۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ایک اسلامی سلطنت کا صدر بھی ہو۔ لیکن اِس قسم کے انسان کو "متقی" تو کہا جا سکتا ہے لیکن "عرفان" کی اُس کو ہوا تک نہیں لگی! کیونکہ "عارف" صرف اُسے ہی کہا جا سکتا ہے۔ جو اپنی باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں۔ نہ صرف خود دیکھ سکے۔ بلکہ دوسروں کو بھی دکھلا سکے اِسی لئے عارفین کی صحبت کی جب تلقین کی جاتی ہے۔ تو اِس تلقین کی ترغیب ہمیشہ ان الفاظ میں دی جاتی ہے ؂

چشمِ روشن کُن زخاکِ اولیاء۔ تا بہ بینی زابتدا تا انتہا !

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ایک دوسری عُمدہ تحریر

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ایک دوسری تحریر جو مجھے پسند آئی ہے۔ وہ یہ ہے ؂

(اقتباس از تفہیم القرآن۔ سورۂ نور۔ صفحہ ۱۲۹) "جسے اللہ نُور نہ بخشے۔ اُس کے لئے پھر کوئی نُور نہیں"؛ (۲۴ : ۴۰) ؛ یہاں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے۔ جن میں نمائشی نیکیاں والے بھی شامل ہیں ؛ اِن سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی قطعی اَور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ خواہ وہ دُنیا کی اصطلاح میں علامۂ دہر اَور علوم و فنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اُن کی مثال اُس شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو۔ جہاں مکمل تاریکی ہو۔ روشنی کی ایک کرن اُس تک نہ پہنچ سکتی ہو ؛ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اٹیم بم اَور ہائیڈروجن بم اَور ماہ رس ڈھنگے (rockets) بنا لینے کا نام علم ہے۔ اُن کے نزدیک معاشیات اَور مالیات اَور قانون اَور فلسفہ میں مہارت کا نام علم ہے۔ مگر حقیقی علم ایک اَور چیز ہے۔ اَور اُس کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اِس علم کے لحاظ سے وہ جاہلِ محض ہیں ؛ اَور ایک اَن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے۔ اگر وہ

Marfat.com

معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو"!

اب یہ اقتباس پڑھ کر بھی ایک انسان حیران رہ جاتا ہے ؛ مان لیا۔ کہ :-

(۱) "حقیقی علم ایک اور چیز ہے" !

(۲) موجودہ سائینسدانوں کو "حقیقی علم" کی ہوا تک نہیں لگی!

(۳) اس علم کے لحاظ سے وہ "جاہل محض" ہیں! اور

(۴) "ایک اَن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے۔ اگر وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو"!

لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو "معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔ اُس میں "اِتقا" کے سوا اور کون سی خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اُس کی تصویر وہی ہے۔ جو کہ مولانا کی تحریر (مندرجہ صفحات ۱۰۵-۱۰۶) میں کھینچی گئی ہے؟ (یعنی ایک انسان "عطار" کا "عطار" ہی رہتا ہے۔ اِس سے ایک قدم آگے جانے کی اُس میں اہلیت ہی نہیں!)

اس تضاد کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ہم "معرفت" کے لفظ کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے!

ایک "عارف" کی تصویر "براہیمؑ و موسیٰؑ" اور "سلیمانؑ و عیسیٰؑ" سے ملتی جلتی ہے ؛ ایسے انسان کو صاحبِ کشف بھی ہونا چاہیئے۔ اور صاحبِ کرامت بھی۔ اس سے کم درجہ کا انسان "عارف" کہلا ہی نہیں سکتا!

اسلام میں "مُلّا اور" مولوی"

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو "خلافتِ راشدہ" کے بعد، یعنی "ملوکیت" کے قائم ہونے پر اسلام کی صحیح ترین خدمت صرف اُن لوگوں نے کی ہے۔ جن کو آج کل "مُلّا" یا "مولوی" کے حقارت آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ "خلافتِ راشدہ" کے بعد زیادہ تر لوگ یا تو حکومت کی کرسیوں کو سنبھالنے کے پیچھے لگ گئے۔ اور یا زمینداری، صنعت و حرفت اور تجارت میں مشغول ہو کر روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر میں رہے ؛ صرف یہ "ملّا" اور مولویوں" کی ہستیاں ہی ہیں۔ جنہوں نے تمام طاغوتی طاقتوں سے ہمیشہ ٹکر لی ؛ اور جہاں تک اپنی معاشرتی حالت کا تعلق ہے۔ ان لوگوں نے نسلاً بعد نسل صرف رُوکھی سُوکھی روٹی پر گزارہ کیا۔ تن پر کپڑے کی پرواہ نہ کی۔ یہاں تک کہ رنگ زرد ہو گیا۔ منہ کے گال پچک کر رہ گئے اور کمر کُبڑی ہو گئی! اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج چودہ سَو سال کے بعد بھی قرآن و حدیث کے تمام الفاظ کسی زیر یا زبر کے بدلنے کے بغیر اس وقت تک جُوں کے تُوں موجود ہیں ؛ یہ وہ کارنامہ ہے۔ جس کی تعریف کے لئے ایک انسان کے پاس موزوں الفاظ ہی نہیں ہیں ؛ لہٰذا ان حضرات کو اسلام کی خدمت کی جزا خدائے حیّ و قیوم ہی دے سکتا ہے!

Marfat.com

ثقافت یا کلچر :۔ آج کل ثقافت یا کلچر کے بارہ میں بھی اکثر بحث رہتی ہے :۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اس کی ثقافت کا راز صرف ایک لفظ میں مضمر ہے۔ اور وہ لفظ "سُنّت" ہے!

مثال کے طور پر اپنے روزمرہ کے رہن سہن کے طریقہ کو لے لیجئے :۔ سُنّت یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص اپنے گھر یا مسجد میں داخل ہو۔ تو وہ پہلے اپنا دایاں پاؤں اندر رکھے۔ اور جب ان سے باہر نکلے۔ تو پہلے بایاں پاؤں نکالے۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

سُنّت یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص بیت الخلا میں داخل ہو۔ تو پہلے اپنا بایاں پاؤں اُس میں رکھے۔ اور جب باہر آئے۔ تو پہلے دایاں پاؤں باہر نکالے :۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

سُنّت یہ ہے۔ کہ ایک شخص منہ پر ڈاڑھی رکھے سر پر انگریزی قسم کے بال نہ ہوں :۔ لباس میں گھٹنے ننگے نہ ہوں :۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

سُنّت یہ ہے۔ کہ سوار چلنے کو سلام کرے۔ چلتا کھڑے کو سلام کرے۔ اور کھڑا بیٹھے کو سلام کرے۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

سُنّت یہ ہے۔ کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں :۔ کھانا فرش پر بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔ اور بیٹھتے وقت دایاں گھٹنہ کھڑا ہو۔ اور بائیں گھٹنے پر بیٹھا جائے :۔ پانی پیتے وقت دو دفعہ سانس لیا جائے۔ گویا پانی کو تین مرتبہ میں پیا جائے :۔ کھانے کے بعد تین دفعہ کُلی کی جائے :۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

حکم یہ ہے۔ کہ جب کسی آدمی کو کوئی غیر محرم عورت نظر آئے۔ تو وہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کرے۔ یا کسی عورت کو کوئی غیر محرم مرد نظر آئے۔ تو وہ بھی فوراً اپنی نظریں نیچی کرے :۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے!

حکم یہ ہے۔ کہ ایک انسان جھوٹ نہ بولے۔ غیبت نہ کرے۔ کینہ نہ رکھے۔ ظلم نہ کرے۔ گویا کسی اخلاقی گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ بلکہ پاکدامن رہے۔ خلقِ خدا کی بے لوث خدمت کرے۔ وغیرہ۔ وغیرہ :۔ یہی اعمالِ اسلام کی ثقافت یا کلچر کی بنیاد ہیں!

حکم یہ ہے۔ کہ ایک انسان خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔ سب رسولوں اور الہامی کتابوں کو مانے۔ دن میں پانچ وقت نماز پڑھے۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھے۔ صاحبِ نصاب ہو۔ تو زکوٰۃ دے۔ اور مقدور رہو۔ تو عمر بھر میں ایک دفعہ خانہ کعبہ کا حج کرے :۔ یہ سب اعمال بھی اسلام کی ثقافت یا کلچر میں لازمی طور پر شامل ہیں!

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے پہلا قدم یہ ہے۔ کہ ایک انسان مندرجہ بالا احکام پر عمل کرنے کے

Marfat.com

علاوہ خدا کی یاد میں ہر دم مشغول رہے ۔یعنی دل میں اللہ اللہ کہتا رہے ۔یہاں تک کہ نہ زبان ہلے اور نہ لبوں کو حرکت دی جائے ؛ اس قسم کا رویہ اسلام کی ثقافت یا کلچر کی جان ہے !

مندرجہ بالا امور کے علاوہ "جو رنگ" صحابۂ کرام یا اولیائے کرام کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے ۔ وہ بھی سُنت کے تحت آجاتا ہے ۔ یہ اس لئے کہ ایک انسان "ولی" ہو ہی نہیں سکتا ۔ جب تک کہ اُس کے "اعمال" خدا کی رضا کے تحت نہ ہوں ؛ اسی لئے اولیائے کرام کے تمام "رنگ" قابلِ اتباع ہیں ؛ لہٰذا یہ سب "رنگ" بھی اسلام کی ثقافت یا کلچر میں شامل ہیں !

اِن کے علاوہ جتنے بھی "رنگ" ہیں ۔ وہ "رنگ رلیاں" ہیں ۔ وہ اسلام کی ثقافت یا کلچر کے تحت نہیں آتے ؛

اِسلامی معیشت

آج کل اسلامی معیشت کے بارے میں بہت بحث و تمحیص ہو رہی ہے ۔لیکن چند ایک بُنیادی باتوں کو نظرانداز کیا جا رہا ہے ؛

قرآن جب نازل ہوا ۔تو اسلامی معیشت کی کیفیت یہ تھی ۔کہ اُس زمانہ میں چونکہ موجودہ مشین کا نام و نشان بھی نہ تھا ۔ لہٰذا سب لوگ اپنے ہاتھ سے کام کرکے اپنی روزی کماتے تھے ؛ اُس وقت یہ تو ہو سکتا تھا ۔کہ ایک شخص روزانہ اگر دس گز کپڑا بُنے ۔تو دوسرا پندرہ بیس گز بُن لے ۔لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا ۔کہ ایک انسان تو روز دس پندرہ گز کپڑا بُنے ۔لیکن دوسرا ایک ہزار گز کپڑا بُن لے !

موجودہ زمانہ میں اگر ایک طرف چند انسان کروڑ پتی ہیں ۔اور باقی سب لُقمہ لُقمہ کو ترس رہے ہیں ۔تو اس کی حقیقی وجہ مشین کی موجودگی ہے ؛ مشینی نظام کا ایک لازمی اقتضا یہ ہے ۔کہ مِل کا مالک تو ہزاروں روپے روز کمائے ۔لیکن مشین کے کارندے پانچ دس روپے روز سے زیادہ نہ کما سکیں ؛

اِس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے سب سے پہلا قدم جو اُٹھانے کی ضرورت ہے ۔ وہ یہ ہے ۔کہ اگر مِل کے مالک کو لٹھے کا کپڑا مثال کے طور پر ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے ۔تو وہ اُسے ۷۵ پیسے فی گز کے حساب سے مِل کے باہر نکالے ۔تاکہ عوام کو وہ کپڑا ۸۰ یا ۸۵ پیسے فی گز کے حساب سے مل سکے ؛

اس وقت صورت یہ ہے ۔کہ جو لٹھا مِل کے مالک کو ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے ۔ وہ اُسے دو روپے فی گز

کے حساب مٹھوک فروشوں کو دیتا ہے ؛ مٹھوک فروش اُسے سوا دو روپے فی گز کے حساب سے دوکانداروں کو دیتے ہیں۔ اور دکاندار اُسے ڈھائی روپے فی گز کے حساب سے عوام کو بیچتے ہیں! اس طرح مِل کا مالک تو کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ لیکن مِل کے کارندے دو تین سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کما سکتے۔ اور عوام کو جو کپڑا ملتا ہے۔ وہ بھی بہت مہنگا ملتا ہے ؛

اس وقت ملک میں جو بےچینی ہے۔ اُس کی تہ میں صرف یہی بات ہے لیکن بجائے اِس کے کہ موجودہ بےچینی کا علاج اسلامی اصولوں پر کیا جائے۔ ہم میں سے بعض کی نظریں رُوس و چین کی طرف اٹھتی ہیں۔ اور اِس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ اُن کے نظام میں چند ایک ایسی باتیں ہیں۔ جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا ؛ ان کی تفصیل آگے آئے گی ؛

اب یہ دیکھنے کے لئے کہ دراصل پانی کہاں مرتا ہے؟ اور اُس کا مداوا کیا ہے؟ اوپر والی تجویز کا تھوڑا سا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے ؛

فرض کر لیجیئے۔ کہ مِل کے مالک کو لٹھا ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے ؛ یہ بھی فرض کر لیجیئے۔ کہ مِل میں ایک ہزار گز کپڑا فی یوم تیار ہوتا ہے۔ اِسکا مطلب یہ ہوا۔ کہ مِل کے مالک کو وہ کپڑا ۵۰۰ روپے میں پڑا ؛ اگر مِل کا مالک اُسے ۷۵ پیسے فی گز کے حساب سے دوکانداروں کو دے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ مِل کے مالک کو ایک ہزار گز کپڑے کا ۲۵ پیسے فی گز منافع کے حساب سے دو سو پچاس (۲۵۰) روپے روز نفع ہو گا۔ گویا سات ہزار پانچ سو (۷۵۰۰) روپے ماہوار ؛

اس میں سے نصف رقم یعنی تین ہزار سات سو پچاس (۳۷۵۰) روپے ماہوار مِل کا مالک اپنی مشینوں وغیرہ کی قیمت سمجھ لے ؛ گویا اگر مشینوں وغیرہ کی قیمت مثال کے طور پر پانچ لاکھ روپے ہے۔ تو تقریباً گیارہ سال میں یہ قیمت اُس کو وصول ہو جائے گی ؛

مِل کے مالک کو جو تین ہزار سات سو پچاس (۳۷۵۰) روپے ماہوار بچیں۔ اُن میں سے نصف رقم یعنی ایک ہزار آٹھ سو پچھتر (۱۸۷۵) روپے وہ اپنی محنت کی اُجرت سمجھ لے۔ اور باقی ایک ہزار آٹھ سو پچھتر (۱۸۷۵) روپے وہ مندرجہ ذیل قسم کے امور پر خرچ کرے :۔

(۱) مِل کے کارندوں کو گیہوں بازار سے سستے داموں میں ملے ؛

(۲) " " " " کپڑا بھی " " " " " ؛

(۳) " " " " طبی امداد مُفت ملے ؛

(۴) " " " کے بچوں کو تعلیم مُفت ملے ؛

(۵) " " " کو گھر مُفت مُہیا ہوں ؛ وغیرہ۔ وغیرہ ؛

Marfat.com

اُوپر جو اعداد و شمار دئے گئے ہیں۔ وہ محض فرضی ہیں۔ ان کو حقائق کے مُطابق ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے :

اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے۔ کہ حکومت دیانتدار کوسٹ اکاؤنٹنٹس (Cost Accountants) مقرر کرے۔ جو ہر کارخانے کی مصنوعات کے بارہ میں اُن کی اصل قیمت معلوم کریں: تاکہ اُن کی معلومات کے مُطابق ہر چیز کی قیمت مقرر ہو: قیمت مقرر کرتے وقت مندرجہ ذیل قسم کی باتوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے :-

کپڑے کی صورت میں ؛

(۱) رُوئی کی قیمت

(۲) کارندوں کی مزدوری

(۳) انتظامیہ کی تنخواہ

(۴) ٹیکس جو کہ مِل کے مالکوں کو حکومت کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ :

گویا مندرجہ بالا قسم کے اُمور کو مدّ نظر رکھ کر اگر ایک گز کپڑے کی لاگت پچّاس پیسے فی گز آئے۔ تو اُس پر پچیس ۲۵ پیسے فی گز منافع لگا کر وہی عمل کیا جائے۔ جس کا ذکر اُوپر تفصیل سے کیا گیا ہے :

اس تجویز سے نہ صرف مِل کے مالک کو معقول منافع ملے گا۔ اور مِل کے کارندوں کو بھی خاطر خواہ اُجرت اور دوسری آسانیاں بہم پہنچیں گی۔ بلکہ عوام کو بھی چیزیں نہایت معقول داموں میں ملیں گے !

اس وقت ملک میں جو "سوشلزم" کا شور سُنائی دیتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر غیر اسلامی ہے : کہا یہ جاتا ہے۔ کہ چونکہ سب چیزوں کا مالک دراصل خدا ہے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲ : ۲۵۵)۔ لہٰذا کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک سمجھے۔ اس لئے ملکیت صرف حکومت کی ہونی چاہیئے۔ افراد کی نہیں !

اس سلسلہ میں جو نکات سمجھے نہیں گئے وہ یہ ہیں :-

(۱) قرآن جب متقیوں کی تعریف کرتا ہے۔ تو اور باتوں کے علاوہ اُن کے بارہ میں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[1] کے الفاظ استعمال کرتا ہے : ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عوام الناس اپنی جائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت کے مالک ہو سکتے ہیں : اسی بنا پر تو اُن سے کہا گیا ہے۔ کہ وہ "متقی" کہلانے کے تب ہی حقدار ہوں گے۔ جب وہ اللہ کے دئے ہوئے رزق میں سے خرچ کریں گے۔ چونکہ اگر وہ اس طرح خرچ نہیں کریں گے۔ تو وہ "متقی" نہیں کہلا سکتے۔ بلکہ بخیل کہلائیں گے : یہاں

---

[1] گویا اللہ تعالیٰ نے جو ان کو رزق دیا ہے۔ اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں (۲ : ۲)

Marfat.com

سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ عوام الناس اپنی جائز کمائی ہوئی دولت کے مالک ضرور ہونے چاہئیں۔ ورنہ وہ خرچ کرنے کے اہل ہی نہیں ہو سکتے ؛

(۲) پھر قرآن میں ارشاد ہوتا ہے وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ (۳ : ۱۸۰) ؛ (یعنی جو لوگ بخل کرتے ہیں۔ اُس چیز میں جو اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے دی۔ ہرگز اُسے اچھا نہ سمجھیں۔ بلکہ وہ اُن کے لئے بُرا ہے عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا۔ قیامت کے دن اُن کے گلے کا طوق ہوگا) ؛

اِن الفاظ میں دولت کو جمع کرنے اور اُس کو فی سبیل اللہ خرچ نہ کرنے کے بارہ میں تنبیہہ کی گئی ہے ؛ یہ تنبیہہ بھی ثابت کرتی ہے۔ کہ ایک انسان کو اپنی جائز کمائی کا مالک ہونا چاہیئے۔ ورنہ تنبیہہ بے معنی ہو جاتی ہے !

(۳) آخر میں حکم یہ ہے۔ کہ اٰمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ (۵۷ : ۷) ؛ [یعنی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اُس مال میں سے جس کا اُس نے تم کو جانشین (امین) بنایا ہے۔ اُس کی راہ میں خرچ کرو] ؛ اِن الفاظ سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہر شخص جو حلال طور پر اپنی روزی کماتا ہے۔ وہ اپنی دولت کا امین ہے ؛ یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ایک انسان اپنی دولت کا مالک نہ ہو !

اِس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہر شخص کو اِس بات کی کھلی اجازت ہے۔ کہ جو حلال پیشہ وہ چاہے اختیار کرے ؛ لوگوں کو کسی خاص پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔ یا کسی خاص پیشہ اختیار کرنے سے منع کرنا اور اُس میں رکاوٹیں ڈالنا یہ سب غیر اسلامی طریقے ہیں ؛ بالفاظ دیگر اسلام نے جن باتوں سے روکا ہے۔ وہ صرف یہ ہیں۔ کہ کسی حرام یا ناجائز طریقہ سے روزی نہ کمائی جائے۔ اور حلال اور جائز طریقہ سے روزی کما کر مال کے خرچ کرنے میں بخل نہ کیا جائے۔ اُسے جمع نہ کیا جائے۔ اور اُس میں کسی قسم کی خیانت نہ کی جائے ؛

اب بجائے اس کے کہ ہم ان بُری عادتوں کے سدباب کے طریقے سوچتے۔ ہم میں سے بعض رُوس اور چین کی پیروی کے شوق میں اس نتیجے پر کُود پڑے ہیں کہ کسی فرد کو کسی چیز کی ملکیت کا حق ہی نہیں پہنچتا ! قرآن کی مندرجہ بالا آیات اِس بات کی شاہد ہیں۔ کہ جو لوگ اِس قسم کے غلط نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اُنہوں نے قرآن پاک کی آیات پر غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی !

Marfat.com

مثال کے طور پر اس مسئلہ کو اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے اب زکوٰۃ کے مسئلہ کو لیں ؛ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے ۔ کہ نقدی کی صورت میں ایک شخص کے پاس کم ازکم نہ صرف سو روپے ہوں ۔ بلکہ اُس کے پاس یہ رقم ایک سال کے لئے جُوں کی تُوں قائم بھی رہے ۔ اور جب یہ مدت گزر جائے ۔ تو پھر اُس میں سے اُسے ڈھائی روپے زکوٰۃ ادا کرنی فرض ہے ؛ گویا بالفاظِ دیگر اگر کسی میونسپل کمیٹی کو یہ محسوس ہو کہ اُس کے اپنے شہر کی بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کے لئے پانچ ہزار روپے سالانہ کی ضرورت ہے ۔ اور وہ یہ چاہے ۔ کہ اُس شہر کے اُمرا میں سے کم ازکم پچاس متمول شخص اُس کو زکوٰۃ کی مد میں ایک سو روپے فی کس سالانہ دیں ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا ۔ کہ اُس شہر کے پچاس اُمراء نہ صرف چار چار ہزار روپے کا مالک ہونا چاہئے ۔ بلکہ اُن کے پاس سال بھر کے لئے اتنی رقم فالتو ہونی چاہیئے ؛

ان حالات میں کیا یہ بات تصور میں بھی آسکتی ہے ۔ کہ اسلام نجی جائداد کا اصولی طور پر قلع وقمع کرنے کا حامی ہے ؟

یہی حالت حج کے مسئلہ کی ہے ؛ جب تک ایک شخص کے پاس حج کے سفر کے لئے معقول رقم نہ ہو۔ وہ یہ فریضہ ادا نہیں کر سکتا ؛ ایسی صورت میں کیا کسی کی عقل یہ گوارا کر سکتی ہے ۔ کہ عوام الناس سے اصولی طور پر نجی جائداد کو ہی ضبط کر لیا جائے ؟

البتہ یہاں یہ بات خارج از بحث نہیں ہوگی ۔ کہ جہاں تک کسی ملک کے سمندروں ۔ دریاؤں ۔ پہاڑوں یا معدنیات وغیرہ کا تعلق ہے ۔ ان کی ملکیت حکومت کی ہی ہوگی ؛ یہ چیزیں کسی واحد شخص کی ملکیت نہیں ہوسکتیں ۔ ان پر حکومت کا ہی پورا تصرف ہوگا ؛

اس سلسلہ میں اسلامی مساوات پر کچھ کہنا بھی لازمی ہے ؛ اسلامی مساوات کا مطلب یہ نہیں ہے ۔ کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور یا ایک حکیم اور عطار کی خدمت کی اُجرت یکساں ہو !

اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے ۔ کہ ایک شخص اپنے ملازم کو کھانے کے لئے وہی دے ۔ جو وہ خود کھاتا ہے ۔ اور پہننے کے لئے اُسی قسم کا کپڑا دے ۔ جس قسم کا وہ خود پہنتا ہے ؛ یہاں تک کہ ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے ۔ کہ اگر کسی وجہ سے مُلازم اپنے آقا کے ساتھ کھانا نہ کھا سکتا ہو ۔ تو آقا ملازم کو بلا کر اُس کے منہ میں اپنے ہاتھ سے ایک لُقمہ ڈال دے ۔ تاکہ اُس کی دلجوئی ہوسکے !

اسلامی مساوات کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کی مثال بھی بہت موزوں ہے ؛ صحابۂ کرام میں سے وہ سب سے زیادہ امیر تھے ؛ لیکن کیا رسولِ پاک صلعم نے اُن کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی تمام دولت کو بیت المال

Marfat.com

میں جمع کر دیں۔ تاکہ وہ غریبوں میں تقسیم کی جا سکے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام نے اس سلسلہ میں وہ قدم نہیں اُٹھائے۔ جو قدم اِس زمانہ میں رُوس اور چین نے اُٹھائے ہیں۔ اِس کے برعکس اسلام نے بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبہ کو اس قدر اُبھارا ہے۔ کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ہر متمول شخص فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر فخر کرتا تھا۔ اور اسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ صحیح اسلامی تعلیم یہی ہے۔ لیکن اب جب کہ لوگ اس قسم کا جذبہ نہیں رکھتے اُس کا علاج رُوس اور چین کی پیروی میں مضمر نہیں ہے۔ بلکہ اُن اقدامات کی ضرورت ہے۔ جن کا ان سطور میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ حالات بھی سُدھر سکیں۔ اور معیشت کے طور طریقے بھی اسلامی رہیں۔ غیر اسلامی نہ ہو جائیں!

اسلامی معیشت کے سلسلہ میں یہاں سُود کی بابت کچھ کہنا بھی لازمی ہے۔ ملک سے اِس لعنت کو دُور کرنے کے لئے سب سے آسان طریقہ مندرجہ ذیل ہے:۔

یہ ہم سب کو معلوم ہے۔ کہ اِس وقت ہمارے ملک کے بنکوں میں جتنا روپیہ عوام جمع کرواتے ہیں۔ وہ عام طور پر سب کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ہم بنک میں روپیہ جمع کروانے والوں کو سُود دیں۔ موجودہ صورتِ حال کو بدلنے کے لئے ایک آسان ترکیب یہ ہے۔ کہ جب مثال کے طور پر ایک شخص (زید) بنک میں ہزار روپیہ جمع کرنے کے لئے دے۔ تو جس کاروبار میں وہ روپیہ لگایا جائے "زید کو اُسی کاروبار میں "شریک" کر لیا جاتے۔ گویا زید یہ نیت کرلے کہ اِس نے اُس خاص کاروبار میں ایک ہزار روپے کی حد تک شرکت کرلی ہے۔ پھر جب سال کے اختتام پر اُس کاروبار کی پڑتال کی جائے۔ تو اگر اُس میں اخراجات وغیرہ نکال کر نفع ہو۔ تو زید کو وہ نفع دے دیا جائے۔ لیکن اگر اُس کاروبار میں نقصان ہو۔ تو زید اپنے حصہ کے مطابق اُس نقصان کو برداشت کرے۔

البتہ جو لوگ روپے کو محض حفاظت کی خاطر قلیل مدت کے لئے بنک میں جمع کرائیں اُن کے لئے کسی کاروبار میں شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ کسی قسم کے منافع کے حقدار نہیں ہوں گے۔

اس طریقہ سے ملک سے سُود کی لعنت کو آسانی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔

(نوٹ) جب یہ سطور لکھی گئی ہیں۔ اُس وقت پاکستان میں دسمبر ۱۹۷۰ء والی الیکشن نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اُس وقت "جتنے مُونہہ اتنی باتیں" والا معاملہ تھا۔ اب جب کہ جو پارٹیاں برسرِ اقتدار آتی ہیں۔ اُنہوں نے علی الاعلان یہ کہا ہے۔ کہ وہ قرآن وحدیث کے خلاف کوئی آئین نہیں بنائیں گی۔ لہٰذا سوشلزم کا خطرہ اب رفع ہو گیا ہے۔ اِس لئے اِس "فصل" کی چنداں ضرورت نہیں۔

Marfat.com

نُورِ مُصطفویؐ کا مُعمہ!

یہ مسئلہ کہ حضورؐ سرورِ کائنات فخرِ الموجوداتؐ صرف "بشر" ہی نہیں ہیں۔ بلکہ "نُور" بھی ہیں (اور یہی نُور پھر "نُورِ محمدیؐ" یا "نُورِ مصطفویؐ" کہلاتا ہے۔) باب اوّل میں کافی تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ مسئلہ اب تک "معمہ" کیوں بنا رہا ہے؟

اِس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ عام طور پر ہم حدیث "انا من نور اللہ" کا ترجمہ تو ٹھیک کرتے ہیں۔ (یعنی یہ کہ "میں اللہ کے نُور سے ہوں") لیکن اِن الفاظ میں راز کیا ہے؟ یا ان کا فلسفہ کیا ہے؟ اس سے ہم میں سے بہت کم آگاہ ہیں!

مثال کے طور پر بہت عرصہ ہوا ایک مولوی صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حضورؐ کی ذات "بشر" نہیں بلکہ "نُور" ہے۔ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کی وضاحت کے سلسلہ میں فرمایا۔ کہ اگر ایک پیالہ میں دُودھ ہو۔ تو اُس میں سے دُودھ ہی نکلے گا۔ پانی نہیں نکل سکتا؛ اسی طرح خدا کے نُور میں سے جب ایک اور نُور پیدا کیا گیا۔ تو لامحالہ ایک نُور میں سے دوسرا نُور ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ کچھ اور نہیں پیدا ہو سکتا!

یہ مثال بہت اچھی ہے۔ لیکن اس میں جو خامی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر ایک پیالہ میں ایک پاؤ دُودھ ہو۔ اور اُس میں سے ایک چھٹانک نکال لیا جائے۔ تو جو کچھ نکالا جائے گا۔ وہ تو واقعی دُودھ ہی ہوگا۔ لیکن پیالہ میں ایک پاؤ کی بجائے تین چھٹانک دودھ رہ جائے گا!

اِس سے بہتر مثال ایک چراغ کی ہو سکتی ہے؛ یعنی اگر ایک چراغ سے دوسری شمع جلائی جائے۔ تو شمع بھی جل جائے گی۔ اور چراغ کی روشنی میں بھی کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوگی؛ لیکن اس مثال میں بھی یہ خامی رہ جاتی ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے چراغ سے اگر ایک بہت بڑی شمع جلائی جائے۔ تو چراغ کی روشنی تو کم ہی رہے گی۔ لیکن شمع کی روشنی بہت زیادہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے۔ اِس قسم کی مثالیں خدا کو گھٹاتی بڑھاتی ہیں۔ جو بالکل لغو بات ہے؛

Marfat.com

اب مولوی صاحبان کو چھوڑ کر عوام کی طرف آئیں :۔ شانِ رسالت کے بارہ میں ایک شعر زبان زدِ عام ہے۔ یعنی ؎

کیا شانِ احمدیؐ کا چمن میں ظہور ہے ہر گُل میں، ہر شجر میں محمدؐ کا نُور ہے!

اس شعر کے سلسلہ میں، اخبار"قوم" لائلپور مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کے پرچہ میں، ایک صاحب آزاد شیرازی نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے :۔

"شعرِ عنوان بالا نہ جانے کس شاعر کا ہے ؟ بچپن ہی میں یہ شعر پڑھا۔ اور حفظ ہو گیا :۔ البتہ طبیعت میں یہ خلجان ضرور رہا۔ کہ شاعر نے ایک خلافِ واقعہ بات کہہ کر اللہ تعالیٰ کی توہین کی ہے۔ توحید کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اِس شعر میں اِس طرح ترمیم کر دی جائے ؎

کیا شانِ خالقی کا چمن میں ظہور ہے
ہر گُل میں، ہر شجر میں خدا ہی کا نُور ہے!

"ایک مدت تک علمی بحث و مباحثوں اور مناظروں میں توحید پرستی کا رنگ چڑھا رہا۔ اور جب کبھی موقعہ ملا۔ اِس شعر کو ہدفِ تنقید بناتا رہا :۔

"لیکن ایک دن یُوں ہوا۔ کہ ایک بزرگوار نے گُرُو نانک علیہ الرحمتہ کے مندرجہ ذیل دو شعر ایک محفل میں سنائے۔ اور معرفت کے دروازے یُوں کھلے۔ کہ دل کا کنول کِھل گیا۔ دماغ کی حیرت گُم ہو گئی۔ علمی کاوشیں اور ذہنی تحقیقیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ اور وہی شعر جو اکثر میرا ہدفِ تنقید رہا۔ وظیفۂ حیات بن گیا :۔ اب جب کبھی مندرجہ ذیل دو شعر پڑھتا ہوں۔ ایک وجدانی کیفیت سارے جسم میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ جس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں : آپ بھی پڑھیئے ؎

عدد گنوں جس انچر کے کیجو چوگنے تا
دس ملاؤ، پنج گُن کیجو، کاٹو بیس بنا
باقی بچے جو، نو گُن کیجو دو اس میں اور ملا
نانک ہر کے بچن سے محمد نام بنا!

"گرُو نانک علیہ الرحمتہ کے اِن شعروں کی تشریح یوں ہے۔ کہ آپ دنیا میں کسی شے کا نام لیجئے۔ اِس کے بحساب ابجد، عدد نکال لیجئے۔ اِن عددوں کو چار گنا کر لیجئے۔ اس میں دس عدد ملا دیجئے۔ حاصل کو پھر پانچ

Marfat.com

گنا کر لیجئے۔ اب بیس پر تقسیم کیجئے۔ جو باقی بچے۔ اُسے نو گنا کر لیجئے۔ اور اس میں دو جمع کر لیجئے۔ نتیجہ میں ۹۲ کا ہندسہ برآمد ہوگا جو محمدؐ کے عدد ہیں:

"آپ اس کو معجزۂ نبوت مانیں یا جو اللہ تعالیٰ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ علم حساب کی کرشمہ سازی تصور فرما لیجئے۔ یا جو جی میں آئے کہہ لیجئے:"

مندرجہ بالا پہیلی پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ اس میں عجوبہ تو ضرور ہے۔ لیکن اس میں نہ کوئی اعجاز ہے۔ اور نہ علم حساب کا کوئی کرشمہ! اس میں "گھنڈی" صرف یہ ہے۔ کہ آپ جس عدد کو بھی چار ضرب پانچ یعنی بیس سے ضرب دیں گے۔ پھر اُس میں دس ملائیں گے۔ اور آخر میں بیس سے ہی تقسیم کریں گے۔ تو جو عدد باقی بچے گا۔ وہ ہمیشہ دس ہی ہوگا: اب چونکہ "محمدؐ" کے نام کا عدد بحساب ابجد ۹۲ ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی اس دس کو نو سے ضرب دیں گے۔ اور اس میں دو جمع کریں گے۔ تو جواب ہمیشہ ۹۲ ہی آئے گا:

لیکن یہ اعجاز ہر شے کے نام میں ہو سکتا ہے: مثال کے طور پر اگر آپ "میز" کے لفظ کو "معجزنما" بنانا چاہیں۔ تو ابجد کے لحاظ سے چونکہ اس کا عدد ستاون ہے۔ لہٰذا آپ کو یہ کہنا ہوگا کہ ابجد کے حساب سے عدد نکال کر اُس کو پہلے چار سے ضرب دیں۔ اُس میں دس جمع کریں۔ پھر حاصل کو پانچ گنا کریں۔ اس کے بعد اُسے بیس سے تقسیم کریں۔ جو تقسیم کا باقی بچے۔ اُس کو پانچ سے ضرب دیں اور اُس میں سات جمع کریں: تقسیم کا باقی چونکہ ہمیشہ دس ہوگا۔ لہٰذا اُس کو پانچ گنا کر کے جب اُس میں سات جمع کئے جائیں گے۔ تو نتیجہ ہمیشہ ستاون ہی نکلے گا۔ جو "میز" کا ابجد کے لحاظ سے عدد ہے!

گویا اس طرح "میز" اور "کرسی" کے الفاظ میں بھی اُسی قسم کا کرشمہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جو اعجاز "محمدؐ" کے لفظ میں ہے! لیکن اس قسم کی پہیلیاں صرف سادہ لوح لوگوں کو ہی مرعوب کر سکتی ہیں۔ روشن ضمیر لوگوں کے لئے اس قسم کی باتوں میں کوئی اعجاز نہیں:

لیکن یہاں جو اصلی سوال ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مولوی صاحبان کو "انا من نور اللہ" کی تشریح کرتے

ع ابجد کے حساب سے عدد نکالنے کے لئے یہ نقشہ آپ کو مدد دے گا:-

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰

ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

وقت جو مثالیں دینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ یا عوام الناس جو مندرجہ بالا پہیلیوں کی مدد سے اپنے خلجان کو رفع کر رہے ہیں۔ اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم حدیث کے مندرجہ الفاظ کے معنی تو درست کرتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ میں جو راز پوشیدہ ہے۔ اُس سے ہم آگاہ نہیں!

اور اس ناواقفیت کی وجہ یہ ہے۔ کہ جب ہم "طریقت" کی کتابوں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ تو اُن میں بھی "نُورِ مصطفویؐ" کے معمّہ کی جب تشریح کی جاتی ہے۔ تو اُن میں مندرجہ ذیل قسم کے فقرات ملتے ہیں۔ جو معنوی لحاظ سے تو سو فیصدی درست ہیں۔ لیکن اُن سے عوام کے دلوں پر وہ مفہوم نقش نہیں ہو سکتا۔ جو مسئلہ کی وضاحت کے لئے لازمی ہے:

مثال کے طور پر "اسرار الطریقت" (مصنفہ عالی جناب حضرت شاہ محمد غوث) سے چند فقرات درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) "بے نہایت دُرود اُس اشرف المخلوقات خلاصۂ موجودات کی ذاتِ پاکؐ پر کہ تمام دُنیا اس بہت بڑے مظہرِ الٰہی کا پرتو ہے"

(۲) "نُورِ محمدیؐ علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کو کُل موجودات کا محیط تصور کرو۔ اور اس نُور کو خدا کی ذات میں جانو"

(۳) "حقیقتِ محمدی تمام ممکنات کا مدار ہے۔ اس لئے "تعینِ اوّل" ہے۔ اور تمام مراتب کی جامع ہے۔ اور ساری دُنیا اُس کے مظہر ہیں"

اب ان فقرات سے یہ تو مترشح ہو جاتا ہے۔ کہ "نُورِ محمدیؐ" بھی اِس دُنیا میں کوئی شے ہے۔ لیکن مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کے فلسفہ پر کوئی خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔ اور اِسی وجہ سے عوام الناس کو اس مسئلہ کے متعلق خلجان سا رہتا ہے:

اب شعر کو لیں: یہ ظاہر ہے۔ کہ اشعار میں صرف اشارات ہوتے ہیں۔ تفصیلی بحث نہیں ہوتی: لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے۔ اُن کو چونکہ نہ حدیث کا علم ہوتا ہے۔ اور نہ اُن سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ "طریقت" کی کوئی کتاب اُن کی نظر سے گزری ہو گی۔ لہذا اُن کو صرف اُن شعروں کا علم ہوتا ہے۔ جو زبان زد عام ہوں: اور محض شعروں سے ایک انسان جس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اُس کی مثال اُوپر بیان ہو چکی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ اِس مسئلہ کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں بیان کیا جائے۔ تاکہ موجودہ خلجان

Marfat.com

نہ رہے ؛

جیساکہ باب اوّل میں تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ میرے نزدیک "نُورِمصطفوی" کے فلسفہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اگر ہم صرف ایک نکتہ کو ہر وقت ذہن میں رکھیں۔ اور وہ یہ کہ "اَنَامِنْ نُورِاللّٰہ" کے الفاظ کے مطابق گو حضورؐ کا نُور خدا کے نُور سے ہی تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن "خدا کے نُور" اور "نُورِمصطفویؐ" کی "وضع" میں فرق ہے یعنی اگر اوّل الذکر "حسن" ہے۔ تو مؤخرالذکر "عشقؐ" تو تمام مسئلہ بالکل آسانی سے حل ہوجاتا ہے۔ چونکہ پھر یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ کہ ایک میں اگر "ناز" ہے۔ تو دُوسرے میں "نیاز" کیوں ہے؟ یا اسی طرح ایک میں "معبودیت" ہے۔ تو دوسرے میں "عبدیتؐ" کیوں ہے؟

اِس طرح پھر "نُورِخدا" اور "نُورِمصطفویؐ" اپنے اپنے مقام پر صحیح صحیح اور درست درست قائم رہتے ہیں۔ اور افراط و تفریط کی تمام راہیں یک قلم مسدود ہوجاتی ہیں ؛ اس وقت تک اِس سلسلہ میں جتنی بھی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ وہ صرف اسی نکتہ کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے ہوتی رہی ہیں۔ کیونکہ اگر اِس نظریے کو سامنے نہ رکھا جائے تو لازمی طور پر افراط و تفریط کی دو ایسی راہیں پھُوٹتی ہیں۔ کہ وہ کسی مقام پر اکٹھی نہیں ہوسکتیں ؛

اِس کی وجہ یہ ہے۔ کہ افراط کا نظریہ پھر لامحالہ یہ ہوجاتا ہے۔ کہ چونکہ خدا کے نُور سے جب کوئی نُور نکلے گا۔ تو وُہ "خدا کا نُور" ہی ہوگا۔ لہٰذا "نُورِمصطفویؐ" "خدا کا نُور" ہی ہے۔ اور اس کا اگلا قدم یہ ہے۔ کہ "خدا کا نُور" اور "نُورِمصطفویؐ" عین بعین اور ہُو بہُو ایک ہی ہیں۔ اور ان میں مطلقاً کوئی فرق نہیں! گویا حضورؐ کی دنیوی زندگی میں حضورؐ کی ذات چلتی پھرتی نہیں تھی۔ بلکہ خدا خود چلتا پھرتا تھا۔ اس کا مطلب پھر یہ بھی ہوگا۔ کہ حضورؐ کی ذات عبادت نہیں کرتی تھی بلکہ خدا خود اپنی عبادت کرتا تھا۔ اور ہم یہ اُوپر دیکھ چکے ہیں، کہ خدا میں سراسر "معبودیت" ہے "عبدیت" بالکل نہیں ہے۔ اور اِس لحاظ سے پھر "بعد از خدا بزرگ توئیؐ" والا مقولہ بھی بے معنی ہوجاتا ہے!

اِس کے برعکس تفریط کا نظریہ یہ ہوگا۔ کہ چونکہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا حضورؐ "نُور" ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ بشر، اور صرف بشر ہی تھے! گویا اس لحاظ سے جس بات کا اطلاق، عام طور پر بشر پر ہوتا ہے۔ اُسی کا اطلاق حضورؐ کی ذات پر بھی ہوگا۔!

لیکن اگر ہم ہر وقت اپنے سامنے یہ نظریہ رکھیں۔ کہ "خدا کا نُور" اگر "حسن" ہے تو "نُورِمصطفویؐ" "عشقؐ" تو پھر "خدا کی ہستی" اور "نُورِمصطفویؐ" اپنے اپنے مقام پر بالکل صحیح حالت میں قائم رہتے ہیں۔ اور ایک کو دوسرے میں "مدغم" کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ پھر صُورت یہ ہوجاتی ہے۔ کہ خدا اگر اپنے "حسن" کے لحاظ سے یکتا ہے۔ تو "نُورِمصطفویؐ" اپنے "عشق" کے لحاظ سے یکتا ہے! ایک میں اگر "رعنائی" ہے۔ تو دوسرے میں

Marfat.com

"عرفان" ! گویا ایک میں ایک قسم کا "کمال" ہے ۔تو دوسرے میں دوسری قسم کا "کمال" !

اور اس طرح پھر "نورِ مصطفوی[3]" کو پیدا کرنے کی جو اصلی غایت ہے ۔ وہ پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی خدا نے چاہا ۔کہ وہ پہچانا جائے ! اِس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آشکار ہو ! آشکار ہونے پر تجلیات کا وارد ہونا لازمی ہے ! تجلیات کے لئے یہ ضروری ہے ۔کہ اُن کو سہا جا سکے ۔سمویا جا سکے ۔جذب کیا جا سکے ! گویا اِس طرح پھر لامحالہ اس بات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے ۔کہ نہ صرف انسانیت بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں تجلیات کے متحمل ہونے کی سکت اور اہلیت پیدا ہو ! چنانچہ "نورِ مصطفوی" ہر لحظہ اور ہر آن صرف اِسی مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ کہ "حسن" کے آشکار ہونے پر دنیا کے لوگ حضرت موسیٰ کی طرح بے ہوش ہو کر نہ گر پڑیں ۔اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھی طُور پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ نہ ہو جائے ۔اور قرآن انجام کار "حسن" کے آشکار ہونے پر "حسن" کو تاب میں لانے کی قدرت کو ہی "نور کے اِتمام[1]" سے تعبیر کرتا ہے ۔!

اس تشریح سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے ۔کہ دنیا نے آخر کار کس مقام پر پہنچنا ہے ؟ اور دنیا اس وقت جا کدھر رہی ہے ؟

ہم اس وقت ڈرامہ کا وہ سین دیکھ رہے ہیں ۔جس کو قرآن نے مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ[2] کے الفاظ سے یاد کیا ہے ! ابھی دنیا نے ڈرامہ کا "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[3]" والا سین دیکھنا ہے !

موجودہ زمانہ انسان کے "عدو" مبین" کے "کید[4]" کی تفسیر ہے ! اگلا زمانہ اِسی زمانہ کے "کید" کی "تضلیل[5]" کی تفسیر ہوگا !

"وحدت" سے "کثرت" !

"وحدت" سے "کثرت" کس طرح ظہور میں آئی ؟ بابِ اوّل میں یہ بیان کیا جا چکا ہے ۔کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے

[1] وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ سورۃ ٦١ الصف ۔آیت ٨ ؛ اور اللہ نے اپنا نور پورا کرنا ہے ؛

[2] سورۃ ٢ البقرۃ ۔آیت ٣٠ ؛ جو زمین میں فساد پھیلائے گا ۔اور خونریزیاں کرے گا ؛

[3] ایضاً ؛ مجھے معلوم ہے ۔جو تم نہیں جانتے ؛

[4] یعنی فریب یا داؤ ؛ (سورۃ ١٠٥ الفیل ۔آیت ٢) ؛

[5] یعنی تباہی ؛ (سورۃ ١٠٥ ۔الفیل ۔آیت ٢) ؛

Marfat.com

"نورِ مطلق" سے ایک اَور "نُور" (یعنی "نُورِ مصطفویؐ") کو پیدا کیا۔ تو یہ "وحدت" سے "کثرت" کی تمہید تھی۔ اَور جب اِس "نُورِ مصطفویؐ" سے تمام دُنیا کی تخلیق کی گئی۔ تو یہ "وحدت" سے "کثرت" کی تکمیل کی طرف قدم تھا: وہاں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ نُورِ مطلق کے نُور کی وضع اگر "حسُن" ہے۔ تو دوسرے نُور کی وضع "عشق" ہے: اِسی لئے "حسُن" میں اگر سراپا "ناز" (یا "معبودیت") ہے۔ تو "عشق" میں سراسر "نیاز" (یا "عبدیت") ہے!

تصوف کی کتابوں میں جب اِسی مسئلہ کے متعلق بحث ملتی ہے۔ تو وہاں "وحدت" سے "کثرت" کے کو سمجھانے کے لئے عام طور پر "عکس" اَور "ظِل" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں:

اب پہلے "عکس" کو لیں: اِس سے مراد یہ ہے۔ کہ اگر ایک انسان آئینہ کے سامنے اپنا ہاتھ رکھے گا۔ تو آئینہ میں اُس ہاتھ کا "عکس" آجائے گا: گویا "وحدت" سے "کثرت" کی مثال یہی ہے: اِس مثال کے مطابق ہاتھ تو گویا خدا ہُوا۔ اَور آئینہ میں "عکس" کثرت ہو گئی! لیکن اِس مثال میں خامی یہ رہ جاتی ہے۔ کہ آئینہ میں انسان کا پورا ہاتھ جُوں کا تُوں نظر آئے گا: گویا ہتھیلی کے مقابلہ میں ہتھیلی ہو گی: ہتھیلی کی لکیریں بھی ہُوبہُو ویسی ہی نظر آئیں گی۔ اَور ہاتھ کی انگلیاں بھی پانچ ہی نظر آئیں گی: گویا اِس مثال سے "وحدت" سے "کثرت" تو ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں ہوتا۔ کہ اگر "کثرت" "وحدت" کا ہی عکس ہے۔ تو "وحدت" میں جو "معبودیت" ہے۔ وہ "کثرت" میں "عبدیت" کس طرح بن گئی؟

یہی حال "ظِل" کی مثال کا ہے: اگر آپ اپنا ہاتھ سورج کے سامنے کریں۔ تو زمین پر جو "ظِل" پڑے گا اُس میں انسانی ہاتھ ہی نظر آئے گا۔ انگلیاں بھی پانچ ہی نظر آئیں گی: گویا اِس طرح بھی "وحدت" سے "کثرت" کی مثال تو مل جاتی ہے۔ لیکن ہاتھ میں اگر "معبودیت" ہے۔ تو "ظِل" میں "عبدیت" کس طرح پیدا ہو گئی؟ اِس مسئلہ کا حل نہیں ملتا!

اِس کا صحیح حل ہماری سمجھ میں تب ہی آسکتا ہے۔ جب ہم اِس دُنیا کی تخلیق کی حقیقی وجہ کو اپنے سامنے رکھیں: اِس دُنیا کو پیدا کرنے کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانے۔ اَور یہ عرفان چونکہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب انسان خدا کی عبادت کرے۔ اَور عبادت کا مطلب ہی صرف خدا کے "حسُن" کی داد دینا ہے۔ اَور داد صرف "عشق" ہی دے سکتا ہے۔ لہذا (جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے) جب نُورِ مطلق" نے اپنے "نُور" سے ایک اَور نُور پیدا کیا۔ تو پہلے "نُور" کی وضع اگر "حسُن" تھی۔ تو دوسرے "نور" کی وضع "عشق" رکھی: اِسی لئے خدا میں "ناز" ہی "ناز" ہے۔ اَور "عشق" میں صرف "نیاز"! عین اِسی وجہ سے "وحدت" میں "معبودیت" ہے۔ اَور "کثرت" میں "عبدیت"!

غرض جب تک متذکرہ بالا تمام پس منظر ایک انسان کے سامنے نہ ہو "کثرت" میں "عبدیت" کی وجہ

Marfat.com

سمجھ میں نہیں آسکتی :: یہی وجہ ہے۔ کہ "عکس" اور "ظل" کی تشبیہیں "وحدت" سے "کثرت" کے عقدہ کو کلی طور پر واضح نہیں کرسکیں!

ہمہ اوست درست ہے، یا ہمہ از وست؟

جہاں تک "ہمہ از وست" کا تعلق ہے۔ ایک انسان کو یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ کہ چونکہ اس تمام کائنات کی تخلیق رب العزت نے فرمائی ہے۔ لہذا یہ سب کچھ اُسی ذات کا "نورِ ظہور" ہے ::

اب "ہمہ اوست" کو لیں۔ اس سے مراد یہ تو ہرگز نہیں ہوسکتی۔ کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ "خدا" ہے۔ چونکہ ہماری آنکھ صرف مادی اشیاء کو دیکھتی ہے۔ اور مادی اشیاء سب مخلوق ہیں۔ لہذا نہ یہ خدا ہیں۔ اور نہ یہ خدا ہوسکتی ہیں ::

البتہ تمام کائنات میں جو خدا کی "قدرت" نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے تمام اشیاء خدا کی مظہر ضرور ہیں۔ اسی لحاظ سے خدا کے تمام مظاہر کو "ہمہ اوست" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ::

ایک اور نکتہ جس کی وجہ سے خدا کے تمام مظاہر کو "ہمہ اوست" کے معنوں میں لیا جا سکتا ہے۔ وہ حضورؐ کی یہ حدیث ہے :- اَنَا مِنْ نُّوْرِ اللّٰہِ وَ کُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِیْ[1]

اس کتاب کے بابِ اوّل میں اس کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کی وجہ، مفصّل طور پر بیان کی جا چکی ہے :: یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ خدا نے جب یہ چاہا۔ کہ اُس کو اپنے "حسُن" کی داد ملے۔ تو رب العزت نے اپنے "نورِ مطلق" سے ایک "نور" یعنی "نورِ مصطفویؐ" کو پیدا فرمایا :: اُس وقت باری تعالیٰ نے "مخلوق نور" (یعنی "نورِ مصطفویؐ") کو اپنی وضع میں نہیں رکھا۔ (چونکہ اس طرح تو وہ خدا ہو جاتے۔) بلکہ چونکہ خدا کے اپنے "نور" کی وضع "حسُن" ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے "مخلوق نور" کی وضع کو "عشق" کی صورت میں بدل دیا!

اسی لئے "خدا کے نُور" میں اگر "معبودیّت" ہی "معبودیّت" ہے۔ تو "نُورِ مصطفویؐ" میں محض "عبدیّت" ہی "عبدیّت" ہے! اس کے علاوہ "کُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِیْ" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ "نُورِ مصطفویؐ" یا بالفاظِ دیگر "عشق"، ہی دراصل تمام کائنات کا "خمیر" ہے!

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ چونکہ اس کائنات میں صرف دو ہی عنصر ہیں۔ ایک "حسُن" اور دوسرا "عشق" اور "عشق" کا تخم دراصل "نُورِ مطلق" ہی ہے۔ (خواہ اُس کی وضع میں ایک خاص مصلحت کی بنا پر

---

[1] میں اللہ کے نُور سے ہوں۔ اور تمام مخلوق میرے نور سے ہی تخلیق کی گئی ہے!

Marfat.com

فرق ہی رکھا گیا ہو) ۔ لہٰذا اِس نقطۂ نگاہ سے تمام کائنات کو "ہمہ اوست" سے ضرور تعبیر کیا جاسکتا ہے!

اِس مسئلہ کو سمجھنے میں جہاں دشواری پیش آتی ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ جہاں تک خدا کی قدرتوں کا تعلق ہے ۔ اُن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے تو اِس کائنات کو "ہمہ اوست" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن جب اِس دُنیا میں شیطان کی شیطنت پورے زوروں پر ہو ۔ اُس کو سامنے رکھتے ہوئے ایک انسان اِس بات سے ہچکچاتا ہے ۔ کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے ۔ جس سے اِس شیطنت کا "ہمہ اوست" سے کچھ بھی نسبت یا واسطہ ثابت ہو؛

لیکن یہ اُسی وقت تک ہے ۔ جب تک کہ ہم "شر" کے فلسفہ کو صحیح طور پر نہ سمجھیں؛ "شر" (جیسا کہ ان صفحات میں پہلے کہا جاچکا ہے) دُنیا میں اس لئے تخلیق نہیں کیا گیا ۔ کہ لوگ بدکردار ہوں ۔ بلکہ یہ اس لئے تخلیق کیا گیا ہے ۔ کہ انسانوں کا امتحان لیا جاسکے ۔ کہ کون کس حد تک اِس "شر" پر قابو پاکر نیکی کا علمبردار بنتا ہے؛ اندریں حالات ایک سلیم الفطرت انسان کے لئے اِس "شر" میں بھی بے شمار حکمتیں ہیں؛ اور جب ہم ایمانِ مجمل کے اُس حصّہ کو سامنے لے آئیں ۔ جس میں "وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی"[1] کے الفاظ آتے ہیں ۔ تو "شر" کی حکمتیں اور بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں؛

اِس تمام بحث سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں ۔ کہ "ہمہ اوست" والا مسئلہ "سطحی نظر" سے نہیں سمجھا جاسکتا ۔ اس کے لئے "عمیق نظر" کی ضرورت ہے ۔ اور یہ ممکن نہیں ۔ جب تک کہ ایک انسان کا خدا اور اُس کے رسولؐ کے متعلق تخیل بالکل درست نہ ہو ۔ اور وہ خود بھی حقیقی معنوں میں نیک کردار نہ ہو؛

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" دراصل ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں؛ جب ایک شخص "دانائے راز" ہو جاتا ہے ۔ پھر تو وہ اِس کائنات کو "ہمہ اوست" سے تعبیر کرسکتا ہے ۔ لیکن جب تک ایک انسان اِس رتبہ کو نہیں پہنچتا ۔ تب تک اُسے "ہمہ از وست" کہنا ہی واجب ہے ۔ کیونکہ ؎ فکر ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے ۔ وہ تو مصنف کا اپنا نظریہ ہے؛ تصوف[2] کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جو بحث

---

[1] اور خیر و شر کی تقدیر اللہ کی طرف سے ہے؛

[2] یہاں جو سطور لکھی جارہی ہیں ۔ وہ زیادہ تر لاہور کے رسالہ سلسبیل بابت ماہ اگست و نومبر ۱۹۶۹ء اور جنوری ۱۹۷۰ء سے لی گئی ہیں؛

Marfat.com

ملتی ہے۔ اُس میں ایک مثال جو عام طور پر دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خالق کا مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے۔ وہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے ایک شخص کا آئینہ میں عکس پڑتا ہے ؛ اب اِس عکس کا اُس شخص سے جو تعلق ہے۔ اُس کی نوعیت یہ ہے۔ کہ یہ عکس اُس شخص کا ایک اعتبار سے عین بھی ہے۔ کیونکہ یہ اُسی شخص کا عکس ہے۔ کسی دوسرے کا نہیں ؛ اور ایک اعتبار سے یہ عکس اُس شخص کا غیر ہے۔ کیونکہ یہ عکس اُس کے وجود کا حصّہ نہیں ہے ؛ گویا کہ اِس عکس کی اُس وجود کے ساتھ "عینیت" اور "غیریت" کی دونوں صورتیں مسلّم ہیں۔ اور اِس حد تک یہ دونو صورتیں صحیح بھی ہیں ؛

لیکن اِس وقت اِس مسئلہ کے بارہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وحدۃ الوجود والوں کا گروہ ہے۔ اور دوسرا وحدۃ الشہود والوں کا ؛ پہلے گروہ کے پیشوا شیخ محی الدین ابنِ عربی ہیں۔ اور دوسرے گروہ کے پیشوا حضرت امام ربّانی شیخ مجدّد الف ثانیؒ ہیں ؛

غور سے دیکھا جائے۔ تو ہر دو فریق معاملہ کے دونو پہلوؤں کو (جو مندرجہ بالا مثال میں واضح کیے گئے ہیں) تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ایک گروہ کی توجہ ایک طرف زیادہ اور دوسرے کی دوسری طرف زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بظاہر ایک اختلاف کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ گو حقیقتاً کوئی خاص اختلاف نہیں ہے !

مثال کے طور پر جو حضرات وحدت الوجود کے نظریئے کے قائل ہیں۔ اُن میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا ہے۔ جن کے سینہ کو خدا کھول دیتا ہے۔ اور نظر میں وُسعت پیدا کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ لاہوت (حق) کی ذات میں استغراق وانہماک کا جو حال اُن کو میسّر آتا ہے۔ اِس حال میں کثرتوں کا احساس اُن کو مزاحم نہیں ہوتا۔ بلکہ اِن ساری کثرتوں کو وہ حق تعالیٰ ہی کے کمالات کی تفصیل قرار دیتے ہیں۔ اور اِن کثرتوں کے آئینہ میں اپنے محبوب کے جمال کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں ؛ اسی لئے اِس مسلک کے لوگوں نے ساری کثرتوں کی قیومیت کا جو تعلق حق تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ یا لاہوت کے وجود اور کائناتی کثرتوں کے وجود کے مابین جو رشتہ پایا جاتا ہے۔ اُس کو پوری طاقت سے واضح کیا ہے۔ اور اِس بات پر بھی زور دیا ہے۔ کہ ساری کثرت لاہوت کی وحدت کے سامنے کس طرح مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اِس پر بھی (اگرچہ اجمالاً اور اشارۃً ہی سہی) تنبیہ کرتے چلے گئے ہیں۔ کہ وجودی تعلّق کے باوجود لاہوت کی ذات قطعاً کائنات کی اِن کثرتوں سے متصف نہیں ہے۔ بلکہ وہ اِن کی آلودگیوں سے پاک ومقدّس ہے۔ نیز لاہوت میں اور کائناتی کثرتوں میں مواطن اور ظرفِ وجود کا جو اختلاف ہے۔ اُس کو بھی اُنھوں نے ظاہر کر دیا ہے ؛

معلوم ہوتا ہے کہ متاخّرین کے گروہ کے وہ لوگ جنھوں نے زبردستی اپنے آپ کو صُوفیوں میں داخل کر لیا ہے۔ وہ حضراتِ صُوفیاء کی اِس باب میں مختلف تعبیروں کے اصل مقصد کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

Marfat.com

لہٰذا وہ لفظی اَور تعبیری اختلاف کو حقیقت کا اختلاف سمجھتے رہے ؛

اِس کے برعکس حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ جو وحدۃ الشہود والے نظریئے کے مبشّر ہیں۔ اُنھوں نے اصل شے اَور شے کے ظلّ میں جو فرق ہے۔ اُس کو پوری طاقت کے ساتھ واضح فرمایا ہے ؛ اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ اِس فرق کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن حضرت مجدّد علیہ الرحمۃ نے اپنی ذاتی واردات کی بنا پر جو اِن پر اس سلسلہ میں وارد ہوئیں۔ ایک مکتوبؒ میں جو تفصیل دی ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں ؛ البتہ اُس مکتوب میں چند ایک فقرات ایسے بھی ہیں جن کے متعلق یہاں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے ؛

حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں :-

" بالآخر مجھ کو حق تعالیٰ و تقدس کے محض فضل و کرم سے حضرت ارشاد پناہ ، حقائق آگاہ شیخنا و مولانا خواجہ محمد باقی باللہ قبلہ قدسنا اللہ تعالیٰ بسرہ کا فیضِ صحبت میسّر ہوا۔ اُنھوں نے مجھ کو طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی تلقین فرمائی۔ اَور مجھ مسکین کے حال پر نہایت توجہ مبذول فرماتے رہے ؛ تھوڑی مدت کے سلوک سے توحیدِ وجودی کا انکشاف ہوگیا ؛ اَور یہ انکشاف غلو کی حد تک پہنچ گیا ؛ ....

یہ حالت ایک مدت دراز تک قائم رہی۔ اَور سالہا سال تک مَیں توحیدِ وجودی کی چاشنی میں سرشار رہا ؛ یکایک عنایتِ کاملۂ الٰہی جلّ و علا نے میری غیبی امداد فرمائی۔ اَور جو چیز اُس کے بیچون و بےچگون ہونے کا حجاب ہو رہی تھی۔ اُس کو دُور کر دیا ؛ جو علوم و معارف وحدت الوجود سے تعلق رکھتے تھے یکدم زائل ہو گئے ؛ مقام مذکور میں جس احاطہ قُرب اَور معیّتِ ذاتیہ کا انکشاف ہُوا تھا۔ وہ سب رُوپوش ہو کر کمال تیقّن کے ساتھ معلوم ہُوا۔ کہ صانع پاک جلّ و علا کو عالم کے ساتھ اِس قسم کی کوئی بھی نسبت نہیں ؛ جس احاطہ اَور قرب کا کلام مجید میں ذکر ہے۔ وہ باعتبار علم کے ہے ....

حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کے ساتھ اتحاد نہیں۔ خدا خدا ہے۔ اَور مخلوق مخلوق ...... واجب الوجود کو بعینہٖ ممکن الوجود سمجھنا کس قدر غلط ہے ؛ قدیم اَور حادث کا عین ہمہ گر ہونا ہر گز مقصود نہیں ؛ ...... کسی چیز کی حقیقت کا منقلب ہو جانا (مثلاً قدیم کا حادث ہو جانا۔ یا بالعکس) کیا بلحاظ عقل اَور کیا بلحاظ شرع ممتنع ہے ؛ دو جُداگانہ بالکل مختلف حقیقتوں کے مفہوم کا ایک دوسرے پر اطلاق کرنا کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا ...."

لہ یہ مکتوب ایک شخص "شیخ صوفی" کے نام لکھا گیا ہے ؛ جس کا ترجمہ مولانا عبدالرحیم کلاچوی نے کیا ہے ؛ دیکھیں "سلسبیل" لاہور بابت ماہ اگست ۱۹۶۹ء ؛

Marfat.com

اتنا کچھ لکھنے کے بعد حضرت مجدد علیہ الرحمۃ یہ بھی فرماتے ہیں :-

" ممکن الوجود اور واجب الوجود کا مفہوم ہر چند ایک دوسرے سے بالذات مختلف ہے ۔ لیکن بعض عارضی امور کے لحاظ سے ان میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے ۔ اور اس لئے غلبۂ محبت کی حالت میں وہ مابہ الامتیاز نظر سے محجوب ہو کر صرف مابہ الاشتراک باقی رہتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اگر ممکن اور واجب کو عین ہمہ گر سمجھ کر وحدتِ وجود کا حکم کر دیا جائے ۔ تو اس کو کذب ہرگز نہ کہیں گے ؛ احاطۂ ذاتی وغیرہ احکام کی بھی اسی کے مطابق تاویل کریں ؛"

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے مندرجہ بالا دوسرے اقتباس کا اگر وحدت الوجود والے نظریئے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے ۔ (جس کی اوپر مختصراً تشریح کی گئی ہے) تو لفظی اور تعبیری اختلاف تو شاید کسی حد تک پایا جائے کوئی خاص حقیقی اختلاف نہیں پایا جاتا ؛

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے ۔ کہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے مکتوب کا جو پہلا اقتباس ہے ۔ اُس میں جو حضرات واجب الوجود کے نظریئے کے قائل ہیں، اُن کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کی گئی ؛ مثال کے طور پر وہ ساری کثرتوں کو حق تعالیٰ کے کمالات کی تفصیل تو قرار دیتے ہیں ۔ لیکن وہ واجب الوجود کو بعینہٖ ممکن الوجود نہیں کہتے ۔ اور نہ وہ قدیم اور حادث کا عین ہمہ گر ہونا متصور کرتے ہیں ؛ لہٰذا اس قسم کی باتیں اُن کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں ؛

اسی طرح پہلے اقتباس کے ایک دو اور حصّوں پر بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ؛ مثال کے طور پر :-

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کو عالم کے ساتھ احاطہ ۔ قُرب یا معیّت کی قسم کی کوئی نسبت نہیں !

دوم جس احاطہ ۔ قُرب یا معیّت کا کلام مجید میں ذکر ہے ۔ وہ باعتبارِ وسعتِ علمِ الٰہی ہے !

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی آیات یہ ہیں :-

احاطہ ؛ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ[1]

(سورۃ ۴۱ حٰمٓ السجدہ ۔ آیت ۵۴) ؛

---

[1] خبردار رہو ۔ کہ اللہ ہر ایک چیز کو محیط کئے ہوئے ہے ؛

Marfat.com

قُرب : وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۱
(سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۱۸۶) :

معیّت : وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۲ (سورۃ ۵۷ الحدید - آیت ۴) :

اب جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ خدا تعالیٰ کو عالم کے ساتھ قُرب اور معیّت ذاتیہ ہرگز نہیں۔ تو اُس وقت جہاں تک بنی نوع انسان کا تعلق ہے۔ اِس بات پر غور کرنا نہایت لازمی ہے۔ کہ انسان کے جسم کے اندر روح درج ہے۔ اور جسکو قرآن نے مِن رُّوحِہٖ کہا ہے۔ اُسکو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا : حقیقت یہ ہے۔ کہ جبتک انسان کی رُوح حجاب میں ہے۔ تب تک تو یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ وہ نہ رب العزت کے قریب ہو سکتی ہے۔ اور نہ اللہ جلشانہ کی معیّت اُس کو نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب رب العزت کے فضل و کرم سے اُس کے حجاب اُٹھ جائیں۔ پھر بھی اگر وہ نہ قُرب حاصل کر سکے۔ اور نہ معیّت تو دُنیا کا تمام کھیل ہی بے مقصد ہو جاتا ہے !

اس سلسلہ میں ایک طرف تو نبی صلعم کی حدیث کے الفاظ ہمیں یہ سبق دیتے ہیں : فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں اپنے ولی کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف حالت یہ ہے۔ کہ جہاں تک باری تعالیٰ کے ذاتی قُرب اور معیّت کا تعلق ہے۔ وہ سب باعتبار علم ہی ہوتا ہے !

اس لحاظ سے پھر اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ - اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ - اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۳ کے معنی کیا کئے جائیں گے ؟ گویا کیا یہ محبت بھی سب باعتبار وسعت علم الٰہی ہی ہے ؟

اپنے مذکورہ بالا خاص نظریات کی وجہ سے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اس مکتوب میں ایک جگہ فرماتے ہیں : " لامکانی کو مکان کے حدود سے باہر قدم رکھ کر ڈھونڈنا لازم ہے " : لیکن اس بات کا سمجھنا ہمارے لیے ذرا مشکل ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۴ : بظاہر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان کا نفس اُس کے اندر ہے یا باہر؟

اسی طرح عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے : مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ ۵ بھی بظاہر دو سوال پیدا ہوتے ہیں : ایک یہ کہ نفس کہاں ہے ؟ اور دوسرے یہ کہ جس نفس کو عرفان حاصل ہوتا ہے وہ رب کا ہوتا ہے۔ یا " وسعت علم الٰہی " کا

---

۱ اور اے محبوب۔ جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں۔ تو میں نزدیک ہوں ۲ اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔ جہاں کہیں تم ہو

۳ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔ محسنوں سے، متقین سے، صابروں سے اور متوکلین سے :

۴ اور تم اپنے نفسوں میں کیوں نہیں جھانکتے ؟ (سورۃ ۵۱ الذاریات آیت ۲۱)

۵ جس نے اپنے نفس کو پہچانا۔ اُس نے رب کو بھی پہچانا :

Marfat.com

بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی قسمت میں ذاتی قُرب ومعیّت ہے ہی نہیں۔ تو پھر کیا
"فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" بھی باعتبار علم ہی تھا؟
اس قسم کے نظریئے کی تائید ابنِ تیمیہ کی تصانیف سے ہوتی ہے؛ جہاں وہ لکھتے ہیں۔ کہ خدا بالعلم تو ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن بالوجود ہر جگہ موجود نہیں! بالفاظِ دیگر اُس کی صفات تو ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ذات ہر جگہ موجود نہیں! گویا اُس کی صفات غیر محدود ہیں۔ لیکن ذات محدود ہے! ظاہر ہے۔ کہ اِس قسم کا نظریہ اسلام کے خلاف ہے:

حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مع ذات وصفات غیر محدود ہے۔ اور ہر جگہ موجود ہے۔ اور چونکہ ہر جگہ موجود ہے۔ لہٰذا اُس سے قُرب ومعیّت یا وصال ذاتی ہونا چاہئے۔ محض علمی نہیں۔ اور یہ نظریہ بعید از قیاس وگمان یا عقل بھی نہیں!

اِس مقام پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کہ خیالات کی مندکرہ بالا اُفتاد یہ بتاتی ہے۔ کہ ہم ظلّ وعکس اور حادث وقدیم کی بھول بھلیوں میں پھنس کر حقیقت سے دُور ہو گئے ہیں!
مثال کے طور پر آپ ایک روزمرّہ کے استعمال کی چیز یعنی پنسل کو لے لیں: اس کے بارہ میں ہمارا عام طور پر کہنا یہ ہے۔ کہ چونکہ یہ پنسل حادث ہے۔ لہٰذا یہ ناقص اور ہیچ ہے: لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پنسل کا ذرّہ ذرّہ تسبیح میں مشغول ہے!
باب اوّل میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ ہماری موجودہ دُنیا میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب تسبیح میں مشغول ہے۔ اور جو تسبیح میں مشغول ہے۔ وہ دراصل "نُورِ مصطفویؐ" ہے۔ اور "نُورِ مصطفویؐ" "مِنْ نُوْرِ اللّٰہ" ہے!۔۔۔ لیکن "نُورِ مصطفویؐ" کی تخلیق جہاں سے ہوئی ہے۔ وہ "نُورُ اللّٰہ" ہے!!

اِس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ایک خاص وجہ کی بنا پر "نُورِ اللہ" اور "مِن نُورِ اللہ" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق صرف دُنیا کو ایک "کھیل" (یعنی ڈرامہ) کی صورت میں بنانے کی خاطر جان بُوجھ کر رکھا گیا ہے۔ ورنہ کوئی فرق نہ ہوتا!

اِس فرق کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ جب دُنیا کی تخلیق کی گئی ہے۔ تو اُس کی تہ میں صرف وہ ارادہ کارفرما تھا۔ جو ربّ العزت نے فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کے الفاظ ارشاد کر کے ظاہر فرمایا!

بابِ اوّل میں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ خُدا دراصل "حُسن" ہے! یکتا "حُسن"!! لازوال "حُسن"!!! یہ ظاہر ہے۔ کہ حُسن میں صرف "ناز" (یا "معبودیّت") ہی ہے: چنانچہ جب "حُسن" نے اپنے حُسن کی "داد" چاہی۔ اور (حُسن کی "داد" چونکہ صرف "عشق" ہی دے سکتا ہے۔ لہٰذا جب) "عشق" کی تخلیق کی گئی۔ تو لازمی طور پر اُس کی سرِشت میں صرف "نیاز" (یا "عبدیّت") ہی رکھی گئی۔ ورنہ اگر ("حُسن" کی "معبودیّت" کے مقابلہ میں) "عبدیّت" کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ تو "نُورِ اللہ" اور "مِن نُورِ اللہ" میں کوئی فرق نہ ہوتا!

گویا اب صحیح صورت یہ ہوئی کہ اِس دُنیا میں صرف دو ۲ ہی عنصر ہیں۔ ایک "حُسن" اور دوسرا "عشق": جو حقیقت میں ایک "نُورِ اللہ" ہے۔ اور دوسرا "مِن نُورِ اللہ"۔

اَب اِس "نُورِ اللہ" اور "مِن نُورِ اللہ" کو "ہمہ اوست" سے تعبیر نہ کرنا ——— خاص کر جب کہ اِن دونوں میں جو حقیقی فرق ہے۔ اُس کی وضاحت بھی ہو چکی ہو ——— تعجب انگیز اَمر نہیں تو اور کیا ہے؟

اسی لئے حضرت بُوعلی شاہ قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

هرچه آید در نظر از خیر و شر — جمله ذاتِ حق بود اے بے خبر
اوست در ارض و سما و لامکاں — اوست در ہر ذرّہ پیدا و نہاں

حدیثِ قدسی "کنتُ کنزاً مخفیاً الخ" سے ابنِ عربیؒ کا "وحدتِ وجود" پر استدلال اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا اُس سے اختلاف!

کچھ عرصہ ہوا، ایک کتاب[1]

میں میری نظر سے ایک عبارت گزری جس میں ابنِ عربی نے "کنتُ کنزاً مخفیاً"[2] والی حدیثِ قدسی سے "وحدتِ وجود" پر استدلال کیا ہے۔ اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے۔ کہ اِس صورت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاتہٖ کامل نہیں۔ اور اپنی تکمیل ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا:

کتاب کی اصلی عبارت یہ ہے:-

"ابنِ عربی نے تخلیقِ کائنات کی غرض بتاتے ہوئے "کنتُ کنزاً مخفیاً" والی حدیث

---

[1] "تذکرۂ نور"۔ مصنفہ فقیر محمد ارشد۔ پاکے شریف۔ ڈاکخانہ منڈی بُرج۔ ضلع لائلپور۔

[2] پوری حدیث یہ ہے:۔ کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اُعرَفَ فخلقتُ الخلق
(میں چُھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے دُنیا بنادی۔)

قُدسی سے " وحدتِ وجود" پر استدلال کیا ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ کہ اِس صورت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاتہٖ کامل نہیں۔ اُور یہ کہ وہ اپنی تکمیلِ ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا۔ حالانکہ ایسا کہنا تعلیمِ وحی کے سراسر منافی ہے۔ جیساکہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ [1] (بس بیشک اللہ تعالیٰ تمام عالمین سے بے پرواہ ہے")؛

اِس کتاب کے بابِ اوّل میں "کُنتُ کَنزاً مَخفیاً" والی حدیثِ قدسی کے بارہ میں یہ کہا جاچکا ہے۔ کہ حضرت داؤد نے اللہ تعالیٰ سے ایک دن یہ پوچھا۔ کہ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔ کہ "میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہٰذا میں نے دُنیا بنادی"!

گویا اِس دُنیا کی تخلیق کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ کہ وہ پہچانا جائے!

اِن اوراق میں اِس حدیثِ قدسی کی وضاحت اِن الفاظ میں کی گئی ہے۔ کہ خدا دراصل چونکہ "حُسن" ہے۔ اور "حُسن" کا خاصہ یہ ہے۔ کہ وہ فطری طور پر اپنے حُسن کی داد چاہتا ہے۔ اُور "حُسن" کی کماحقہٗ داد صرف "عشق" ہی دے سکتا ہے۔ لہٰذا "حُسن" نے "عشق" کو پیدا کیا! چنانچہ موجودہ تمام کائنات کا "خمیر" دراصل یہ "عشق" ہی ہے؛ اِسی لئے اِس کائنات کا ذرّہ ذرّہ روزِ ازل سے "حُسن" کی داد دینے میں مشغول و منہمک ہے؛ اُور قرآن نے اِس داد کو یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ [2] کے الفاظ سے سراہا ہے؛

گویا اب حقیقت یہ ہوئی۔ کہ اگر باری تعالیٰ دنیا کی تخلیق نہ فرماتا۔ اور اپنے حُسن کی داد نہ چاہتا۔ اوّل تو یہ "حُسن" کی "فطرتِ صحیحہ" کے خلاف ہوتا۔ اور دوسرے تمام انسانیت نہ صرف خدا کی معرفت سے محروم رہتی بلکہ رب العزت کی تجلّیات سے بھی نہ نوازی جاتی! اُور اِس کمی کی وجہ سے "حُسن" پر "بُخل" کا الزام آتا۔ اور اِس طرح اللہ تعالیٰ اپنی بے عیب ذات پر آپ خود "حرف" لاتا!

مثال کے طور پر اگر کوئی حسین ترین عورت ہو۔ لیکن اُس کو نہ کوئی دیکھنے والا ہو۔ اور نہ اُس کے حُسن کی کوئی داد دینے والا ہو۔ تو ایسی صورت میں عورت کے حُسن کی تکمیل میں تو کوئی فرق نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ جب تک اُس کا کوئی حقیقی چاہنے والا نہ ہو۔ ایک کمی ضرور محسوس کی جائے گی۔ اُور رب العزت نے یہ دُنیا بنا کر اِسی کمی کو با حسن وجوہ

---

[1] سورۃ ۳ اٰل عمران آیت ۹۷؛

[2] سورۃ ۶۲ الجمعۃ آیت ۱؛ (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے)

Marfat.com

پورا فرمایا ہے!

اب سوال یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پھر فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ[1] کے الفاظ کیوں فرمائے؟

قرآن میں یہ الفاظ رب العزت کے عُشاق کے لئے نہیں آئے: مجانِ الٰہی تو نہ صرف دُنیا کی تخلیق کے شیدائی ہیں۔ بلکہ ممنوں بھی ہیں۔ کہ رب العزت نے دُنیا کو پیدا فرما کر اُنہیں موقع دیا۔ کہ وہ "حسُن" پر نثار ہو کر خدا کی معرفت حاصل کریں۔ تاکہ وہ "دیدارِ الٰہی" سے نوازے جائیں: لہٰذا مندرجہ بالا قرآنی الفاظ ایسے لوگوں کے لئے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ اُن لوگوں کے لئے آئے ہیں جو سلیم الفطرت نہیں ہیں۔ اور جو اپنی شقی القلبی کی وجہ سے یہ کہ سکتے ہیں۔ کہ وہ باری تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے! چنانچہ قرآن نے زیرِ بحث الفاظ اِس قسم کے ناہنجار لوگوں کے لئے ہی استعمال کئے ہیں: اسی لئے اِس آیت کا پورا ٹکڑا یہ ہے:

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ[2]

اِس سلسلہ میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ دُنیا کی تخلیق نہ فرماتا۔ تو ایسی صورت میں کیا ہوتا؟

اِس سوال کا سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے۔ کہ پھر یہاں خدا کی اپنی ذات کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا! ایسی صورت میں حقیقت یہ تو نہ ہوتی۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاتہٖ کامل نہ ہوتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہوتا۔ کہ مخلوق کے بغیر وہ "خالق" نہ کہلا سکتے! "رزّاق نہ کہلا سکتے! بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[3] نہ کہلا سکتے!

یہاں تک کہ وہ "محبوب" بھی نہ کہلا سکتے!

اِس صورتِ حال کا اظہار ایک شاعر نے ایک رباعی میں یُوں کیا ہے ؎

بے عاشق و عشق حُسنِ معشوق کجاست؟
تا عاشق و عشق نیست معشوق کجاست؟
در فتوئ عشق اگرچہ ایں قول خطا است
مشّاطۂ حُسنِ یار بے صبری ماست!

ایسی صورت میں پھر کیا نقص واقع ہوتا؟ اِس سوال کا جواب مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہو جائے گا:

---

[1] سورۃ ۳ آلِ عمران۔ آیت ۹۷: پس تحقیق اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے:

[2] ایضاً: اور جس کسی نے کفر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے۔

[3] سورۃ ۲ البقرۃ۔ آیت ۱۱۷: پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا:

Marfat.com

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک حکیم ملیریا بخار کی ایک تیر بہدف دوائی ایجاد کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کے بارہ میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ اور نہ مریضوں کی بیماری کے وقت اُسے استعمال کرتا ہے ؛ ایسے حکیم کے بارہ میں ہمارا "فتوٰی" کیا ہوگا؟ یہی کہ وہ پرلے درجہ کا بخیل ہے!

اسی طرح اگر ریل کے انجن کا موجِد انجن کو ایک دفعہ صحیح طور پر بنا کر نہ اُسے دوبارہ چلاتا۔ اور نہ اُس کے راز کسی کو بتاتا تاکہ لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھانا شروع کر دیں۔ تو ایسے مُوجد کے بارہ میں ہماری رائے کیا ہوتی؟

اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ دنیا کو پیدا کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ اس کی تخلیق کے بغیر باری تعالیٰ فی ذاتہٖ کامل نہیں تھا۔ بلکہ:

(۱) دُنیا کی تخلیق کے بغیر جو سُقم رہ جاتے تھے۔ اس کائنات کو پیدا کر کے رب العزت نے وہ اسقام رفع کر دئیے ہیں!

(۲) "حسُن" کو فطرتاً جو داد کی تمنا ہوتی ہے۔ اُس کو فطرتِ صحیحہ کے مطابق پورا کر دیا گیا ہے!! اور

(۳) بنی نوع انسان کو "حسُن" کی "تجلیات" سے محروم کر کے "حسُن" پر جو "حرف" آسکتا تھا۔ اُس کا ازالہ کر دیا گیا ہے!!!

لہٰذا یہ کہنا ناروا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی تکمیلِ ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ دُنیا کو پیدا کر کے رب العزت نے بنی نوع پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ کہ سلیم الفطرت لوگ "حسُن" کی داد دے کر "حسُن" کی تجلیات سے نوازے جائیں! اور "حسُن" کے "دیدار" سے سرفراز ہوں!

اگر انسان کا مقصدِ حیات "عشقِ الٰہی" ہے تو قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟

اس کتاب کے باب اوّل میں "عشق کی تخلیق" "عشق کی آپ بیتی" یا "نورِ مصطفوی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ ایک مضمون کی صورت میں ماہوار رسالہ "سلسبیل" (لاہور) بابت ماہ فروری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا؛ اُس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب نے یہ سوال اُٹھایا۔ کہ کیا قرآن حکیم میں "عشق" کا لفظ آیا ہے؟

سوال نہایت معقول ہے!

اِس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے۔ اور وہ یہ کہ قدرت کی طرف سے ہر چیز کی ایک فطرت مقرر کی گئی ہے۔ مثلاً پانی کی فطرت میں یہ ہے۔ کہ وہ ڈھلوان کی طرف بہے؛ اب اس بارہ میں پانی کو کچھ کہنے سننے کی

Marfat.com

کی ضرورت نہیں۔ کہ وہ ڈھلوان کی طرف ضرور بہے۔ بلکہ صرف پانی کو زمین پر گرا دینا کافی ہے ؛ چنانچہ جونہی اُس کو زمین پر گرایا جائے گا۔ وہ خود بخود ڈھلوان کی طرف بہنا شروع کر دے گا ؛

بالکل اِسی طرح ہر انسان کی فطرت میں "عشق" موجود ہے۔ وہ ہر وقت "تشنۂ مضراب" رہتا ہے۔ اُس کو محض ذرا "چھیڑنے" کی ضرورت ہے! چنانچہ جونہی "حسن" اُسے "چھیڑتا ہے"۔ "عشق" چلا اُٹھتا ہے :

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(بیشک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے۔ جو سارے جہانوں کا رب ہے! سورۃ ۶ الانعام۔ آیت ۱۶۳)

گویا جس طرح پانی کو بہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کہ وہ ڈھلوان کی طرف ضرور بہے۔ عین اُسی طرح "حسن" کو بھی یہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ کہ "عشق" اُس پر تن، من، دھن سے نثار ہو! "عشق" خود بخود "حسن" کی طرف مائل اور اُس پر نچھاور ہونے کے لئے مجبور ہے!

اِسی لئے کسی "قیس" کے واسطے یہ نہایت شرمناک بات ہے۔ کہ اُس کی "لیلیٰ" پہلے اُس کو یہ بتائے۔ کہ وہ نہایت حسین ہے۔ لہٰذا وہ اُس پر عاشق ہو!

یہاں تک کہ "لیلیٰ" کو اگر یہ کنایۃً بھی "قیس" کو سمجھانا پڑے۔ کہ وہ حسین ہے۔ تو یہ اُس کے حسن کی توہین ہے!

اب خدا "حسن" ہے! یکتا "حسن"!! لازوال "حسن"!!! اُس کے حسن کی خودداری اُسے اِس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنے "حسن" کے بارہ میں کنایۃً بھی یہ کہے۔ کہ وہ بیحد "حسین" ہے! چہ جائیکہ وہ یہ کہے۔ کہ لوگ اُس پر "عاشق" ہوں! اِس لئے قرآن میں "عشق" کا لفظ موجود ہی نہیں!

بایں ہمہ "حسن" ہر فرد سے نہ صرف "عشق" کا متوقع ہے۔ بلکہ "فی البدیہہ" عشق کا متوقع ہے!

"فی البدیہہ" اِس لئے کہ گو "حسن" اِس دُنیا میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن اُس کی خوبی و خوبصورتی، رعنائی و دلربائی کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوری طرح "پس پردہ" ہونے کے باوجود، ہر دم اور ہر آن اِس طور سے "بے پردہ" بھی ہوئی جاتی ہے۔ کہ ایک سلیم الفطرت انسان اِس بات کے لئے مجبور ہے۔ کہ وہ "خدائی شمع" کا ہر آن "پروانہ" بنا رہے!

اب چونکہ "حسن" کو انسان کی اِس "مجبوری" و "لاچاری" کا پوری طرح علم ہے۔ لہٰذا فرما دیا۔ کہ یہ دُنیا "لَھْوٌ وَّلَعِبٌ" ہے۔ یعنی یہ "آنکھ مچولی" کا کھیل ہے! ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں!! ہمیں ڈھونڈ لو!!!

جب کوئی شخص اپنے ہمنواؤں سے کسی مشکل سی پہیلی کا جواب پوچھتا ہے۔ تو دوست عام طور پر پوچھتے ہیں۔ کہ پہیلی کا "اتہ پتہ" بتاؤ ؛ یعنی اُس پہیلی کا تعلق آسمان سے ہے! زمین سے ہے! نباتات سے ہے! حیوانات

سے ہے! کس سے ہے؟ پھر وہ شخص بتا دیتا ہے۔ کہ اُس کا تعلق مادیات سے نہیں ہے۔ رُوحانیت سے ہے! اس طرح پھر پہیلی کا بوجھنا آسان ہو جاتا ہے:

اسی طرح جب حضورؐ سرورِ کائنات و فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا۔ کہ اس دُنیا کی تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ "حسن" جو یہاں چھپا ہوا ہے۔ انسان اُسے ڈھونڈے! تو حضورؐ نے رب العزت کو عرض کیا۔ کہ "دُرِ مقصود" کے حاصل ہونے پر کسی کی جبینِ نیاز میں تو ہزاروں شکرانے کے سجدے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن بنی نوعِ انسان کی "دیدہ و دیدار طلب را چہ علاج؟" اس کا کوئی آسان ترین طریقہ ہونا چاہیئے! ارشاد ہوا:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(یعنی دُنیا کے لوگوں سے فرما دیجئے۔ کہ وہ اگر اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہیں۔ تو وہ آپ کی پیروی کریں اللہ اُن کو چاہنے لگے گا!) (سورۃ ۳ آل عمران آیت ۳۱)

یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا۔ کہ ہم "بُلبل" کو حکم دیتے ہیں۔ کہ وہ "پھول" پر نثار ہو۔ بلکہ کہا تو یہ کہا۔ کہ جو اپنے آپ کو "تشنہ" محسوس کرتے ہیں۔ وہ حضورؐ کی سُنت کی پیروی کریں:

گویا "پیاس لگنا" تمہارا کام ہے! اور "پیاس بُجھانا" ہمارا کام!

تمام قرآن میں اس نکتہ کی بار بار تاکید پائی جاتی ہے۔ کہ "پہل" initiative تو انسان کی طرف سے ہو۔ رب العزت پھر اُس کے لئے راہیں اور راستے کھولتے چلے جائیں گے! یہی بات "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" میں ہے۔ پہلے "عبادت" کا ذکر آتا ہے۔ پھر "استعانت" کا! گویا پہلے "عشق"! پھر "وصالِ یار کی مسعود ساعتیں"!

اب یہ سوال کہ قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟ اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہاں اتنا اور اشارہ کافی ہے۔ کہ "پروانہ" (بغیر کسی "عشق" کے لفظ کو جانے) "شمع" پر نثار ہو رہا ہے! اور اسی طرح "بُلبل" بھی (بغیر کسی "محبت" کے لفظ سے آشنا ہونے کے) "پھول" پر نچھاور ہو رہی ہے! اب کیا یہ تعجب کا مقام نہیں۔ کہ انسان جو عقل و دانش کا پتلا ہے۔ وہ اُس "حسن" پر نثار ہونے کے لئے (جو تمام جہانوں کے "حسینوں" کا خالق ہے)۔ پہلے قرآن میں لفظِ "عشق" کی سند ضروری متصور کرے؟

لہٰذا ایک انسان کا اپنے آپ کو خدا کے "حُسن" پر نچھاور کرنا ایک فطری امر ہے۔ باوجود اس بات کے کہ قرآن میں "عشق" کا لفظ واقعی موجود نہیں!

Marfat.com

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ صرف سلیم الفطرت لوگوں کے بارہ میں ہے: لیکن انسان کے ہاتھ کی انگلیاں برابر نہیں ہیں: بعض لوگوں کے لئے محض اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لیکن بعض کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا۔ جب تک کہ تمام باتوں کو بالکل واضح الفاظ میں بیان نہ کیا جائے:

چنانچہ مؤخر الذکر لوگوں کے لئے قرآن نہایت صاف الفاظ میں حکم دیتا ہے۔ کہ لوگو خدا کی عبادت کرو۔ جس نے نہ صرف تم کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام جہان کی چیزوں کو بنایا ہے۔ مثلاً آسمان و زمین۔ سورج، چاند اور ستارے۔ نباتات و جمادات، چرند و پرند۔ وغیرہ۔ وغیرہ:

یہی نہیں بلکہ واضح سے واضح باتوں کو بھی کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ مثلاً ماں باپ کا ادب کرو۔ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ سخاوت کرو۔ بخیل نہ بنو۔ فحش و بے حیائی کے پاس بھی نہ بھٹکو۔ وغیرہ۔ وغیرہ:

اور پھر صرف ان نیکی کی باتوں کا حکم ہی نہیں دیتا۔ بلکہ ترغیب بھی دلاتا ہے۔ کہ متقی لوگ جنت میں جائیں گے۔ جہاں اُن کو ہر قسم کا عیش و آرام ہوگا۔ اور خدا کے احکام نہ ماننے والوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے:

یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ یہ تمام ترغیب و تحریص عوام کے لئے ہے۔ ورنہ جہاں تک سلیم الفطرت لوگوں کا تعلق ہے۔ وہ جنت و جہنم کو خاطر میں بھی نہیں لاتے! اس سلسلہ میں حضرت رابعہؒ کا قول بہت دلچسپ ہے۔ وہ فرماتی ہیں:۔

"اے میرے معبود! اگر میں تیری عبادت جہنم کے ڈر سے کرتی ہوں۔ تو تُو مجھے نارِ جہنم کا لُقمہ بنا دے! اگر میں تیری عبادت جنت کے لالچ سے کرتی ہوں۔ تو تُو مجھے اُس سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے! اور اگر میں صرف تجھ سے، تیری ذات سے، تیرے لئے محبت کرتی ہوں۔ تو اے میرے مولا! مجھے اپنے جمال ازلی سے محروم نہ کیجیو!"

اب جب ایک انسان اس "جمالِ ازلی" سے نوازا جاتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب امام غزالیؒ کے الفاظ میں سُنیئے: وہ فرماتے ہیں:۔

"عارفین کے ایمان کی بُنیاد مشاہدہ حق پر ہوتی ہے۔ جو بالکل بے حجاب ہوتا ہے: جو عارف اس مرتبۂ بلند پر فائز ہو چکتے ہیں........ اُن کی آنکھوں کے سامنے سے حجابات اُٹھ جاتے ہیں: اُن کی بصیرت کے سامنے تمام دروازے کُھل جاتے ہیں: بندۂ رب کا بے حجاب جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ اور اُس کی ذات کا کامل احاطہ کر لیتا ہے!"

Marfat.com

غرض جو سلیم الفطرت لوگ خوش قسمتی سے اِس قسم کے جلووں سے نوازے جاتے ہیں۔ وہ بھلا جنّت و جہنم کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟

لیکن چونکہ اِس قسم کے لوگوں کی فطرت میں یہ بات کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر دم اور ہر آن "حُسن" کی قربانگاہ پر تن، من، دھن سے نثار ہوں۔ لہٰذا قرآن نے اُن کے لئے "عشق" کے لفظ کو استعمال کرنا غیر ضروری سمجھا۔ چنانچہ اسی لئے قرآن میں "عشق" کا لفظ موجود ہی نہیں!

چہ حُسنست اینکہ در یکدم رُخت را صد نظر بینم

ہنوزم آرزو باشد کہ یکبار دگر بینم

عاشق حسنِ خود است آن بی‌نظیر

حسنِ خود را خود تماشا می‌کند!

Marfat.com

باب ہفتم

اِشارات

اسرائیل

پچاس سال سے بھی اُوپر کا ذکر ہے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ جس کا عنوان مندرجہ ذیل حدیث تھی:

أَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ

(یعنی یہود اور نصاریٰ کو جزیرہ العرب سے نکال دو!)

چنانچہ یہود و نصاریٰ جن کی اکثریت اُس وقت مدینہ کے شمال میں رہتی تھی۔ وہاں سے نکال دیئے گئے۔ اور وہ فلسطین میں جا کر بس گئے:: معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب اسلام مغرب میں پھیلا۔ یہاں تک کہ مسلمان سپین تک پہنچ گئے۔ تو یہود یورپ کی طرف نکل گئے::

ہٹلر کے زمانہ میں جب جرمنی میں یہود کو بہت زدوکوب کیا گیا اور اُن پر مظالم ڈھائے گئے۔ تو وہ وہاں سے بھاگے:: کچھ لوگ امریکہ وغیرہ چلے گئے۔ اور باقی سب نے فلسطین کی طرف رُخ کیا:: آئین سٹین جو ایک مشہور سائنسدان ہوا ہے۔ (اور جو یہودی تھا) وہ امریکہ جا کر آباد ہوا::

یہودیوں کی فلسطین جانے کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے پیرو ہیں۔ اور یروشلم اِن کا "مکہ" ہے!

اب اِس سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں جب یہودی عرب سے نکل کر فلسطین میں جا کر بسے۔ تو مسلمان اِس بات سے مطمئن تھے۔ کہ مندرجہ بالا حدیث پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ یہودیوں کو دُنیا میں کسی جگہ رہنے ہی نہ دیا جائے::

اِس وقت عام طور پر جس بات پر زور دیا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہودیوں پر یورپ میں جو مظالم ہوئے ہیں۔ اگر اُن کا کفارہ لازمی ہے۔ تو کفارہ مغربی اقوام کو دینا چاہیے۔ فلسطین اِس کا خمیازہ کیوں بھگتے؟

یہ ایک نہایت معقول بات ہے۔ لیکن جس طرح اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ فلسطین میں یہودیوں کے رہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ یروشلم اُن کا "مکہ" ہے۔ اور اِس واقعہ کو آسانی سے ردّ نہیں کیا جا سکتا! لہذا اگر ہم حرف

Marfat.com

اِس ایک نکتہ کی اہمیت کو محسوس کر لیں۔ تو معاملہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے ؛

گذشتہ تین چار سال صرف اسی بات پر بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے ۔ کہ یہودی اُن تمام ممالک کو خالی کریں، جن پر وہ ۱۹۶۷ء سے قابض ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اِس بات پر زور دے رہے ہیں ۔ کہ پہلے اُن کا فلسطین میں رہنے کا حق تسلیم کیا جائے !

قرآن میں ایک واقعہ آتا ہے ۔ کہ ایک دن حضرت داؤد کے پاس دو فرشتے انسان کی شکل میں آئے۔ اور کہنے لگے کہ ہم دونوں کے درمیان ہمارے ایک جھگڑے کا فیصلہ کر دیں۔ اور جھگڑا یہ ہے ۔ کہ یہ جو میرا بھائی ہے۔ اُس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں۔ اور میرے پاس ایک دُنبی ہے ؛ وہ کہتا ہے۔ کہ یہ دُنبی بھی اُسے دے دی جائے ؛ حضرت داؤد نے جواب دیا۔ کہ اپنی ۹۹ دُنبیوں میں ایک اور دُنبی بھی جو ملا لینا چاہتا ہے ۔ اس کا یہ فعل ظالمانہ ہے۔ اور اکثر لوگ ایک دوسرے پر ظلم کیا کرتے ہیں !

یہی حالت اِس وقت دُنیا کے لوگوں کی ہے ؛ چین کے پاس اِس وقت جو ملک ہے ۔ اُس کا رقبہ تقریباً ۳۶ لاکھ مربع میل ہے ؛ اسی طرح رُوس کی سلطنت کا رقبہ تقریباً ۸۶ لاکھ مربع میل ہے ؛ عیسائیوں کے قبضہ میں بیسیوں ملک ہیں ۔ جن پر وہ خود بلا شرکتِ غیرے حکمران ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ایک درجن سے زائد سلطنتوں کے مالک ہیں ؛ اور اسرائیل کے آس پاس جو عرب ممالک ہیں ۔ اُن کا رقبہ بھی پانچ لاکھ مربع میل سے زائد ہو گا ؛ اتنے بڑے رقبہ میں سے دس پندرہ ہزار مربع میل اسرائیل کو نہیں دیا جا سکتا ! گویا اس وقت دُنیا کی تمام بڑی بڑی قومیں "ننانویں" حکومتوں کی مالک ہیں۔ لیکن ایک چھوٹے سے ملک کی سلطنت[1] اسرائیل کو نہیں دی جا سکتی ! یہ کیوں نہیں دی جا سکتی ؟ اس کی وجہ کیا ہے ؟ صرف یہ کہ

حوصلے وہ نہ رہے۔ ہم نہ رہے، دل نہ رہا !

اِن صفحات میں اِس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔ کہ آخر کار اِس دُنیا میں "حکومت الٰہیہ" قائم ہو گی ؛ اُس کی "مرکزی حکومت" کے جتنے بھی حکمران ہوں گے۔ وہ تو اولیائے کرام ہوں گے۔ لیکن دُنیا کے ملکوں کی "مقامی حکومتوں" میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوں گے۔ وہ "صالحین" ہوں گے ؛ اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ کہ آخر کار زمین کے وارث نیکو کار لوگ ہوں گے۔ اور قرآن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے ۔ کہ اِن "صالحین" کی بابت پہلی پیشین گوئی زبور میں آئی ہے ؛ یہ "صالحین" کون ہیں ؟ اس کی تفسیر پچھلے اوراق میں گذر چکی ہے ۔ کہ اِس سے مراد صالح غیر مسلم ہیں[2]۔

---

[1] البتہ بیت المقدس کے اُردنی علاقہ کو شامل کرنے کے بغیر ! [2] دیکھیں صفحات ۲۲۰ — ۲۲۱ ؛

Marfat.com

"اسلام اور دوسرے مذاہب" والی فصل میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (پاکستان) کی ایک کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا نام "اسلام اور مذاہبِ عالم" ہے۔ اُس میں یہودیوں کے بارہ میں مندرجہ ذیل پیشین گوئی لکھی گئی ہے:-

"ایک نجات دہندہ آئے گا۔ جو دُنیا بھر میں امن و خوشحالی اور عالمگیر اخوت قائم کرے گا:- یہ وہی موعودہ سلطنت ہوگی۔ جس کا وعدہ حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا تھا:-

جب یہ اعجازی زمانہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ تو وہ تمام اسرائیلی افراد زندہ ہو جائیں گے جنہوں نے بیرونی سلطنتوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے جان دی تھی۔ اس طرح ایک نئی زمین اور نیا آسمان معرضِ وجود میں آئے گا"!

اس اقتباس سے اس بات کی تائید ملتی ہے۔ کہ جس "خلافتِ الٰہیہ" کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اُس میں "دھاندلی" نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر شخص کی قدر اُس کے ایمان و عمل اور تقویٰ کے لحاظ سے کی جائے گی۔ نہ کہ انسان کے موروثی مذہب کے لحاظ سے۔ یعنی جو شخص اتفاق سے مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ وہ تو جنتی اور باقی تمام دُنیا کے لوگ جہنمی!

بہر حال یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ سوال یہ ہے۔ کہ اگر یہ پیشین گوئی درست ہے کہ "خلافتِ الٰہیہ" کے وقت تمام دُنیا میں انصاف و عدل کی حکومت قائم ہوگی۔ اور پھر وہ "تمام اسرائیلی افراد زندہ ہو جائیں گے۔ جنہوں نے بیرونی سلطنتوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے جان دی تھی۔ اس طرح ایک نئی زمین اور نیا آسمان معرضِ وجود میں آئے گا" تو اُس وقت ہمارے موجودہ فتوؤں کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ جو ہم نے یہودیوں کے بارے میں اب تک دیئے ہیں:-

---

اسرائیل کے بارہ میں ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے:- اگر قرآن کے الفاظ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ[1] پر ہمارا ایمان ہے۔ اور ہم اس بات کو بھی مانتے ہیں۔ کہ حضرت موسیٰ پیغمبروں میں سے ایک برحق پیغمبر ہیں۔ تو نئا نوے "ونیوں" والی سلطنت والوں کو چاہیئے۔ کہ حضرت موسیٰ کی اُمت کو بھی ایک "ونی" دے دیں!

---

[1] ہم کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔ (سورۃ ۲ البقرہ آیت ۲۸۵)

یہ درست ہے ۔ کہ یہودیوں کی قوم اپنی بے عنوانیوں کی وجہ سے ایک " مغضوب " قوم ہے ۔ لیکن وہ اپنی انہی بے عنوانیوں کی وجہ سے ہی تو اس وقت تک اتنی پٹی ہے ۔ اور ابھی پٹ رہی ہے ۔ لیکن اِن صفحات میں جس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ جب اِس دُنیا میں وہ " موعُودہ سلطنت " قائم ہوئی ۔ جس کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا ہے ۔ اُس وقت (یعنی بالآخر) اِس قوم کی حالت کیا ہو گی ؟

گویا بالفاظِ دیگر اگر ہمارا یہ ایمان ہے ۔ کہ زُود یا بدیر ایک نجات دہندہ آنے والا ہے ۔ جو دُنیا بھر میں امن و خوشحالی اور عالمگیر اخوت قائم کرے گا ۔ اور اُس نے پھر اِس " مغضوب " قوم کو بھی ایک " دُنبی " دے دی ۔ تو ہماری کیا آبرو رہے گی ؟

ہم کیا چاہتے ہیں ؟ کہ اِس دُنیا میں جب " طائرانِ حرم " کا دَور دَورہ ہو ۔ تو اُس وقت ہمارے تخیّل کا رُخ اُن کے تخیّل کی افتاد کے ساتھ ہم آہنگی کرے ۔ یا اُس کے برعکس ہو ؟ اِس کا فیصلہ دُنیا نے خود کرنا ہے ۔ لہذا وہ اِس بات کا فیصلہ از خود کرے !

حقیقت را برندے فاش کردند
کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را !

Marfat.com

حرفِ آخر

نہایت مختصر الفاظ میں، ان اوراق میں اس قدر تفصیل میں جانے کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ جو لوگ اِس وقت سائنس کی ایجادات سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ وہ "تصویر کا دوسرا رُخ" بھی دیکھ لیں۔ اور اُن کی سمجھ میں یہ بات آ سکے۔ کہ جب موجودہ "مشین کا زمانہ" کی مُہلت ختم ہو گئی، تو پھر اسلام کی بابت اُن کے اپنے اپنے مفہوم کس قدر مُہمل ثابت ہوں گے!

لہٰذا ہمیں موجودہ زمانہ کی تگ و دَو میں حصّہ لینے وقت پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ ہم اِس دُنیا میں کیوں آئے؟ ہمیں جانا کدھر ہے؟ اور ہم جا کدھر رہے ہیں؟ اِس وقت اسلام کی تعلیم کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں ہیں۔ وہ انہی سوالات پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اگر ہماری نوجوان سوالوں کے صحیح جواب معلوم کرنے کی طرف مبذول ہو جائے۔ تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہ انسانی مقصدِ حیات حقیقت میں کیا تھا؟ آہستہ آہستہ وہ کس طرح بدلا؟ اور اب وہ کیا ہو کر رہ گیا ہے؟

واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر خلفائے راشدین تک انسانی مقصدِ حیات صرف "خدا کی معرفت" ہی سمجھا گیا۔ لیکن جب خلافتِ راشدہ کی جگہ "ملوکیت" نے لے لی۔ تو پھر مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" کی بجائے "خدا اور اُسکے رسولؐ پر ایمان اور نیک بننا" رہ گیا: اس طرح "زینہ" تو سامنے رہا۔ لیکن "منزل" نظروں سے اوجھل ہو گئی! اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ نیک اعمال پر تو زور رہا۔ لیکن "خدا کی معرفت" حاصل کرنے کے لئے تقوے کے جس بے حد بلند معیار کی ضرورت تھی۔ وہ بالکل غائب ہو گیا: اور آہستہ آہستہ جب "مشین کا زمانہ" آیا۔ تو اب زیادہ تر زور "امن، آسودگی اور خوشحالی" پر ہے۔ جس کو انگریزی میں "Peace, Prosperity and Well-being" کہتے ہیں: مثال کے طور پر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے ایک کتاب لکھی ہے "اسلامک آئیڈیولوجی (Islamic Ideology)" وہ انہی تین الفاظ سے بھری پڑی ہے: ظاہر ہے۔ کہ آج کل "امن، آسودگی اور خوشحالی" کے حصول کے لئے نہ خدا پر ایمان کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی "ریش و نقاب" کی! لہٰذا اب اسلام کا نام ہی نام ہے۔ گویا "منزل" تو کُجا۔ اب راستہ بھی نظروں کے سامنے نہیں ہے! چنانچہ دعویٰ تو "مکہ" پہنچنے کا ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن گھوم گھام کر "لندن" یا "ماسکو" پہنچ جاتے ہیں!

اِس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک "مذہب" کا تعلق ہے۔ ہمارا علم "ابتدائی" اسلام تک محدود ہے۔ "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام کی ابجد سے بھی ہم واقف نہیں۔ اور جہاں تک "ترقی" کا تعلق ہے۔ ہماری نظر صرف گذشتہ دو تین صدیوں تک ہی اُٹھتی ہے۔ جس میں صرف "مادی ترقی" ہی ہوئی ہے۔ "رُوحانی ترقی" ہمارے لئے بالکل اجنبی سی بات ہے۔ اِسی لئے سنّت جو دراصل بندہ کو خدا سے ملاتی ہے۔ اُس کا ہم نام بھی نہیں لیتے! چنانچہ جدید تعلیمیافتہ مسلمانوں کے آپ اگر اخبارات میں بیانات پڑھیں۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ وہ "اسلام" کی بجائے زیادہ تر "اسلامی اصولوں" کی

Marfat.com

اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ وہ دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں۔ کہ خالص "اسلام" یا "سنت" کا لفظ استعمال کرکے ہم مردوں کے لئے "ڈاڑھی" اور عورتوں کے لئے "حجاب" کا "خطرہ" مول لیتے ہیں۔ لہذا بچاؤ اسی میں ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو "اسلامی اصولوں" کی اصطلاح تک محدود رکھیں۔ تاکہ ہم "ریش و نقاب" کے مخمصوں میں نہ پھنسیں[1]!

اب اس کے برعکس اگر یہ نکتہ ہمارے ذہن نشین ہو سکے۔ کہ روزِ آفرینش سے سلیم الفطرت لوگوں کے لئے مقصدِ حیات صرف "خدا کی معرفت" ہی رہا ہے۔ اور چونکہ باقی سب مقاصدِ حیات انسانوں کو اپنے وضع کئے ہوئے ہیں۔ لہذا آخرکار ہی نوعِ انسان کو اُسی مقصد کی طرف لوٹنا ہے۔ جو خدا نے وضع کیا ہے۔ تو پھر یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم موجودہ زمانہ کی کشمکش میں حصہ بیشک لیں۔ لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ موجودہ "مادی زمانہ" ایک عبوری دور ہے۔ اور کائنات کی "مادی تسخیر" کی تمام تگ و دو وقتی ہے۔ لہذا اسوقت یہ "ذمہ ناگزیر" الغرض کا حکم رکھتی ہے "عبادت" کا نہیں! یہ اس لئے کہ دنیا کو معرضِ وجود میں لانے کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی معرفت سے نوازا جائے۔ اور اس معرفت کا نتیجہ یہ نکلنا ہے۔ کہ انسان کو نہ صرف "دیدارِ الٰہی" نصیب ہونا ہے۔ بلکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لئے مسخر ہو جاتا ہے۔ لہذا ہمارا حقیقی نصب العین "براہیمی ایمان" ہونا چاہیئے۔ تاکہ انفرادی طور پر وہ "معرفتِ الٰہی" پر اور اجتماعی طور پر "خلافتِ الٰہیہ" پر منتج ہو!

یہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ آخرکار جب اس دُنیا میں "حکومتِ الٰہیہ" قائم ہو گی۔ تو اُس کی "مرکزی حکومت" کے جتنے حکمران ہوں گے۔ وہ تو اولیائے کرام ہوں گے۔ لیکن دُنیا کے مُلکوں کی "مقامی حکومتوں" میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوں گے۔ وہ اُن ہی مُلکوں کے وہ غیر مُسلم ہوں گے۔ جو حقیقی معنوں میں صالح ہوں

---

[1] اسی وجہ سے جب جنرل ایوب نے اپنے وقت میں آئین بنایا۔ تو اُسوقت مملکت کا نام "ریپبلک آف پاکستان" رکھا۔ لیکن عام لوگ چونکہ اس نام کی "مصلحت" کو نہ سمجھ سکے۔ لہذا بعد میں اس کا نام "اسلامک ریپبلک آف پاکستان" میں تبدیل کرنا پڑا!

Marfat.com

گے۔ یہ اس لئے کہ قرآن نے صراحتاً غیر مسلموں کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے:۔

اوّل جو مشرک ہیں۔ یا خدا کو نہیں مانتے۔ اُن کے لئے (خاص حالتوں میں) "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار" کا حکم آیا ہے۔ لیکن

دوسرے وہ ہیں جن کے بارہ میں ارشاد ہُوا ہے "لَیْسُوْا سَوَآءً" (سورۃ ۳۔ آل عمران۔ آیت ۱۱۳) :

یعنی غیر مسلموں میں سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نیک اعمال کرتے ہیں: اس قسم کے لوگوں کے لئے قرآن نے "صالحین" (دیکھو ۳ : ۱۱۴) کا لفظ استعمال کیا ہے:

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم جب کسی ملک میں رہتے ہیں۔ تو اُس وقت ہمارا نصب العین "تبلیغ" نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم اپنے لئے ہر قسم کی "آزادی" چاہتے ہیں۔ اُس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ انسان اپنے وطن "پر قابض" ہو: اولیائے کرام جب دُنیا میں "ایک حکومت" قائم کریں گے۔ تو وہ کسی ملک پر بھی "قابض" ہونے کی کوشش نہیں کریں گے ــــــ وہ تو ایک ملک سے دوسرے ملک میں بادلوں کی طرح جائیں گے۔ کیونکہ وہ "طائرانِ حرم" ہوں گے۔ لہٰذا انکو کسی ملک سے کسی قسم کی اجازت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ یہ اس لئے کہ اُن کی زندگی اقبال کے اس مصرعہ کی تفسیر ہوگی ؎

مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

اس کے باوجود اُن کو دُنیا کے ممالک میں سے کسی ملک سے کسی قسم کی مزاحمت بھی نہیں ہوگی۔ چونکہ اُن کا مطمحِ نظر "ملک گیری" نہیں ہوگا۔ بلکہ محض بے لوث خدمت ہوگا۔ اور ایک ایسے پیغام کی تبلیغ ہوگا۔ جو عوام الناس کے لئے نہ صرف انوکھا ہوگا۔ بلکہ بیحد دلچسپ مفید اور کارآمد ہوگا۔ اور یہ صرف "خدا کی معرفت" کا پیغام ہوگا۔ جو سلیم الفطرت لوگوں کیلئے اپنے اندر اتنی جاذبیت رکھے گا۔ کہ اُن کو دُنیا کے تمام فلسفے ہیچ نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ موجودہ سائنس کی بہترین ایجادات بھی محض "بازیچۂ اطفال" معلوم ہوں گی! یہ اس لئے کہ جو لوگ زمین پر بیٹھے چاند کو شق کر سکتے ہیں۔ اُن کے لئے چاند پر چھلانگیں لگانے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

Marfat.com

ظاہر ہے۔ کہ یہ بہت دُور کی باتیں ہیں ۔ لہٰذا ہم اپنے ماحول میں آئیں ؛

جہاں تک ہمارے اپنے مُلک کا تعلّق ہے۔ اِس وقت ہمارے سامنے دو نہایت اہم مسئلے ہیں ؛ ایک یہ کہ ہم پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم کرتے ہیں؟ (گویا جس اِسلام کے نام پرُ ملک کی تقسیم کی گئی تھی۔ اُس کو یہاں کس طرح نبھایا جاتا ہے؟) اور دوسرے جن مُسلمانوں کو ہم پیچھے بھارت میں چھوڑ آئیں ہیں۔ اُن کا حشر کیا ہوتا ہے؟

جہاں تک مُوخرالذکر سوال کا تعلق ہے۔ اِس سلسلہ میں جس بات کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ سپین میں ہم نے آٹھ سَو سال حکومت کی لیکن اِس وقت وہاں ایک بھی مسلمان موجود نہیں ہے! کیا ہم یہ چاہتے ہیں۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو ایک دفعہ پھر دُہرائے۔ اور ہماری آنکھیں صرف اُس وقت ہی کھُلیں۔ بھارت کے چھ کروڑ مسلمانوں کا حشر وہی ہو۔ جو حال ہی میں احمد آباد کے مسلمانوں کا ہُوا ہے؟

لہٰذا اِس وقت جس بات کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ تمام معاملہ کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ محض سیاسی نقطۂ نگاہ سے نہیں ؛ مثال کے طور پر ہم اپنی کانفرنسوں میں اگر رُوس یا چین کو نہ بلائیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن رُوس اور چین کے مسلمانوں کے نمائندوں کو نہ بلانا۔ کوئی عقلمندی کی دلیل نہیں ؛

جن ممالک میں مسلمان خود مختار نہیں ہیں۔ اُن کے نمائندوں کو نہ بُلا کر ہم بھارت کو تو زک دے سکتے ہیں لیکن بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اور نہ ہم اِس طرح دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے کوئی اچھا سلوک کرتے ہیں۔ جو خود مُختار نہیں ہیں ؛

اِس قسم کے مُلکوں کے مسلمان خود جو اپنے حالات کے متعلق معلومات مُہیّا کر سکتے ہیں۔ نہ اُن مُلکوں کے اخبارں سے ہمیں اِن کی بابت علم ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہمارے سفیر اِس سلسلہ میں مُفید ہو سکتے ہیں ؛

یہاں جو نکتہ صاف طور پر ذہن نشین کرانا مقصود ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ اگر ہم نے بھارت کو ہمیشہ زک دے کر اپنے دل کی تسلی تو کر لی۔ لیکن اُس کا اثر بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی صورت

Marfat.com

نکلا۔ تو ہم معاملہ کو سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھ کر وقتی طور پر اپنا دل تو خوش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی پالیسی کے جو نتائج احمد آباد کے فسادات کی صورت میں نکلتے ہیں۔ اُن کو اُن کے صحیح رنگ میں دیکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اگر ہم ہر معاملہ کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے۔ تو ہم کوئی بھی اس قسم کا قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ جس سے بھارت کے مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہو۔ اگر صرف اس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ تو آہستہ آہستہ صورتِ حالات کے بہتر ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے۔ کہ ہم بھارت اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے نمائندوں سے براہِ راست ملنے کے مواقع پیدا کریں۔ اُن کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا' معاملات کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن ہم اس وقت تک معاملات کو صرف سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے ہی عادی ہیں۔ جو ہرگز کافی نہیں ہے!

مثال کے طور پر بھارت میں آج کل ایک وبا چل رہی ہے۔ کہ وہاں کے مسلمانوں کو "بھارتی" کر لیا جائے! چنانچہ اس سلسلہ میں حال ہی میں ایک صاحب نامی بھوپندر گپتا نے نئی دہلی کی راجیہ سبھا میں یہ سوال اُٹھایا ہے۔ کہ "مسلمانوں کو بھارتی کرنے" والے نعرہ پر قانونی طور پر پابندی عاید کر دی جائے۔ اُس سبھا کے ایک دو

Marfat.com

اور ممبروں نے بھی مسٹر گپتا کی تائید کی ہے۔ جن کے نام سی پڑھی گپتا اور ودیا چرن شکلا ہیں :- لیکن اسی بحث میں "جن سنگھ" کے ایک ممبر نامی بھائی بہادر نے مجوزہ قانونی پابندی کے سلسلہ میں کہا کہ بایں ہمہ بھارت میں کچھ مسلمان ایسے ضرور ہیں۔ جو بھارت کی بجائے پاکستان کے زیادہ وفادار ہیں!" (دیکھو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۱۳ / مارچ ۱۹۷۰ء) :-

اب اس سلسلہ میں ہمیں بھارت کے مسلمانوں کے نمائندوں کی قائداعظمؒ کے اُس زرین اصول کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ جو اُنہوں نے اس ملک کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے وضع فرمایا تھا :

۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی ایک تقریر میں قائداعظمؒ نے کچھ اس قسم کے الفاظ ارشاد فرمائے :-

"اب ہم آزاد ہیں :- ہندو شوق سے اپنے مندروں میں جائیں۔ اور مسلمان اپنی مسجدوں میں :- ایک انسان کا مذہب خواہ کچھ ہی ہو۔ اس کا حکومت کے کام سے کوئی تعلق نہیں :- آئندہ زمانہ میں ایک دن ایسا آئے گا۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں۔ چونکہ یہ تو ہر ایک کا نجی یا شخصی معاملہ ہے۔ بلکہ سیاسی نقطۂ نگاہ سے یا اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے!"

ان الفاظ میں بجد گہرائی ہے :- اس کے علاوہ اقلیتوں کے بارہ میں ایک سمجھوتہ یہ بھی ہے۔ کہ ہر اقلیت اپنے اپنے ملک کی وفادار رہیگی :- اگر ان اصُولوں کو اپنا لیا جائے۔ تو ہماری بہت سی مشکلیں آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان اصُولوں پر عمل کرنے سے "جن سنگھ" والوں کی تحریک کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے!

مندرجہ بالا حالات میں ہمیں دو سبق ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمام غیر مسلموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیئے :- گویا "جن سنگھ" کے ممبروں اور مسٹر گپتا اور شکلا جیسے لوگوں میں ہمیں تمیز کرنی چاہیئے۔ اور دوسرے قائداعظمؒ کے مندرجہ بالا اصُول ہم سب کے لئے چراغِ راہ بننے چاہئیں :-

---

Marfat.com

ایک دوسری بات جس کا یہاں سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں "اسلام دوستی" کا بھی ثبوت دیں ۔ اس وقت تک ہم نے صرف " وطن دوستی " کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق ہمارا اپنا ہی فتویٰ یہ ہے۔ کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے !

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے !

لہٰذا ہمیں اپنے دماغوں سے اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہیئے۔ کہ اپنی " اسلام دوستی " کا ثبوت مہیا کرنے کیلئے ہماری صرف " وطن دوستی " ہی کافی ہے ! " اسلام دوستی " کی پڑتال مسجد کی حاضریوں سے کی جائے گی۔ اسمبلیوں کی حاضری سے نہیں !

باب چہارم میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہر روز صبح و شام تمام انسانوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کو ہر صبح اس بات کا علم ہوتا ہے۔ کہ پاکستانیوں میں سے کتنے مسلمانوں نے صبح کی نماز کا وقت اپنے گھروں اور بستروں میں گزارا اور کتنے لوگوں نے مسجدوں میں ۔ اور حضورؐ کو اسی طرح ہر شام کو بھی یہ اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ کہ کتنے پاکستانی مغرب کی نماز کے وقت مسجدوں میں تھے۔ اور کتنے گھروں۔ باغوں یا سینماؤں میں تھے ؟ ان وجوہ کی بنا پر اگر قدرت کسی ملک کے بے راہ لوگوں کو اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ[1] کے الفاظ سے تنبیہ کرے ۔ تو اچنبھے کی بات نہیں ۔

لیکن اس وقت ہمارا ذہن جس رخ کی طرف کام کر رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پاکستان کی سالمیت کا راز اول تو مسلمانوں کے اتفاق میں ہے۔ دوسرے فوج مضبوط ہونی چاہیئے ۔ تیسرے مرکزی حکومت کے پاس فلاں فلاں اختیارات ہونے چاہئیں۔ چوتھے حکومت کی بنیاد سوشلزم کے طریقوں پر ہونی چاہیئے۔ پانچویں سائنس کے علم کو تعلیم کی روح تصور کرنا چاہیئے۔ وغیرہ۔ وغیرہ ۔ ان تمام تجویزوں میں جسم کی سالمیت کو ہی ملحوظ رکھا جا رہا ہے۔ روح کی سالمیت کا اول تو ذکر ہی نہیں۔ لیکن اگر ہے۔ تو وہ جمہوریت۔ مساوات۔ بردباری اور سماجی انصاف کے اصولوں تک محدود ہے۔ اس کے آگے نہ کسی کی نظر ہے۔ اور نہ پہنچ اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔ ؎

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے !

---

[1] سورۃ ۸۵ البروج آیت ۱۲ ۔ بیشک میرے رب کی گرفت بہت سخت ہے ۔

Marfat.com

باقی جہاں تک علماء کا تعلق ہے۔ اُنہوں نے "متقی" بننے کی تاکید تو کی۔ خدا اور رسول کو ماننے پر بھی زور دیا۔ لیکن هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ[1] کے راز سے ناآشنا رہے:: اگر ایک انسان اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کی شروع کی آیت کا مطلب بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ اُس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے ؎

او کہ خود گُم است کرا رہبری کُند؟

اب صحیح معنوں میں رہبری کا حق چونکہ صرف اولیائے کرام ہی ادا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب تک "طائرانِ حرم" کے ظہور کا وقت نہیں آتا۔ ہم کم از کم اِتنا تو کریں۔ کہ جو کچھ اُنہوں نے سچ مُچ کر گزرنا ہے۔ ہمارا اُس پر محض ایمان ہی ہو۔ تاکہ ہمارے تخیل کا رُخ اُن کی افتاد کے ہم آہنگ ہو!

"طائرانِ حرم" کا مقصد صرف یہ ہوگا۔ کہ رُوحانیت کی جس معراج پر وہ خود پہنچے ہوئے ہیں۔ وہاں پر تمام سلیم الفطرت لوگوں کو بھی پہنچادیں۔ اُنہوں نے دُنیا کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔ کشش صرف محبت میں ہوتی ہے۔ نفرت میں نہیں ہوتی۔

محبت کیا چاہتی ہے؟ کہ دُنیا جہان کے تمام غیر مسلموں کو "ابوجہل" ہی سمجھا جائے! جس طرح پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اِس دُنیا میں سینکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں ایسے انسان ہیں۔ جو اِس وقت "صالح" تو ہیں۔ (گویا وہ توحید پرست اور اخلاقِ حسنہ کے پابند تو ہیں، یا بالفاظِ دیگر اُن میں "جوہرِ قابل" تو موجود ہے) لیکن وہ ابھی اِسلام نہیں لائے ::

اِس وقت تک اگر اُن کی حالت سُدھر نہیں سکی۔ تو اُس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ وہ لوگ ناقابلِ سُدھار ہیں۔ بلکہ اب تک اُن کو کوئی "دانائے راز" نہیں ملا:: اِس وقت تمام غیر مسلم دُنیا کو جو ہم "ابوجہل" ہی سمجھ رہے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اِس نکتہ کو نظر انداز کیا ہے۔ کہ تبع تابعین تک عام حالت یہ تھی۔ کہ جس کسی "دانائے راز" کو کہیں "جوہرِ قابل" ملتا تھا۔ وہ ایک نظر میں اُس کو "منزلِ مقصود" پر پہنچا دیتا تھا:: جو باقی بچتے تھے۔ وہ واقعی "ابوجہل" ہوتے تھے:: تبع تابعین کے بعد سب "طائرانِ حرم" چونکہ پوشیدہ ہوگئے۔ اِس لئے غیر مسلموں میں اِس وقت جتنے بھی "جوہرِ قابل" ہیں۔ اب وہ بغیر کسی "ہادی" کے ہیں۔ اُن کو کوئی "منزلِ مقصود" پر پہنچانے والا ملا ہی نہیں۔ اب اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں::

---

[1] اس کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۱::

Marfat.com

غرض اس تمام بحث کا لُبّ لباب یہ ہے۔ کہ ربّ العزت کے اُن احسانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو اُس نے ہم پر پاکستان جیسا مُلک عطا کرنے کے سلسلے میں کئے ہیں۔ اگر ہم نے اب بھی بصیرت سے کام نہ لیا اور سب فیصلے صرف "سیاسی" نقطۂ نگاہ سے ہی کرتے رہے۔ اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ ہمارا رویہ

دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز

ہی رہا۔ گویا ہم نے "محمدؐ سے وفا" کا حق ادا نہ کیا۔ تو "مُہلتؔ" کے گزرنے پر ہمارے سامنے دو خطرناک اندیشے ہیں:۔

اوّل "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ" کی وعید! اور

دوم یہ کہ جو ڈیوٹی اس وقت ہمارے ذمّہ ہے۔ وہ کسی اور بہتر قوم کو نہ سپرد کر دی جائے!

چنانچہ اس سلسلہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے:۔

"اے ایمان والو! تم میں جو کوئی دین سے پھرے گا۔ تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لے آئے گا۔ کہ وہ اللہ کے پیارے اور اللہ اُن کا پیارا......" (سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۵۴)

اِن سے بھی زیادہ سخت الفاظ مندرجہ ذیل آیت میں ہیں! (سورۃ ۴۷، محمدؐ۔ آیت ۳۸):

"اور اگر تم مُنہ پھیرو گے تو وہ تمہارے سوا اور لوگ بدل لے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے"!

گویا جب تک ہم معاملات کو:۔

(۱) محض "سیاسی" نقطۂ نگاہ سے ہی نہیں۔ بلکہ "نفسیاتی" نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور

(۲) صرف "وطن دوستی" ہی نہیں بلکہ "اسلام دوستی" کا بھی عملی ثبوت نہیں دیں گے

ہم اُس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جو ہم نے پاکستان بنا کر لازمی طور پر (لیکن بکمال خوشی) اپنے ذمّہ لیا تھا!

لہ حضرت قائدِ اعظمؒ نے جو کارنامہ انجام دینا تھا۔ وہ پچھتر ۷۵ فی صد باحسن وجوہ پورا فرما گئے ہیں۔ باقی پچیس ۲۵ فی صدی ہمارے ذمّہ ہے۔ اِس کے لئے ہمیں پچیس ۲۵ سال ملتے ہیں یا کچھ سال اور، اِس کی بابت تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ اَمر یقینی ہے۔ کہ قدرت کی مقرر شُدہ "مُہلت" گزرنے کے بعد ہمارا امتحان ہوگا؛ اُس وقت قُدرت یہ نہیں دیکھے گی۔ کہ اِس مُلک میں ٹیکسٹائل ملز کتنی کُھل چکی ہیں۔ یا کتنے گھروں میں بجلی لگ چکی ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جائے گا۔ کہ ہماری "اسلام دوستی" کا معیار کیا ہے؟ اگر ہم اُس میں پورے اُترے۔ پھر تو "کشمیر" کیا، "لوح و قلم" ہمارے ہیں۔ لیکن اگر اُس میں ہم خدانخواستہ پورے نہ اُترے۔ تو پھر یہ نہ ہو۔ کہ "کعبہ کو دُنیا کے مختلف "صنم خانوں" سے تو "پاسبان" مل جائیں۔ لیکن ہم اُس کے اہل نہ سمجھے جائیں! یہ واضح رہے کہ اس "امتحان" یا "معیار" میں سب سے پہلے "صدق" اور "عدل و احسان" آتے ہیں۔ اور آخر میں "اپنے نفس کی پہچان" یا بالفاظِ دیگر "ربّ العزت کا عرفان"!

Marfat.com

دُنیا کی موجودہ بے رہروی کی تہ میں یہ بات بھی ہے ۔ کہ پہلے زمانوں میں انسان کا "عدو مبین" بھونڈے حربے استعمال کرتا رہا ہے ۔ تاکہ دُنیا کے لوگ جھوٹ، فریب اور ظلم کے مخمصوں میں پھنسے رہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا ۔ کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا، اور ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا ہوتا تھا ۔ اب اُس نے ان بھونڈے حربوں کا استعمال تقریباً ترک کر دیا ہے ۔ اب ہر قوم سلیقہ شعار ہے ۔ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کو بُری نظر سے دیکھا جا رہا ہے ۔ اب انسان کے "عدو مبین" نے چال یہ چلی ہے ۔ کہ دل جو عشقِ الٰہی کی آماجگاہ ہے ۔ اُس کو تو محض "خون کے دوران کا آلہ" سمجھا جائے ۔ اور دماغ جو خیر و شر میں تمیز ہی نہیں کر سکتا ۔ اُس کی دنیوی علوم سے نشو و نما کی جائے ۔ تاکہ ایک انسان مادی ترقی کے لحاظ سے تو بیل گاڑی سے خلائی جہاز تک پہنچ جائے ۔ لیکن جہاں تک ایمان و عشق کی نورانیت کا تعلق ہے ۔ اُس لحاظ سے وہ بالکل کورے کا کورا ہی رہے !

اب سوال صرف یہ ہے ۔ کہ یہ کاٹھ کی ہنڈیا کب تک چڑھی رہے گی ؟ اس سوال کا صحیح جواب تو غالباً کوئی نہیں دے سکتا ۔ کہ جس "نئے دَور" کا ان صفحات میں ذکر کیا گیا ہے ۔ وہ پانچ سال کے عرصہ میں شروع ہو گا ۔ یا پچاس سال کے بعد ۔ لیکن جس تیز رفتاری سے دُنیا کے حالات بدل رہے ہیں ۔ اُن سے تو معلوم ہوتا ہے ۔ کہ "صورِ اسرافیل" بانگِ دُہل پکار رہا ہے ؎

اُٹھو ! زمانہ "چال" "قیامت" کی چل گیا !

لہٰذا جس قوم کے پاس خدا کا "آخری حرف" موجود ہے ۔ اُس کا یہ فرض ہے ۔ کہ وہ انسان کے "رقیب" کی ریشہ دوانیوں کا پوری طرح جائزہ لے ۔ تاکہ بنی نوع انسان ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں کٹھ پُتلی ہی نہ بنی رہے !

ان حالات میں ہمارا کم از کم فرض یہ ہے ۔ کہ جب تک "نیا دَور" نہیں آتا ۔ ہم اپنا عقیدہ وہ رکھیں ۔ جس طرف قرآن کے الفاظ ہمیں لے جائیں ۔ خواہ وہ عقیدہ موجودہ زمانہ کی روش کے بالکل خلاف ہی ہو ۔ چونکہ اس روش کے حق میں ہمارے پاس سوائے اپنے "ظن" یا "ھویٰ" کے کوئی سند نہیں اور قرآن کے صحیح مفہوم کے لئے ہمارے پاس "ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ" کی اٹل سند موجود ہے !

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ اگر انسانی مقصدِ حیات واقعی "خدارسیدگی" ہے۔ تو موجودہ حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ آخر کار اس منزل پر کتنے فیصدی لوگ گامزن ہو سکیں گے؟ اس سوال کا جواب صرف اس بات پر منحصر ہے۔ کہ جب رب العزت نے "فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ"[1] کے خیال کا اظہار فرمایا۔ تو اُس وقت مشیّتِ ایزدی کیا تھی۔ کہ کتنے فیصد لوگ اس منزل پر پہنچیں؟

یہ ظاہر ہے۔ کہ مشیّتِ ایزدی یہ تو نہیں ہو سکتی۔ کہ اتنی بڑی دُنیا بنانے کے بعد اور اُس کی اتنی صدیاں پرورش کرنے کے بعد اُس کا لُبِّ لباب یہ نکلے۔ کہ کروڑوں اور اربوں انسانوں میں سے صرف چند نفوس اس منزل کو پہنچیں۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کے درمیان صدیوں کے وقفہ کے بعد! لہٰذا انسان کی عام سُوجھ بوجھ یہ چاہتی ہے۔ کہ دُنیا کے لوگوں کی بہت سی اکثریت اس اعلیٰ وارفع منزل پر پہنچے! چنانچہ قرینِ قیاس یہی معلوم ہوتا ہے!

اب جہاں تک ہمارے اپنے ملک کا تعلق ہے۔ چونکہ ہمارا یہاں تہیّہ یہ ہے۔ کہ ہم نے ایک مثالی حکومت قائم کرنی ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے۔ کہ ہم پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ کہ انفرادی طور پر ہمارا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور اجتماعی طور پر ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

اسی لئے ان اوراق میں کوشش یہ کی گئی ہے۔ کہ کم از کم اسلام کی تھیوری theory ایک سلیس انداز میں بیان ہو جائے۔ تاکہ اس مذہب کے فلسفہ کا ایک "خاکہ" سا نظروں کے سامنے آجائے۔ (فقہی مسائل کا ان اوراق میں کوئی ذکر نہیں)۔

آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اسلام کے بارہ میں جتنے بھی مختلف لوگوں کے نظریوں کا ان اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ میں اُن میں سے کسی کے خلوص کو بھی شک کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ البتہ اگر اعتراض ہے۔ تو وہ صرف اس بنا پر ہے۔ کہ اُن کے نظریوں میں "سخن شناسی" نہیں پائی جاتی۔[2]

---

[1] پس میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔ (حدیثِ قدسی)۔

[2] گویا یہ سب حضرات "سکول سٹیج" کے لحاظ سے تو سو میں سو نمبر لے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک "کالج سٹیج" کا تعلق ہے۔ یہ اُن کی نظر سے ابھی تک بالکل ہی اوجھل ہے!

Marfat.com

جس طرح کہ اِن صفحات کے بالکل شروع میں لکھا گیا ہے۔ اسلام کا تعلق محض "عشق" سے ہے۔ اور "عشق" سرتاپا جذبہ ہی جذبہ ہے۔ لیکن قربان جائیے۔ اُس خاتم النبیین صلعم پر جس نے "عشق" جیسے سرتاسر جذبہ کو "صدق" کے رُوپ میں ڈھال دیا۔ اور "صدق" حساب کے سوالوں کی طرح ہے۔ جس میں ایک انسان چار جمع چار کو آٹھ کہنے پر مجبور ہے! اب اِس ۴ + ۴ کو کوئی خواہ —

	۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱	کہے
یا	۲ + ۲ + ۲ + ۲	کہے
یا	۴ × ۲	کہے
یا	۵ + ۳	کہے

اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ البتہ فرق اُس وقت پڑتا ہے۔ جب کوئی ۴ + ۴ کو ۷ یا ۹ کہے۔ اور اُس کو پھر درست بھی سمجھے!

اِس قسم کی صورتِ حالات اس وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ کہ آج کل کے زمانہ میں خود ارادیت self-determination کی ایک ایسی مرض چلی ہے۔ کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے۔ کہ اُس کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے کسی بات کو مروڑ لے: مجھے اس بات سے انکار نہیں۔ کہ ہر شخص کو یہ واقعی حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن ۴+۴ کو ۷ یا ۹ کہنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا! اسی لئے "صدق" کے سلسلہ میں ووٹ نہیں لئے جا سکتے! مثلاً اگر ۹۹ آدمی یہ کہیں۔ کہ ۴ + ۴ نَو ہوتے ہیں۔ اور صرف ایک آدمی کہے۔ کہ یہ آٹھ ہوتے ہیں۔ تو ایک آدمی کی تو سُنی جائے گی۔ باقی ۹۹ آدمیوں کی بات کو رَد کر دیا جائے گا: "صدق" کی صورت بھی یہی ہے:

اِسی لئے میں نے اِن صفحات میں صرف وہی امُور لئے ہیں۔ جہاں اسلام کی دُنیا آج کل ۴ + ۴ کو ۷ یا ۹ کہہ رہی ہے۔ اور اُسے درست بھی سمجھ رہی ہے! کل کی دُنیا اِس کو قبول نہیں کرے گی!

اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو میں نے اِن صفحات میں کوئی خاص نئی بات نہیں کہی: اگر علامہ اقبال کے اشعار کی

Marfat.com

نثر کی جائے۔ یا تفسیر لکھی جائے۔ تو وہ کم و بیش تقریباً وہی ہوگی جو کچھ اِن اوراق میں لکھا گیا ہے :: البتہ علامہ اقبال کے اشعار کی وہ نثر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو اُنہوں نے اپنے مدراس والے لکچروں میں اُن امُور کے بارہ میں لکھا ہے۔ جن پر اِن صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے ::

غرض اس وقت ضرورت اِس امر کی ہے۔ کہ ہم اسلام کو "محمدؐ" کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کریں "موجودہ مسلمانوں" کے نقطۂ نگاہ سے نہیں !

آج کی دُنیا "زباندانی" کی دُنیا ہے۔ کل کی دُنیا "سُخن شناسی" کی دُنیا ہوگی ؟

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ [1]

بایں ہمہ پُرگناہ تو دریائے رحمتی
جائیکہ فضلِ تست چہ باشد گناہِ ما !

---

[1] یعنی عبرت لے لو ! اے نگاہ والو :: (سورۃ ۵۹ الحشر، آیت ۲)

Marfat.com

صفحہ ۱۴۲ کا حاشیہ یہ ہے :-

لہ : یہاں ایک نہایت ضروری نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ اِس فصل میں "دِل" سے دَراصل مُراد "رُوح" ہے ؛ "دِل" کا لفظ اِس لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ کہ "رُوح" کا صدر مُقام (یعنی ہیڈ کوارٹر) "دِل" ہے ؛ اِسی لئے حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے ۔ کہ اِنسان کے جسم کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے ۔ اگر وہ دُرست ہو، تو سارا جسم دُرست ہوتا ہے ۔ لیکن اگر وہ خراب ہو، تو تمام جسم خراب ہوجاتا ہے ۔ اور وہ لوتھڑا اِنسان کا "دِل" ہے !

اَب "دِل" سے مُراد "رُوح" اِس لئے ہے ۔ کہ جب ایک اِنسان دیکھتا ہے، یا سُنتا ہے، تو حقیقت میں یہ اِنسان کی "رُوح" ہی ہے ۔ جو دیکھتی یا سُنتی ہے ؛ اِسی وجہ سے جب کوئی شخص فوت ہوجاتا ہے ۔ تو آنکھ اور کان ہونے کے باوجود نہ وہ دیکھ سکتا ہے اور نہ سُن سکتا ہے ؛ اِسی طرح جب ایک اِنسان کے قلب پر سیاہ دَاغ یا روشن نشان پڑتے ہیں، تو یہ بھی حقیقت میں "رُوح" پر ہی پڑتے ہیں ۔ اِسی لئے آجکل کے سائینسدان اُن کو دُوربینوں کے ذریعہ بھی دیکھ نہیں سکتے ! بالکل اِسی طرح خیر و شر میں تمیز بھی اِنسان کی "رُوح" ہی کرتی ہے، جس کو عام طور پر "ضمیر" کے نام سے پُکارا جاتا ہے ؛ "ضمیر" کا مُقام بھی "دِل" اِس لئے کہا جاتا ہے ۔ کہ "رُوح" کا صدر مقام "دِل" ہے ! لہٰذا اِس فصل (بلکہ تمام کتاب) میں جہاں کہیں بھی رُوحانی نقطۂ نظر سے "دِل" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ وہاں اِس سے مُراد "رُوح" ہی ہے !

اَب یہ دُنیا صرف "رُوح" کا کھیل ہی ہے ! اِس رُوح کو "نفس" بھی کہتے ہیں ؛ اِس کی کیفیات مختلف ہیں ؛

جب تک رُوح "محجُوب" رہتی ہے ۔ تب تک یہ "نفسِ امّارہ" کے حُکم کے تحت رہتی ہے ؛ (یعنی وہ نفس جو بُرائی کی طرف مائل رہے) ؛

جب رُوح سے کچھ "حجاب" اُٹھ جاتے ہیں ۔ پھر یہ "نفسِ لوّامہ" کے زُمرہ میں آتی ہے ؛ (یعنی گناہ سرزد ہونے کے بعد اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے والا نفس) ؛

اور جب رُوح سے سب "حجاب" اُٹھ جاتے ہیں ۔ پھر قرآن اِسے "نفسِ مطمئنّہ" کے نام سے یاد کرتا ہے ! (یعنی ایسا نفس جو اپنے رَبّ سے راضی ہو ۔ اور رَبّ اُس سے راضی ہو !) ؛

عارفین یا اولیائے کرام اِس آخری ضمن میں آتے ہیں ! اور مقصدِ حیات بھی یہی ہے ۔ کہ ایک اِنسان مرنے سے پہلے پہلے اِس مُقام پر پہنچے ! قرآن ایسے اِنسان کو "مُسلم" کے نام سے یاد کرتا ہے ! (دیکھیں صفحات ۱۴ تا ۵۲) ؛

اَب جب کہ "دِل" کے موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے ۔ آخر میں اِس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا ۔ کہ آجکل کے سرجن جب ایک مریض کے فرسُودہ دِل کو نکال کر اُسے ایک فوت شُدہ شخص کے دِل سے بدل دیتے ہیں ۔ تو اُس وقت صرف

Marfat.com

"خُون کے دَوران کا آلہ" ہی بدلا جاتا ہے ۔ اور کچھ نہیں ؛

ایسے موقعوں پر بعض حضرات یہ کہتے سُنے گئے ہیں ۔ کہ دِل کو چونکہ "احساسات اور تاثُّرات" کا خزینہ کہا جاتا ہے ۔ لہٰذا اس طرح دِل کو تبدیل کر دینے کی وجہ سے مریض کے "احساسات و خیالات" بالکل ویسے ہو جانے چاہئیں ، جیسے کہ فوت شدہ شخص کے تھے ؛

ایسے موقعوں پر اس قسم کے حضرات اس بات کو بھُول جاتے ہیں ۔ کہ (جس طرح اوپر کہا گیا ہے) مریض میں جو تبدیلی کی جاتی ہے ۔ وہ صرف "خُون کے دَوران کے آلہ" کی ہی کی جاتی ہے ، فوت شُدہ شخص کی رُوح یا ضمیر کو مریض کے جسم میں داخل نہیں کیا جاتا ؛ لہٰذا جہاں تک رُوح یا ضمیر کا تعلق ہے ۔ وہ مریض کی اپنی ہی رہتی ہے ؛ اسی وجہ سے اُس کے "احساسات، تاثُّرات اور خیالات" میں فرق نہیں آسکتا ؛

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے ۔ کہ دِل کی دُو خصوصیات ہیں ۔ ایک یہ کہ اِس سے "خُون کا دَوران" ہوتا ہے ۔ دوسرے اس میں جو "خیالات اور احساسات" ہوتے ہیں ۔ وہ "رُوح" کے ہی ہوتے ہیں ۔ جس کا صدر مُقام اِنسان کا دِل ہے ۔ (اِن کا "گوشت کے لوتھڑے" سے کوئی تعلق نہیں) ؛

بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ سماعت و بصارت کے لئے کان اور آنکھ صرف "ذرائع" کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔ اِن کا منبع "رُوح" ہی ہے ؛ اِسی طرح "احساسات و تاثُّرات" کے لئے "دِل" ایک "ذریعہ" ہے ۔ اِن کا حقیقی منبع "رُوح" ہی ہے !

اِک لُطف کی نظر ہے علاجِ شکستہ دِل

جُڑ جاتا ہے یہ آئینہ سَو بار ٹوٹ کے !

ف : اِس سے مراد "گوشت کا لوتھڑا" نہیں ہے ۔ بلکہ یہاں بھی "دِل" دراصل "ضمیر و رُوح" کا ہی دوسرا نام سمجھا

Marfat.com

تتمّہ

نوازشِ دلِ ما کُن کہ دِلنواز تُوئی !

بساز کارِ غریباں کہ کارساز تُوئی !

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی !

رَبَّنَا بَدِّل سَیِّئٰتِنَا بِالحَسَنَاتِ

(اے ہمارے رَبّ ہماری بُرائیوں کو نیکیوں سے بدل دے !)

مطبع : پیکو آرٹ پریس لمیٹڈ۔ لاہور ،

Marfat.com

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۱	آخری سطر	چھپا ہوا ہوا ہے ؛	چھپا ہوا ہے ۔
۵۶	سطر ۳	صدیقؓ	صدیق رضؓ
۵۸	سطر ۲	یَلُوْنَھُمْ	یَلُوْنَھُمْ [1]
۶۶	سطر ۸	اُڑانا	اُڑنا
۸۰	آخری سطر	دیا گیا	گیا
۹۳	آخری سطر	ھُوَ اللّٰہُ اَحَد	ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ [1]
۹۹	آخری سطر (حاشیہ کی)	قرآن قریم	قرآن کریم
۱۱۳	سطر ۵	کرائیں	کرائیں)۔
۱۱۵	سطر ۴ (نیچے سے)	قَلیٰ [1]	قلیٰ [2]
۱۱۵	سطر ۲ (نیچے سے)	مِنَ الْاُوْلیٰ [2]	مِنَ الْاُوْلیٰ [3]
۱۱۵	سطر ۲ (حاشیہ کی)	[1]	[2]
۱۱۵	سطر ۳ (حاشیہ کی)	[2]	[3]
۱۱۶	سطر ۳	چشمِ فیض رس	چشمِ فیض رسؔ
۱۱۷	سطر ۱ (حاشیہ کی)	مقیاسِ حقیقت	مقیاسِ حنفیّت
۱۱۸	سطر ۸ (نیچے سے)	شایع ہوا ہے ؛	شایع ہوا ہے ۔
۱۳۰	سطر ۷	دیکھا	دیکھا کر
۱۳۲	آخری سطر	ضلالت کہ تہ	ضلالت کی تہ
۱۳۷	سطر ۵	تبدیلی	تبدیل
۱۴۱	سطر ۷ (نیچے سے)	فرماتا	فرمایا
۱۴۳	سطر ۸ (نیچے سے)	وجہ سے یہ ہے	وجہ یہ ہے
۱۴۵	سطر ۴	نیکی کرداری	نیک کرداری
۱۴۵	سطر ۱۰	نیکی کرداری	نیک کرداری
۱۴۷	سطر ۸ (نیچے سے)	مُراد ہے۔	مُراد

Marfat.com

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۱	سطر ۱۱ (نیچے سے)	برہنا	برہمنا
۱۹۱	سطر ۹ (نیچے سے)	برہنا	برہمنا
۱۹۱	آخری سطر	وڑ	مروڑ
۱۹۸	سطر ۸ (نیچے سے)	ضرور خیال کیا	ضروری خیال کیا
۲۰۱	سطر ۷ (نیچے سے)	وہبانیت	رہبانیّت
۲۰۸	آخری سطر	ایمان ہے	ایمان ہے) ؛
۲۰۸	آخری سطر (حاشیہ کی)	واپس کرکئے جائیں ؛	واپس کئے جائیں ؛
۲۱۹	سطر ۴ (نیچے سے)	درست	دُرست نہیں
۲۲۲	سطر ۱۱	قائل ہوے ہیں ؛	قائل ہوتے ہیں ؛
۲۲۲	سطر ۲ (نیچے سے حاشیہ کی)	رہوُں گی !	رہوُں گی ! *
۲۴۸	سطر ۱	احکام، کے	احکام،
۲۴۹	سطر ۲ (نیچے سے حاشیہ کی)	الفاظ	الفاظ کی
۲۵۸	سطر ۱۰	کہ جس	جس
۲۶۲	سطر ۱۴	قیضِ نظر	فیضِ نظر
۲۸۴	سطر ۱۰	چشمِ روشن	چشم روشن
۲۸۸	سطر ۳	بیں جاتا ہے ۔	بن جاتا ہے۔
۲۸۹	سطر ۱۳	ملینگیے !	ملینگی !
۲۸۹	سطر ۷ (نیچے سے)	نہیں گے	نہیں گئے
۲۹۸	سطر ۶	چُنانچہ "نُورِ مُصطفوی" ہر لحظہ	اور یہ اہلیّت چُونکہ صرف "عشق" میں ہی ہے۔ لہٰذا "نُورِ مُصطفویؐ" ہر لحظہ"
۳۲۱	سطر ۳	"مشین کا زمانہ" کی	"مشین کے زمانہ" کی
۳۲۴	سطر ۷ (نیچے سے)	زِک	زَک

Marfat.com

"صحت نامہ"

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہمیں جو "المیہ" مشرقی پاکستان" کے سلسلہ میں پیش آیا ہے۔ اور اُس کے نتیجہ کے طور پر جس خفّت کا ہمیں سامنا کرنا پڑا ہے۔ اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے۔ وہ بالکل ایک فطری اَمر ہے۔ لیکن اس کے باوجود پریشان دہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس لئے کہ ؎

تو نہ مِٹ جائے گا ایران کے مِٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!

اسلام کی آئیڈیولوجی[1] "مُلک گیری" نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا تمام راز "براہیمی ایمان"[2] میں مضمر ہے۔ تاکہ انفرادی طور پر یہ ایمان "خُدا کی معرفت" پر اور اجتماعی طور پر "خلافتِ الٰہیہ"[3] کے ظہور پر منتج ہو!

اِس وقت ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ موجودہ مغربی سلطنتوں کو نہ تو اپنے اپنے مُمالک کے رقبہ کی وسعت پر ناز ہے۔ اور نہ وہ مَردم شُماری کے لحاظ سے اپنی تعداد پر فخر کر رہے ہیں؛

اُن کو اگر کسی بات پر ناز ہے۔ تو وہ دو چیزوں پر ہے؛ پہلی چیز جس پر اُن کو فخر ہے۔ وہ اُن کی اپنی طرزِ حکومت ہے؛ مثال کے طور پر رُوس یہ چاہتا ہے۔ کہ دُنیا کے مُمالک کی طرزِ حکومت کمیونسٹ طریق پر ہو۔ لیکن امریکہ چاہتا ہے۔ کہ سب مُلکوں میں جمہوریّت قائم ہو؛

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ باوجود اِن دو مختلف قسم کی حکومتوں کے نظاموں کے، اِن دونوں مُلکوں (یعنی رُوس اور امریکہ) کی "دُھن" (یعنی آئیڈیولوجی) ایک ہی ہے۔ اور اِس "دُھن" میں برطانیہ۔ فرانس اور جرمنی وغیرہ کے علاوہ چین تک سب برابر کے شریک ہیں؛

اور یہ "دُھن" کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ "ذرّات کی معرفت"[4] حاصل کریں۔ اور اِس معرفت کی "دُھن" وہ دوسری چیز ہے۔ جس پر مغربی مُمالک کو اپنی طرزِ حکومت سے بھی زیادہ ناز ہے!

---

[1]: Ideology (نظریۂ حیات)؛

[2]: جو اگر آج براہیم کا ایمان پیدا — آگ کر سکتی ہے اندازِ گُلستاں پیدا! (اقبال)

[3]: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۴ اور ۷۵ تا ۷۷؛

[4]: Secrets of matter

Marfat.com

اَب جس نکتہ کو ہم نے عام طور پر ابھی تک کماحقہٗ سمجھا نہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ "خُدا کی معرفت" اور "ذرّات کی معرفت" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اِس وقت اِس حقیقت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہی ہمیں عام طور پر ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ اِسلام کی صحیح آئیڈیولوجی کیا ہے؟

اِس وقت صورت یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو "ذرّات کی معرفت" کی "دُھن" لگی ہوئی ہے۔ وہ کائنات کی "مادی تسخیر" کر رہے ہیں۔ اِسی لئے اگر ایک طرف بجلی ہماری نظروں کو چکا چوند کر رہی ہے۔ تو دوسری طرف چاند پر چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں۔ اور اِس صورتِ حال سے ہم نہ صرف مرعوب ہو چُکے ہیں۔ بلکہ اِس نے ہمیں بے دست و پا بھی کر رکھا ہے۔

اِس کے برعکس (جیسا کہ اِس کتاب کی فصل "دین کے لفظ کا صحیح مدّعا" میں واضح کیا جا چُکا ہے[1]) اِس دُنیا میں صحیح "دُھن" صرف "تلاشِ حق" کی ہے۔ جو "خُدا کی معرفت" پر منتج ہوتی ہے۔ اِسی "دُھن" کو قرآن نے "اِسلام" یا "دین الحق" کے نام سے پُکارا ہے۔

جب ایک اِنسان "تلاشِ حق" کی منزل کو طے کر کے یعنی اُس میں کامیاب ہو کر "خُدا کی معرفت" حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ پھر کائنات کو "رُوحانی" طور پر مسخر کرتا ہے۔ چُنانچہ ایسی ہستیاں پھر زمین پر بیٹھے بیٹھے چاند کو شق کر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسی صورت میں پھر چاند پر چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہی ایک نکتہ ہے۔ جس پر ہم نے اب تک کماحقہٗ غور کرنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

اِس کی وجہ وُہی ہے۔ جو اوپر واضح کی جا چُکی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم موجودہ سائنس کی ترقی سے اِتنا مرعوب ہو چُکے ہیں کہ ہمارے لئے اَب یہ باور کرنا ہی مُشکل ہو گیا ہے۔ کہ اِس دُنیا میں کائنات کی "رُوحانی تسخیر" بھی کوئی شے ہے۔ یا یہ مُمکنات میں سے ہے!

اگر ہم اِس بُنیادی نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو پھر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اِس وقت جو اصلی جنگ ہے۔ وہ "مُلک گیری" کی جنگ نہیں ہے۔ بلکہ وہ "مادیّت" اور "رُوحانیّت" کے درمیان جنگ ہے۔ گویا یہ آئیڈیولوجی کی جنگ ہے۔ اور یہ جنگ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی۔

"مادیّت" نے اِس وقت "رُوحانیّت" کو دو چیلنج دیئے ہیں:۔

ایک چیلنج تو کائنات کی "مادی تسخیر" کی صورت میں ہے۔ اِس قسم کی تسخیر سے چیلنج یہ دیا گیا ہے۔ کہ مذہب صدیوں تک اپنی ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اور اِس تمام مدّت میں اُس کے پرستار اپنے حُجروں میں بیٹھ کر اَللّٰہ ھُو، اَللّٰہ ھُو کرتے رہے۔ لیکن جہانتک ترقی کا تعلق ہے۔ وہ اِس تمام عرصہ میں مٹی کے چراغ اور بیل گاڑی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ چُنانچہ "مادیّت" نے "مذہب" کو "چراغ" کے مقابلہ میں "بجلی" اور "بیل گاڑی" کے مقابلہ میں "ہوائی جہاز" کا چیلنج دیا ہے! دراصل یہ صرف چیلنج ہی نہیں ہے۔ بلکہ چکمہ بھی ہے۔ یہ اِس لئے کہ اس کی تہ میں راز یہ ہے۔ کہ اِنسان

---

[1] دیکھیں صفحات ۲۵۷ تا ۲۶۰

"ذرات کی معرفت" میں ہی اس قدر مشغول اور مگن رہے - کہ وہ نہ صرف "خُدا کی معرفت" کو فراموش کر دے۔ بلکہ اِسے معرفت کی اُسے ضرورت ہی محسوس نہ ہو! اس وقت ہماری حالت بالکل یہی ہے ؛ اسی لئے ہمیں اس وقت یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ یہ چکمہ ہمیں کس نے دیا؟ کب دیا؟ اور کیوں دیا؟ ان تمام سوالوں کا جواب کتاب کے گذشتہ اوراق میں گذر چکا ہے[1] - یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے - کہ بجائے اس کے کہ ہم "مادیّت" اور "رُوحانیت" کے حقیقی فرق کو سمجھتے - ہم نے یہ رویّہ اپنانا شروع کر دیا - کہ موجودہ ایجادات کے اصلی بانی مبانی تو مسلمان ہی ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس سلسلہ میں جبّار (کیمسٹری)، رازی اور ابن سینا (طبّ و جراحی)، طبری (تاریخ) اور فارابی (جو پولیٹیکل سائنس کا مُوجد تھا) کے نام گنوانے شروع کر دیئے - بغیر اس بات کو سمجھے کہ گویہ سب حضرات مسلمان ہی تھے - لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی "خُدا رسیدہ" تھا؟ چونکہ اسلام میں سند صرف اُن ہستیوں کی ہی قابلِ قبول ہے۔ جو کَانْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ہوں۔ یعنی "خُدا کی معرفت" حاصل کر چکے ہوں - اس سے کم درجہ کے لوگ اسلام میں سند ہی نہیں ہو سکتے!

اب "مادیّت" کے دوسرے چیلنج کو لیں ؛ یہ ایک شدید خطرے سے بھرپور ہے - جو دوسری عالمی جنگ کے موقع پر ہیروشیما کی صورت میں رُونما ہو چکا ہے ؛

ان دونوں چیلنجوں کے مقابلہ کے لئے ہمیں "براہیمی ایمان" کی ضرورت ہے۔ لیکن اس وقت ہمارے پاس "بزرا ایمان" ہے - اور اس "ایمان" میں بھی بہت سا حصّہ "نام نہاد ایمان" کا ہے ؛ ظاہر ہے - کہ اس قسم کے "ایمان" سے ہم دُنیا سے اپنا لوہا نہیں منوا سکتے!

لہٰذا یہاں جس نکتہ کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے - وہ یہ ہے - کہ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ جب بھی شاندار فتوحات حاصل کی ہیں - تو وہ صرف "رُوحانیت" کے بل بُوتے پر ہی کی ہیں ؛ مثال کے طور پر اگر حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں بدر کے موقع پر فرشتوں سے مدد ملی - تو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ہم نے سطحِ آب کو پار کرنے کے لئے پُلوں کے تیار ہونے کا انتظار نہیں کیا - بلکہ سمندروں میں گھوڑے دوڑا دیئے ؛ اسی لئے اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" میں ایک مصرعہ ہے - ؎

بحرِ ظُلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے!

اسی طرح حضرت عمرؓ نے جب مسجدِ نبویؐ سے "یا ساریۃ الجبل" کی صدا لگائی تھی - تو کیا اُن کے پاس اُس وقت کوئی لاؤڈ سپیکر یا وائرلیس سیٹ[2] تھا؟

---

[1] : تفصیل کے لیے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۴ ؛

[2] : تفصیل کے لیے دیکھیں صفحہ ۱۰۷ ؛

Marfat.com

لہٰذا اِس وقت ضرورت اس اَمر کی ہے۔ کہ ہم اِس نکتہ کی باریکی کو سمجھیں۔ کہ مغربی دُنیا اگر اِس وقت "ذرّات کی معرفت" کی "دُھن" میں لگی ہوئی ہے۔ تو ہم سب قسم کے دُنیوی کام کرنے کے باوجود "خُدا کی معرفت" کی "دُھن" میں مشغول رہیں۔ اِس کا رَاز صرف ذکرِالٰہی اور سُنّت کی پیروی میں مضمر ہے ؛

لیکن اِس وقت چُونکہ ہمارا دونوں پر ہی عمل نہیں ہے۔ اور اُس کے نتیجہ کے طور پر ہمارے ایمان میں خامی ہے۔ لہٰذا ہم موجودہ حالات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھنے سے ہی قاصر رہے ہیں ؛

مثال کے طور پر حال ہی میں خیال یہ کیا جا رہا تھا۔ کہ "مشرقی پاکستان" کے اَلمیّہ کا حقیقی "توڑ" یا علاج یہ ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو تیار کر کے (یا اگر مُمکن ہو تو ابھی) دہلی پر ہلّا بول کر اُسے فتح کر لیں!

خیال کی اِس اُفتاد سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ ہم میں ابھی تک یہ شعُور ہی پیدا نہیں ہوا۔ جو ہم پر یہ واضح کرے کہ اِس وقت کی دُنیا میں ہم کِس مُشکل سے دوچار ہیں؟

جیسا کہ پہلے کہا جا چُکا ہے۔ اِس وقت مسئلہ "مُلک گیری" کا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں اُس خطرہ کا سامنا ہے۔ جو ہیروشیما میں ایک وقت رُونما ہو چکا ہے۔ اور جِس کی "دھمکی" ہمیں آج سے چند سال پہلے براہِ راست مِل چُکی ہے[1] ؛

عام سمجھ بُوجھ کے مُطابق ہمارے نزدیک ہیروشیما والے حادثہ کا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ اگر مغرب کے تمام مُمالک کے پاس مثال کے طور پر اِس وقت ایچ بموں[2] کی تعداد ایک ہزار ہے۔ تو ہمارے پاس اُن سے بہتر دو چار ہزار ایچ بم[3] ہوں ؛

لیکن اِس قسم کا موقّف دُنیا کی موجودہ آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہے!

ایک ہی بم سے بستیوں کی بستیوں کو ایک ہی لمحہ میں تہس نہس کر دینا شیطنت ہے۔ مَرْدانگی یا بہادری نہیں ہے! یہی تو دَراصل وہ "دجّال"[4] ہے۔ جِس کی بابت کہ احادیث میں ذکر آیا ہے۔ لیکن ہم نے متعلقہ احادیث کے اشاروں کو سمجھا نہیں!

---

[1]: کچھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ امریکہ نے پاکستان سے اِس بات کی اجازت چاہی۔ کہ وہ پشاور میں اپنے ہوائی جہازوں کا ایک "اڈّا" قائم کرے ؛ چُنانچہ جب یہ اجازت مِل گئی۔ تو امریکہ وہاں سے اپنے ہوائی جہاز اُڑا کر رُوس کے مُلک کی "ٹوہ" لیا کرتا تھا ؛ امریکہ کے ایک اِس قسم کے جہاز (U. 2.) کو رُوس نے مار گرایا۔ اور اُس کے pilot (ہوائی جہازران) کو گرفتار کر لیا ؛ تب رُوس نے پاکستان کو دھمکی دی۔ کہ اگر ہم نے امریکہ کے اِس "اڈّے" کو نہ اُٹھوایا۔ تو رُوس پشاور کے تمام علاقہ کو ایک بم گرا کر بالکل تہس نہس کر دے گا ؛ چنانچہ جب متعلقہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ تو پھر پاکستان نے امریکہ کے اِس "اڈّے" کو جاری رکھنے کی اجازت کو منسوخ کر دیا ؛ یہ اُسی دھمکی کی طرف اشارہ ہے!

[2] اور [3]: H. Bombs

[4]: تفصیل کے لیے دیکھیں صفحات ۱۳۳ تا ۱۳۴ ؛

Marfat.com

چُنانچہ ہم میں سے جو لوگ کائنات کی "مادی تسخیر" کے درپے ہیں۔ اُن کے خیال کی پستی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے۔ کہ اُن کی نظر بار بار یا "مُلک گیری" کی طرف اُٹھتی ہے۔ اور یا ایچ بم[1] اور مسائیلز[2] کو مہیا کرنے میں۔ اُن کو کوئی تیسرا راستہ سُوجھتا ہی نہیں۔

اَب داد دیجیے۔ اُن ہستیوں کے فکر کے اُفتاد کی، جو کائنات کی "مادی تسخیر" کے قائل ہی نہیں۔ اُن کو ہمیشہ صرف "خُدا کی معرفت" کی "دُھن" ہی رہی۔ یہ ہستیاں کون ہیں؟ صرف اَولیائے کرام، جن کو اقبال نے "طائرانِ حرم" کے نام سے بھی پُکارا ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف کائنات کی "مادی تسخیر" کی طرف کبھی رُخ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اُنہوں نے کربلا کے حادثہ کے بعد سے "مُلک گیری" کو بھی کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا! چُنانچہ اسی لئے اگر وہ "خلافتِ راشدہ" سے لے کر آج سے دو تین سُو سال قبل تک "رونقِ محفل" رہے بھی ہیں۔ تو صرف "غیر سرکاری" طور پر۔ "سرکاری" طور پر نہیں۔ اسی لئے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ اِس مُلک کے اَولیائے کرام میں سے کسی کا بھی مُغل سلطنت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اَولیائے کرام چونکہ "خلافتِ الٰہیہ" کے قائل ہیں۔ لہٰذا وہ موجودہ "مشین کے زمانہ" کے آغاز سے لے کر اس وقت تک "غیر سرکاری" طور پر بھی دُنیا میں "رونقِ محفل" نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ اس تمام عرصہ میں "رُوپوش" رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کو معلوم ہے۔ کہ قُدرت کے پروگرام کے مطابق دُنیا میں ایک خاص مُہلت تک کائنات کی "مادی تسخیر" کا چرچا ہونا ہے۔ اور اسی نے سب جگہ رواج پانا ہے۔ لہٰذا اس وقت وہ جان بُوجھ کر "رُوپوش" ہیں۔ تاکہ مغربی دُنیا جس کو اپنی روشن دماغی اور روشن خیالی کا زعم ہے۔ بغیر کسی رُکاوٹ کے پورے طور پر "طبع آزمائی" کرے!

اُن کے اِس رویّہ کی دُرستگی اس بات سے ثابت ہوتی ہے۔ کہ اگر مثال کے طور پر کوئی "عیسیٰ" لاہور کے میو ہسپتال کے دروازہ پر بیٹھا ہو۔ تو کیا کوئی مریض ہسپتال کے اندر جائے گا؟ لہٰذا "طائرانِ حرم" کا اس زمانہ میں "پسِ پردہ" ہونا صرف اس بنا پر ہے۔ کہ کائنات کی "مادی تسخیر" اپنے پورے جوبن پر آسکے۔ اور اُس کو کسی قسم کی رُکاوٹ نہ ہو!

چُنانچہ اس اثناء میں مغربی دُنیا نے جو مادی ترقی کی ہے۔ اُس کی ایک شکل تو یہ ہے۔ کہ اس وقت بجلی اور ہوائی جہاز کی فراوانی کے علاوہ چاند پر چھلانگیں لگائی جا رہی ہیں۔ اور دوسری طرف "مادیت" کے بل بوتے پر کمزور مُلکوں کو مسائیلز[3] کی دھمکی دی جا رہی ہے۔

اَب ہم میں سے جو لوگ "مادیت" کے گرویدہ ہیں۔ یا جن لوگوں میں اس وقت "نام نہاد ایمان" ہے۔ وہ ایک طرف تو خلائی جہازوں کی ایجاد سے اُنگشت بدنداں ہیں۔ اور دوسری طرف موجودہ بجلی سے اُن کی نظریں اتنی خیرہ

---

۱ : H. Bombs   ۲ اور ۳ : Missiles

Marfat.com

ہو چکی ہیں۔ کہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ موجودہ سائنس ہی دراصل اسلام کی رُوح ہے! چُنانچہ اسی لئے سرسید اور علامہ عنایت اللہ مشرقی جیسے سربرآوردہ لوگ ہمیشہ اسی قسم کا راگ ہی الاپتے رہے ہیں: چُنانچہ اسی لئے اِس قسم کے نظریئے والوں کا کہنا یہ ہے۔ کہ مُلّا نے اِسلام کو سمجھا ہی نہیں!

لیکن اِس کے برعکس جو "براہیمی ایمان" کے علمبردار ہیں۔ اُن کے نزدیک قرآن نے "بجلی" کے مقابلہ میں وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ[1] کے الفاظ استعمال کر کے "مادیّت" کا مُنہ توڑ دیا ہے! اِن قرآنی الفاظ کا صحیح مطلب یہ ہے۔ کہ جو متقی لوگ قرآن کی تعلیمات سے ہدایت پا کر "خُدا رسیدہ" ہو جاتے ہیں۔ تو ربُّ العزّت پھر ایسے عارفین کے لئے ایک ایسا نُور پیدا کر دیتے ہیں۔ جن کی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں:

اِس سلسلہ میں اُن دو صحابیوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ جو حضورؐ کی خدمت میں روز عصر کے وقت حاضر ہوتے تھے۔ اور عشاء کی نماز کے بعد گھر لوٹتے تھے: اُس وقت چُونکہ اندھیرا ہوتا تھا۔ لٰہذا اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شُعاعیں نکلتی تھیں! جن کی روشنی میں وہ اپنے اپنے گھر پہنچ جاتے تھے: (یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے۔ کہ راقم الحروف نے تو اِس واقع کو ایک وعظ میں اسی طرح سُنا ہے۔ لیکن بُخاری شریف میں ہے۔ کہ اِن صحابیوں کے عَصا سے شُعاعیں نکلتی تھیں): بہرحال اِن دونوں روایتوں میں کوئی خاص نمایاں فرق نہیں ہے: اِس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جن لوگوں کے پاؤں کے انگوٹھوں سے یا جن کے عَصا سے شُعاعیں نکل سکتی ہُوں۔ اُن کی نظر بھلا موجودہ بجلی کی چمک سے کس طرح خیرہ ہو سکتی ہے؟

اَب آپ اِس بات پر غور کریں۔ کہ "رُوحانیّت" کے پاس ہوائی جہازوں کے مقابلہ میں کیا ہے؟ "براہیمی ایمان" کے علمبرداروں کے نزدیک ہوائی جہازوں کے مقابلہ میں حضرت سُلیمانؑ کے لئے ہَوا کا مسخر ہونا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے!

اَب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ موجُودہ "مشین کے زمانہ" کے بعد وہ "رُوحانی زمانہ" کب آئے گا۔ جس میں کائنات کی "رُوحانی تسخیر" عملی طور پر ظہُور میں آئے گی؟ کتاب کے گزشتہ اوراق میں اسی ایک بات کا تفصیل سے جواب دیا جا چکا ہے[2]۔ یہاں اِتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ "رُوحانی زمانہ" کی آمد پر (اور اُس کی آمد کے آثار نہایت سُرعت سے اَب ظہُور پذیر ہو رہے ہیں) جب بھی "ذرّات کی معرفت" کے ماہرین نے ہیروشیما والے واقعہ کو ایک دفعہ پھر دُہرایا۔ تو "خُدا کی معرفت" والے اِن ایٹمی بموں[3] کو زمین پر گرنے ہی نہیں دیں گے۔ بلکہ وہ بم

---

[1]: سورۃ ۶ اَلاَنعام آیت ۱۲۲:

[2]: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۵۸ تا ۶۰:

[3]: Atom bombs

اُنہی کے مُلک پر گردش کرتے رہیں گے! اُس وقت پھر اُن سے دریافت کیا جائے گا۔ کہ وہ اب خُود اس بات کا فیصلہ کریں۔ کہ وہ بم اُن کے اپنے مُلک کے کس حصّہ پر گریں؟ یہ اس لئے ہوگا۔ کہ دُنیا تصویر کے دوسرے رُخ کا بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلے۔ اور اس طرح وہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے کرشموں سے بھی رُوشناس ہوسکے!

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر "مذہب" میں کائنات کی "رُوحانی تسخیر" بھی شامل ہے۔ تو گذشتہ چودہ صدیوں میں اُس کو باقاعدہ عمل میں کیوں نہیں لایا گیا؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اتنا اور اشارہ کافی ہے۔ کہ "مادیت" ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی نت نئی روِش اختیار کرتی رہی ہے۔ لیکن اُس کا سر اُس وقت ہی کُچلا جاتا ہے۔ جب وہ روِش یا ترقی اپنے زُعم میں معراج پر پہنچ چکی ہوتی ہے!

اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کا ظہور اُس وقت ہُوا۔ جب نمرُود اپنی خُدائی کا دعویٰ کرچکا تھا: اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی میدان میں اُس وقت اُترے۔ جب فرعون کی فرعونیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی: یہ دُنیا چُونکہ ایک ڈرامہ[1] ہے۔ لہٰذا اس کا ہر پلاٹ[2] اپنے اپنے وقت کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یونہی اندھا دُھند نہیں ہوتا:

یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے۔ کہ دُنیا میں آئندہ "انقلاب" اس لئے بھی لازمی ہے۔ کہ جس طرح پہلی قوموں نے بحرِ قُلزم کے پھٹنے یا بلقیس کے تخت کو آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچنے والے حادثات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ اُسی طرح موجُودہ دُنیا جس کو اپنی روشن دماغی اور روشن خیالی پر بےحد ناز ہے۔ وہ بھی قُدرت کی نیرنگیوں سے دوچار ہو۔ تاکہ اُس کے سب مُغالطے بھی پورے طور پر رفع ہوجائیں!

اب جبکہ دُنیا میں "رُوحانی انقلاب" کی ضرورت واضح ہوچکی ہے۔ ہمیں اس "انقلاب" کے حقیقی پس منظر کو بھی ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہیئے: حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضُور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ تک جتنے بھی مُعجزات رُونما ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے ہی کارنامے ہیں۔ بلکہ وہ "اشارے" ہیں۔ اس حقیقت کی طرف کہ کل کو یہی معجزات ("رُوحانی زمانہ" کی آمد پر) روزمرّہ کی زندگی میں "کرامات" کے رُوپ میں رُونما ہوں گے: یہی سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کی صحیح تفسیر ہے!

البتہ اس سلسلہ میں سُنّت اللہ یہ ہے۔ کہ کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کے حصول کے لئے ہی نوعِ انسان

---

[1] Drama [2] Plot

کو جو "قیمت" ادا کرنی ہوگی۔ وہ "نقدی" کی صورت میں نہیں ہوگی۔ بلکہ اُس کے لئے "پختگیٔ ایمان" کی پیشکش کرنی ہوگی!

مثال کے طور پر آئندہ "رُوحانی زمانہ" میں جن لوگوں کے ایمان کی سطح اوسط درجہ پر ہوگی۔ وہ تو بجلی کی غیر موجودگی میں مٹّی کا چراغ جلانے پر ہی مجبور ہوں گے۔ لیکن جن کے ایمان کی سطح اوسط درجہ سے اُوپر ہوگی۔ اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں پھُوٹیں گی! لہٰذا وہ بجلی کی غیر موجُودگی کا احساس تک نہیں کریں گے ؛

یہاں ایک اور نکتہ پر روشنی ڈالنے کی بھی ضرورت ہے ؛ ہم گزشتہ اوراق میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا ارشاد پڑھ آئے ہیں۔ کہ اِس دُنیا میں خُدا رسیدہ بزرگ ہمیشہ رہے ہیں۔ اِس وقت بھی ہیں۔ اور قیامت تک موجُود رہیں گے۔ یہاں تک کہ آپ نے "خلافتِ الٰہیّہ" کی تشکیل کی تفصیل تک کو بھی واضح فرما دیا ہے۔ کہ اُن کے اراکین کی کُل تعداد تین سو پچپن ۳۵۵ ہے[1]۔ اور اُن میں سے جو سب سے کم درجہ کے ہیں۔ وہ تعداد میں تین سو ہیں۔ اور وہ "اخیار" کہلاتے ہیں ؛

گویا دُنیا کی آبادی کو اگر اِس وقت تین سو کروڑ تصور کر لیا جائے۔ تو اِس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اِن تین سو اخیار میں سے ہر فرد کے حصّہ میں ایک کروڑ دُنیا کے باشندے آتے ہیں ؛ یعنی اگر مغربی پاکستان کی آبادی اِس وقت ۶ چھ کروڑ ہے۔ تو یہاں چھ اخیار موجُود ہیں ؛ اور رُوس کی آبادی اگر بیس ۲۰ کروڑ ہے۔ تو وہاں بیس ۲۰ اخیار اِس وقت ڈیوٹی پر ہیں ؛ یہ اخیار ایک مُلک سے دوسرے مُلک میں بادلوں کی طرح جاتے ہیں۔ گویا نہ تو اِنہیں کسی سے پاسپورٹ[2] لینے کی ضرورت ہے۔ اور نہ اِنہیں کسی مُلک سے کسی قسم کی اجازت لینی پڑتی ہے۔ اور یہی تفسیر ہے فارسی کے اِس مقُولے کی "ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خُدائے ماست"! چُنانچہ حضرتِ اقبالؒ نے اِسی خیال کو اپنے ایک مصرعہ میں یُوں واضح فرمایا ہے ؎

مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

لہٰذا ہمیں اپنے آپ کو نہ تو کسی مُلک کے حدُود اربعہ میں محدُود کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ مقیّد سمجھنے کی! اندریں حالات ہمیں نہ تو "مُلک گیری" کو اپنا "مقصدِ حیات" سمجھنا چاہیئے۔ اور نہ ہمیں پاکستان کے کسی حصّہ کے کٹ جانے سے پریشان و ہراساں ہونا چاہیئے ؛ ہمیں تو ضرورت صرف "براہیمی ایمان" کی ہے۔ اور اُس کو حاصل

---

[1] : اِس کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحہ ۷۵ ؛

[2] : Passport

کرنے کا طریقہ صرف "محمدؐ سے وفا" ہے[1]!

اَب ایک لمحہ کے لئے دہلی پر ہلّا بولنے والے نظریے کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیں ؛ اِس وقت صُورت یہ ہے۔ کہ اگر بھارت کی آبادی چالیس[۴۰] کروڑ ہے۔ تو ہم وہاں پہنچیں یا نہ پہنچیں۔ "خلافتِ الٰہیّہ" کے چالیس اُخیاؔ وہاں بھی اِس وقت پہلے سے ہی موجود ہیں ؛ لہٰذا ہم اِس وقت دہلی پر ہلّا بول کر "مُلک گیری" تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اِسلام کا جو حقیقی مقصد ہے۔ وہ پُورا نہیں کر سکتے ؛ یہ مقصد ظاہر ہے، کہ صرف وہ ہستیاں ہی پُورا کر سکتی ہیں۔ جو "براہیمی ایمان" کی حامل ہیں۔ اور ہم ابھی صرف "نام نہاد ایمان" کی سیڑھی پر ہیں۔ لہٰذا ؎

او کہ خُود گُم اَست کرا رہبری کُند

اِن وجُوہ کی بناء پر ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ ہم سب :۔

(۱) اِنفرادی طور پر حق و انصاف کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ اور

(۲) اجتماعی طور پر دُنیا کی کسی قوم کا مذاق نہ اُڑائیں !

موجُودہ اَلمیّہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہم نے اپنے مخالف مُلکوں (خاص کر بھارت) کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اِس قدر مذاق اُڑایا۔ کہ قُدرت اِس بات کے لئے مجبُور ہو گئی۔ کہ وہ اپنے اَٹل قانون "مَنْ ضَحِكَ ضُحِكَ" (یعنی جو ہنسا وہ ہنسا گیا) کی تفسیر کو عملی جامہ پہنا دے !

گویا ہم نے اپنے رویّہ سے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کی کُھلے بندوں خلاف ورزی کی۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

"اے ایمان والو ! کوئی قوم کسی دوسری قوم کی ہنسی نہ اُڑائے۔ مُمکن ہے۔ کہ وُہ اُس سے بہتر ہو ؛ نہ عورتیں دوسری عورتوں کی ہنسی اُڑائیں۔ مُمکن ہے۔ وُہ اُن سے بہتر ہوں ؛ اور تم آپس میں طعنہ زنی نہ کرو۔ اور نہ ایک دوسرے کا بُرا نام رکھو ؛ ایمان لانے کے بعد (دوسروں کو) بُرے نام سے یاد کرنا بہت بُرا ہے۔ اور جو کوئی توبہ نہ کرے۔ تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوتے ہیں" ؛

(سورۃ ۴۹۔ الحجرات۔ آیت ۱۱)

---

[1] : کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں !

یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے۔ کہ اِس وقت جو "بنگلہ دیش" بنا ہے۔ وُہ "وطن دوستی" کا ہی ثمرہ ہے۔ لیکن اِس نظریئے کے بارہ میں ہمارا اپنا ہی فتویٰ یہ ہے۔ کہ ؎

اِن تازہ خُداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!
جو پیرہن اِس کا ہے وُہ مذہب کا کفن ہے!

(اقبال)

یہاں تک لکھا جا چکا تھا۔ تو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء کا پرچہ ملا۔ جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا جو بیان شائع ہُوا ہے۔ اُس سے "مشرقی پاکستان" والا المیّہ اور بھی بھیانک صُورت اختیار کر لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ آج سے ایک دو سال قبل مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے یہ شکایت کی۔ کہ گزشتہ چوبیس[۲۴] سال میں اُن کو جو دولت کا حصّہ ملا ہے۔ وہ اُن کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ لٰہذا اُنہوں نے اپنے چھ[۶] نکات میں یہ واضح کر دیا۔ کہ وہ کیا کیا کچھ چاہتے ہیں؟ یہ تمام مسئلہ محض معاشی تھا۔ اور اس کے تحت صرف "قوم پرستی" کا جذبہ کار فرما تھا۔ اَب بجائے اِس کے کہ ہم اِس کا کوئی معاشی اور نفسیاتی حل سوچتے۔ معاملہ نے اِتنا طُول کھینچا۔ کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے بہاریوں اور پنجابیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جنرل یحییٰ خان کے قرطاسِ ابیض (White Paper) سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بنگالیوں نے (ایک اندازہ کے مُطابق) تقریباً تیس ہزار بہاریوں، پنجابیوں، اور اپنے بنگالیوں کو بھی (جو اُن کے ساتھ متفق نہیں تھے) موت کے گھاٹ اُتار دیا!

قرآن کریم میں آتا ہے۔ کہ اگر مُسلمانوں کے دو[۲] گروہوں میں کوئی جھگڑا ہو جائے۔ تو دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اُن میں صُلح کروا دیں[۱]۔ اِس خاص قضیہ کے موقع پر نہ تو "اِسلامی جماعت" نے صُلح کروانے کی کوشش کی۔ اور نہ "تبلیغی جماعت" نے اِس مُعاملہ کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ اور نہ کسی دوسری سیاسی پارٹی نے کوئی قابلِ فخر کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ حکومت نے بھی اِس سلسلہ میں کوئی صحیح قدم نہیں اُٹھایا۔ بلکہ جنرل یحییٰ خان نے جب یہ دیکھا۔ کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ تو اُنہوں نے شیخ مُجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا۔ اور مشرقی پاکستان میں جو مارشل لاء جاری کیا گیا تھا۔ اُس کے دَوران، حالات نے ایسی ناگفتہ بہ صُورت اختیار کی۔ کہ شیخ مُجیب الرحمٰن کے بیان کے مطابق تیس[۳۰] لاکھ بنگالیوں کا صفایا کر دیا گیا۔

---

[۱]: دیکھیں قرآن سورۃ ۴۹ الحجرات۔ آیت ۹

Marfat.com

الجیریا نے جب فرانس سے آزادی حاصل کی ہے۔ تو اخباروں میں آیا تھا۔ کہ دس سال کے عرصہ میں دس لاکھ الجیریا کے باشندے کام آئے ۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے۔ کہ صرف دس ماہ کے اندر اندر ایک ہی مُلک کے مسلمانوں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر تیس[30]، سوا تیس[30] لاکھ مسلمانوں کا صفایا کر دیا !

اور اس تمام مرحلے میں نہ صرف مشرقی پاکستان ہاتھ سے گیا۔ بلکہ اُس صُوبے میں پاکستان کی بہادر اور جری فوج کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور مزید برآں مغربی پاکستان میں بھی چند دن کی ادھوری لڑائی کے بعد جنگ بندی کروا دی گئی !

ہمارا دعوئے یہ تھا۔ کہ ہم دُنیا میں اسلام کی سب سے بڑی حکومت ہیں۔ لیکن جس کارکردگی کا ہم نے ۱۹۷۱ء میں مظاہرہ کیا ہے۔ کیا دُنیا ہمارے حق میں کسی قسم کی خوش فہمی کا گُمان بھی کر سکتی ہے؟ اگر ہم نے اس وقت بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا۔ اور خُدا کے آگے نہایت عاجزی سے نہ جُھکے۔ تو حالات بد سے بدتر ہونے کا اندیشہ ہے !

اب ہم ایک طرف اپنی ناگفتہ بہ حالت پر غور کریں۔ اور دوسری طرف "خلافتِ الٰہیہ" کے تین سو پچپن[355] اراکین کے دَم خَم کو دیکھیں۔ جنہوں نے نہ صرف مسلمانوں ملکوں کے باشندوں کو ہی ہدایت دینی ہے۔ بلکہ تمام دُنیا کے لوگوں کو راہِ راست پر لانا ہے۔ اور صرف راہِ راست پر ہی نہیں لانا۔ بلکہ اُن کی اُتنی اور اس قدر تربیت کرنی ہے۔ کہ اُن میں سے اکثر و بیشتر گُناہ کے قریب بھی نہ جائیں۔ تاکہ جب سُورج مغرب سے طلوع ہو۔ اور توبہ کا دروازہ بنی نوع انسان کے لئے بند ہو جائے۔ تو اُن کو گناہوں کے معاف کروانے کی نوبت ہی نہ آئے !

اِس دَم خَم والی ہستیوں کے سامنے ہم بھلا مُنہ دکھانے کے قابل بھی ہیں ؟

"پاکستان ٹائمز" مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء میں مسٹر بھٹو کا ایک بیان شائع ہُوا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم نے ۱۹۷۱ء میں دُنیا کے عوام کے دلوں پر جو نقش چھوڑا ہے۔ وہ ظُلم، خونریزی، ڈکٹیٹرشپ[1]۔ اور Political stupidity (سیاسی حماقت) کے سوا اور کچھ نہیں !

لیکن اس کے برعکس "براہیمی ایمان" والوں کی حالت دیکھئے ! اُن کا (ہمیشہ سے) "نظریہ" بھی سائنٹیفک[2] ہے۔ "رویّہ" بھی سائنٹیفک ہے۔ اور "منزل" بھی سائنٹیفک ہے !

اُن کا "نظریہ" یہ ہے۔ کہ انسان کا مقصدِ حیات صرف "تلاشِ حق" اور "خُدا کی معرفت" ہے۔ اور

---

[1]: Dictatorship

[2]: Scientific

Marfat.com

روز و شب کی دُنیا میں چاند پر چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہیں!

اُن کا "رویہ" یہ ہے۔ کہ "مشین کے زمانہ" کی مُہلت تک جان بُوجھ کر "رُوپوش" رہو۔ "پس پردہ" رہو! تاکہ قیل وقال والی دُنیا کے سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ جائیں!

اور اُن کی "منزل" یہ ہے۔ کہ جب دُنیا کے سب لوگ اپنی اپنی "طبع آزمائی" کر چکیں۔ تو پھر اُلفت سے، محبت سے، پیار سے اُن کی ایسی تربیت کی جائے۔ کہ فرشتے بھی گواہی دیں۔ کہ مٹی اور طین کی مخلوق نے آگ اور آتش کی مخلوق پر شاندار فتح حاصل کر لی ہے۔ اور اُس سے بازی جیت لی ہے!

غرض اِس وقت ہمارے سامنے ایک ہی راستہ کُھلا ہے۔ کہ ہم ربُّ العزّت کے دربار میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ گڑگڑا کر اپنی ہدایت کے لئے دُعائیں مانگیں۔ اور اِس ہدایت کے لئے پہلا اور آخری قدم ذکرِ الٰہی اور سُنّت کی پیروی ہے ؛ یہی وقت کی پُکار ہے۔ اور یہی صراطِ مُستقیم!

آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ ہم اپنی روزمرّہ کی دُعاؤں میں اِس دُعا کو کبھی فراموش نہ کریں:-

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ
حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(یعنی اے ہمارے رب! ہمیں اِس دُنیوی زندگی میں بھی خیر و خُوبی عطا فرما۔ اور آخرت میں بھی اِسی سے نواز اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ!)

(سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۲۰۱)

مِلّتِ عشق از ہمہ دیں ہا جُدا ست
عاشقاں را مذہب و مِلّت خُدا ست

Marfat.com

کس زبانِ مرا نمی فہمد، بعزیزاں چہ التماس کنم؟

"افکار و حوادث"

(۱)

"عشق" کے لفظ میں، حرف "ع" کا جو ٹکڑا استعمال ہوا ہے۔ اُس کی شکل ہُو بہُو چاند ("ے") سے ملتی جُلتی ہے!
اُس کے بعد اس لفظ کا جو حصّہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ "شق" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس شخص میں حقیقی معنوں میں
"عشق" موجود ہوتا ہے۔ وہ "ے" (چاند) کو شق کر سکتا ہے!

(۲)

اگر "پاکستان" نے، آئندہ چند سال میں، اپنے آپکو موجودہ "آلائشوں" سے "پاک" کر لیا۔ پھر تو "خلافتِ الٰہیہ"[1] کے ظہور پر تمام دُنیا کے ممالک "پاکستان" بن سکتے ہیں! لیکن اگر ہم نے صرف "وطن دوستی" کے جذبہ کو ہی نبایا۔ اور اسلام کی صحیح ریسرچ[2] نہ کی۔ تو پھر تمام دُنیا "پاکستان" تو نہیں بن سکے گی۔ البتہ اُس میں (بالآخر) "اسلامستان" ضرور قائم ہو کر رہیگا!

(۳)

جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے۔ تو صرف ایک مُستند ڈاکٹر کو ہی یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اُس کا علاج کرے۔
اسی طرح اگر کوئی کالج کا لڑکا کسی سے انگریزی پڑھنا چاہتا ہے تو یہ لازمی ہے کہ پڑھانے والا بی۔ اے یا ایم۔ اے ضرور ہو۔
بالکل اُسی طرح حقیقی معنوں میں "تبلیغ" کے اہل بھی صرف "خدا رسیدہ" ہستیاں ہی ہیں۔ ان سے کم درجہ کے لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں!

یہی وجہ ہے۔ کہ گزشتہ زمانوں میں ملکوں کے مُلک اور قوموں کی قومیں اسلام لائیں۔ لیکن آجکل صورت یہ ہے۔ کہ اگر ہمیں کسی شخص کے اسلام لانے کی خبر پہنچتی بھی ہے۔ تو وہ صرف اِکّے دُکّے انسان کی ہی ہوتی ہے!

(۴)

قرآن جب "ھُدًی لِّلنَّاس" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو اُس کا منشا یہ ہے۔ کہ جن لوگوں میں محض "نام نہاد ایمان" ہے۔ اُن میں اُس کی تعلیم سے "صحیح ایمان" پیدا ہو جائے۔
اور جب قرآن "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو پھر اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ جن لوگوں میں "صحیح ایمان" موجود ہے۔ اس کی تعلیم سے اُن میں "براہیمی ایمان" پیدا ہو جائے!
جن لوگوں میں "براہیمی ایمان" پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ پھر صرف "عُلماء" ہی نہیں رہتے۔ بلکہ "کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْل" ہو جاتے ہیں!
اِنہی وجوہ کی بناء پر اسلام میں محض "عُلماء" ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ "کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْل" ہونا ایک لازمی شرط ہے۔

---

[1]: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۴ اور ۷۵ تا ۷۷۔ [2]: Research

Marfat.com

و

(۵)

جو ہستیاں "براہیمی ایمان" کی حامل ہیں۔ وُہی یہ فتویٰ دینے کی اہل ہیں۔ کہ :۔

مومن کون ہے؟ اور کافر کون؟
یا
جہاد کب جائز ہے؟ اور کب نہیں؟

مثال کے طور پر اسلام جب "جہاد" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ تو اُس سے مُراد صرف "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ ورنہ جہاں تک صرف لڑائی کا تعلق ہے۔ "خُدا کے منکرین" بھی آجکل اپنے اپنے وطن کی خاطر جانیں قربان کر رہے ہیں ؛ چُنانچہ اس وقت مُسلمانوں کے جو ملک سیکولر (یعنی صرف دُنیاوی قسم کی) حکومتوں کے گرویدہ ہیں، وہاں "جہاد فی سبیل اللہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا لہٰذا مُسلمانوں کی کونسی لڑائی "جہاد" ہے؟ اور کونسے مُسلمان واقعی "شہید" ہوئے ہیں؟ اس کا صحیح فیصلہ بھی صرف وہی عُلما کر سکتے ہیں۔ جو "کانبیاء بنی اسرائیل" ہوں!

(۶)

"شرح"	"مُشکل الفاظ"
تُمہیں نے درد دیا ہے، تُمہیں دوا دینا!	اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ
گہ بلُطفم می نوازد، گہ بنازم می کُشد! زندہ می سازد مرا آں شوخ، بازم می کُشد!	قبض و بسط
نظر در دیدہ ہا ناقص فتادہ ورگرنہ یارِ من از کس نہاں نیست	"حُسن" کے مُنکرین! (Atheists)
کوئی بتائے کہ اُس ناخُدا کو کیا کہیئے؟ سفینہ جس نے بھنور میں پھنسا کے چھوڑ دیا	جنرل یحییٰ خان (کمیشن کے فیصلے سے پہلے پہلے) "حُسن نسوانی"!
خالِ تو دانہ دانہ، وزُلفِ تو دام دام مُرغے کہ دانا چید، گرفتارِ دام شُد	
غضب کیا اپنے "ارماں" پہ اعتماد کیا تمام عُمر قیامت کا انتظار کیا!	"دیدہ دیدار طلب"!
"چھُپنے والے سامنے آ!"	"کُنْزاً مَخْفِیاً" [۱]

(۷)

جواب	سوال
نہیں! اِس لئے کہ "محبت کی دُنیا" میں ازل الآباد سے لیکر آج تک ہمیشہ جو "ضدیت" چلی آرہی ہے، وہ ہے : ہیچ عاشق سخنِ تلخ بمعشوق نہ گُفت!	کیا نوشتۂ تقدیر پر احتجاج کیا جاسکتا ہے؟ کیوں؟

[۱] : تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۱۸ تا ۱۹ ؛

Marfat.com